علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا کتابی سلسلہ

شعورِ ادراک

کتاب: 6 اپریل تا جون 2021ء

خاص شمارہ

حفیظ شاہد نمبر

مدیر
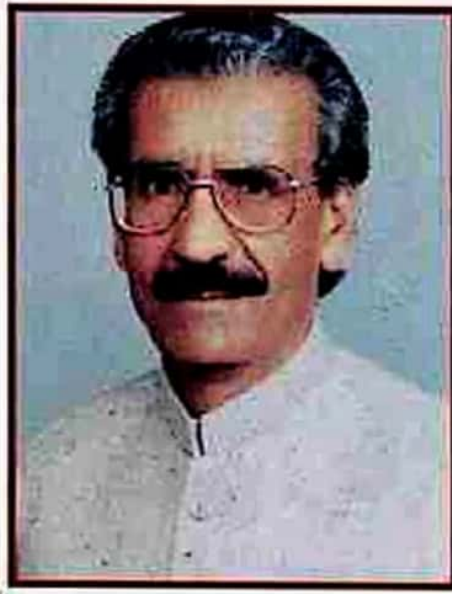
محمد یوسف وحید

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس طرف اندھیرا ہے، اُس طرف اُجالا ہے
یہ مرا حوالہ ہے، وہ ترا حوالہ ہے
کیا ڈرے گا دل شاہد وقت کے مصائب سے
گردشوں کا خوگر ہے، سختیوں کا پالا ہے
(حفیظ شاہد)

شعورِ ادراک

خان پور

کتابی سلسلہ (6)

اپریل تا جون 2021ء

مدیر: محمد یوسف وحید

حفیظ شاہد نمبر

مطبوعات
الوحید اَدبی اکیڈمی خان پور
قائم شدہ۔2004ء

نام کتاب	:	شعور و ادراک
مدیر	:	محمد یوسف وحید
سلسلہ کتاب	:	کتاب نمبر 6
اشاعت	:	اپریل تا جون 2021ء
کمپوزنگ	:	الوحید گرافکس، خان پور
سرورق	:	سعدیہ وحید
اشاعت	:	

قیمت: 500 روپے

ناشر

الوحید اَدبی اکیڈمی

سیٹلائٹ ٹاؤن، خان پور

رابطہ 0316-6622630

ٹیلی فون 068-5574901

اپنی تخلیقات (ان پیج فائل میں) ای میل کریں

idraakmagkpr@gmail.com

0306-5210901 (واٹس ایپ)

حُسنِ ترتیب

حفیظ شاہدؔ

حمدِ باری تعالیٰ

تیری تعریف ہو نہیں سکتی
ہم سے توصیف ہو نہیں سکتی

اِس کتابِ حیات سے بڑھ کر
کوئی تصنیف ہو نہیں سکتی

تیری آیات میں قیامت تک
کوئی تحریف ہو نہیں سکتی

خوبصورت ، صحیفۂ گُل سے
اور تالیف ہو نہیں سکتی

تُو نے جاری کیے ہیں جو احکام
اُن میں تخفیف ہو نہیں سکتی

تُو نہ چاہے تو غم کے ماروں کی
دُور تکلیف ہو نہیں سکتی

تیرے اَوصاف لِکھ نہیں سکتے
تیری توصیف ہو نہیں سکتی

(سفرِ روشنی کا)

حفیظ شاہدؔ

نعتِ رسولِ مقبولؐ

حدِّ ادراک سے وہ باہر ہے
بند قطرے میں اِک سمندر ہے

اُس کی نسبت سے مُعتبر ہوں مَیں
وہ مری زندگی کا محور ہے

وہ مری کائنات کا سُورج
چشمۂ نُورِ ماہ و اختر ہے

وہ کڑے وقت کی مسافت میں
میرا ہادی ہے ، میرا رہبر ہے

اُس کی سیرت کے غنچہ و گُل سے
عالَمِ آب و گِل مُعطّر ہے

عکس اُس کا ہے کب مُقدّر میں
آئینہ ہی مرا مکدّر ہے

اُس کے دیدار کے لیے شاہدؔ
آنکھ پُرنم ہے ، قلب مُضطر ہے

(سفرِ روشنی کا)

حفیظ شاہد

حمدِ باری تعالیٰ

صبح تیری ہے، رات ہے تیری
یہ حسیں کائنات ہے تیری

ماہ و خورشید و آسماں تیرے
محفلِ شش جہات ہے تیری

بزمِ عالم میں جاری و ساری
ایک موجِ صفات ہے تیری

میری آنکھوں میں نُور ہے تیرا
دل میں رُوحِ حیات ہے تیری

پھول شاخوں کو تُو نے بخشے ہیں
تازگی ، پات پات ہے تیری

شاخ دَر شاخ ترا چرچا
ہر لبِ گُل پہ بات ہے تیری

مادرِ مہرباں سے بھی بڑھ کر
مہرباں مجھ پہ ذات ہے تیری

(چراغِ حرف)

☆

حفیظ شاہد

نعتِ رسولِ مقبولؐ

سَر زمینِ حرم، روشنی روشنی
تیرا نقشِ قدم، روشنی روشنی
حاصلِ صبحِ ایماں تری ذات ہے
محترم محترم، روشنی روشنی
تیرے دَر سے جہاں کو اُجالے ملے
تیرا بابِ کرم، روشنی روشنی
تیرے اَنوار ہیں انجمن ، انجمن
موجزن یَم بہ یَم، روشنی روشنی
نُورِ اسمِ محمدؐ کا اعجاز ہے
بزمِ لوح و قلم، روشنی روشنی
جلوۂ آفتابِ رسالت سے ہے
از عرب تا عجم، روشنی روشنی
رہرو راہِ طیبہ مبارک تجھے
ہر قدم ہر قدم، روشنی روشنی
مَیں ہُوں شاہد ترا، ظلمتوں میں گھرا
میرے آقا کرم، روشنی روشنی

(چراغِ حرف)

☆

حفیظ شاہد

مناجات

غمِ حیات ہو یا ساعتِ خوشی لِکھ دے
تُو چاہتا ہے جو میرے لئے وُہی لِکھ دے

مری زمیں پہ اندھیرے اُتارنے والے
مری زمیں کے مقدر میں روشنی لِکھ دے

کتابِ رزق میں میرا بھی نام آجائے
جو لکھ سکے نہ کشائش تو پھر کمی لِکھ دے

تُو لکھنا چاہے تو پھر کون روک سکتا ہے
بنامِ مُردہ ضمیراں بھی زندگی لِکھ دے

کتابِ وقت میں جس کو رقم کیا جائے
اک ایسا حرف مرے نام تُو کبھی لِکھ دے

جو دشتِ ہجر میں مُرجھا گیا ہے اُس کے لئے
تُو اپنے موسمِ قُربت کی تازگی لِکھ دے

مقدمہ مرا شاہدؔ ہے جس عدالت میں
خدا کرے مجھے الزام سے بَری لِکھ دے

(مہتابِ غزل)

حفیظ شاہد

مناجات

زمیں پر ایک جنت مانگتی ہیں
نئی نسلیں محبت مانگتی ہیں

یہ بنجر اور اُجڑی سی زمینیں
ابھی کچھ اور محنت مانگتی ہیں

نگاہیں پھر وہی شاداب چہرہ
سرِ شہرِ رفاقت مانگتی ہیں

مری آنکھیں مرے سوزِ دروں سے
کوئی اشکِ ندامت مانگتی ہیں

مرے احساس کی سرسبز بیلیں
نمو کی اور قوت مانگتی ہیں

مری خاموشیاں شہرِ ستم میں
کوئی حرفِ صداقت مانگتی ہیں

عجب موسم ہے یہ شاہدؔ کہ جس سے
بہاریں بھی لطافت مانگتی ہیں

(مہتابِ غزل)

حفیظ شاہد

حمدِ باری تعالیٰ

دلوں کو زندگی بخشی ، نظر کو روشنی بخشی
یہ تیری ذات ہے جس نے بشر کو روشنی بخشی

ترے حسنِ نظامت کو سمجھ سکتا نہیں کوئی
سحر ، شب کو عنایت کی سحر کو روشنی بخشی

سجانے کے لیے یہ آسماں کی محفلیں، تُو نے
ستاروں کو چمک، شمس و قمر کو روشنی بخشی

ترے لطف و کرم سے کون ہے محروم دُنیا میں
شجر کو تازگی بخشی، شرر کو روشنی بخشی

جلا کر مشعلِ اِدراک تُو نے اپنی رحمت سے
ہمارے شہرِ دل کے بام و در کو روشنی بخشی

بھٹکتے پھر رہے تھے ہم اندھیروں میں، مگر تُو نے
ہمارے واسطے خیر البشرؐ کو روشنی بخشی

کروں کیسے ادا میں شکر تیری اس عنایت کا
کہ تُو نے میری سوچوں کے نگر کو روشنی بخشی

(فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی)

☆

حفیظ شاہد

نعتِ رسولِ مقبولؐ

سب سے اعلیٰ ہیں کائنات میں آپؐ
رہنما ہیں رہِ حیات میں آپؐ

ہیں جو انساں کی زینتِ کردار
سب سے بڑھ کر ہیں ان صفات میں آپؐ

ہیں دوامی بہار ایماں کی
موسموں کے تغیرات میں آپؐ

بے سہاروں کا اِک سہارا ہیں
اس زمانے کے حادثات میں آپؐ

مظہرِ شانِ آدمیت ہیں
زندگی کی تجلیات میں آپؐ

جس پہ انسانیت بھی نازاں ہو
ایسے انساں ہیں اپنی ذات میں آپؐ

جگمگاتے ہیں چاند کی صورت
میرے روشن تخیلات میں آپؐ

(فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی)

☆

حفیظ شاہدؔ

حمدِ باری تعالیٰ

اُس نے ہم پر سراسر کرم کر دیا
ہر جہاں میں ہمیں محترم کر دیا

یوں وہ انصاف سے کام لیتا رہا
اِک خلش بخش دی اِک کرم کر دیا

لکھ دیا اُس نے اک اور ہی فیصلہ
میرا ہر فیصلہ کالعدم کر دیا

اُس نے اذنِ سفر مجھ کر دے کر یہاں
حادثوں کو مرا ہمقدم کر دیا

آدمی کو شعور و نظر بخش کر
اُس نے پابندِ دیر و حرم کر دیا

شب کی ظلمت میں تاروں کو دے کر ضیا
نور و ظلمت کو اُس نے بہم کر دیا

اُس نے شاہدؔ عطا کر کے اِک روشنی
دُور، دل سے غمِ بیش و کم کر دیا

(سورج بدل رہا ہے)

☆

حفیظ شاہدؔ

دُعا

ہر اک رفعت زمانے کی تری رفعت میں شامل ہے
ہوئی تخلیق جو خوبی تری سیرت میں شامل ہے
مجھے پھر کیوں نہ آئے پیار اپنی بے نوائی پر
محبت بے نواؤں سے تری عادت میں شامل ہے
تری نسبت سے میں بھی معتبر ہوں اس زمانے میں
حوالہ جو بھی ہے میرا تری نسبت میں شامل ہے
یہ تیری ذاتِ اقدس ہے جو میری رہنما بن کر
مرے کردارِ انسانی کی ہر صورت میں شامل ہے
میرے افکار کے پھولوں کو رکھتی ہے تر و تازہ
تری رحمت مرے احساس کی جنت میں شامل ہے
مری دولت کا تخمینہ زمانہ کیا لگائے گا
خزینہ تیری یادوں کا مری دولت میں شامل ہے
سرِ شاخِ تکلم مسکراتے ہیں نئے غنچے!
ادا تیرے تبسم کی مری مدحت میں شامل ہے
یقیناً ہوگا بہرہ یاب وہ تیری شفاعت سے
اُسے کیا فکرِ عقبیٰ جو تری ملت میں شامل ہے
اسے بھی اک نگاہِ لطف کی خیرات مل جائے
تیرا عاجز یہاں شاہدؔ تری اُمت میں شامل ہے

(سورج بدل رہا ہے)

☆

اپنی بات

مدیر کے قلم سے...

اُردو غزل کا توانا شاعر... حفیظ شاہد

ہر رنگِ خوب وزشت ہے میری نگاہ میں
انسان کی سرِشت ہے میری نگاہ میں

(حفیظ شاہد)

حفیظ شاہد صاحب سے ابتدائی ملاقات و تعارف جنوری ۲۰۰۴ء میں جناح ٹاؤن میں واقع اُن کے دولت خانے پر ہوئی تھی۔ ادبی دنیا میں داخل ہوئے تو کچھ عرصہ ہو چکا تھا۔ ۲۰۰۴ء میں خان پور کے معروف تعلیمی ادارے ''بزرا پبلک ہائی سکول'' میں بطور لائبریرین کام کرتا رہا ہوں۔ اسی ذمہ داری کے تحت عموماً میرا کتابوں سے واسطہ رہتا۔ اسی دوران ہی مجھے خاص طور پر حفیظ شاہد اور رفیق راشد کے ابتدائی شعری مجموعے بالترتیب (۱) ''سفر روشنی کا'' اور چراغِ آگہی'' پڑھنے کا موقع ملا۔

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ حفیظ شاہد اور رفیق راشد کا تعلق بھی خان پور سے ہے اور اتفاق سے دونوں احباب قریب قریب یعنی حفیظ شاہد جناح ٹاؤن اور رفیق راشد ماڈل ٹاؤن میں ہی رہائش پذیر ہیں۔ اوّلین فرصت میں یکے بعد دیگرے دونوں ادبی شخصیات سے ملاقات ہوئی۔

میرے ادبی ذوق وشوق کے ابتدائی دور سے ایک بات مجھے ہمیشہ متحرک اور فعال رکھتی ہے کہ نئے نئے ادبی دوستوں سے ملاقات اور ادبی محفلوں میں شرکت کی جائے۔

ادبی دنیا کے اوائل دور میں سینکڑوں اشعار مجھے یاد ہوا کرتے تھے۔ اسی شوق کے تحت ۲۰۰۴۔۲۰۰۳ء میں ۲۰۰۰ منتخب اُردو اشعار پر مشتمل بیت بازی بھی مرتب کی۔ اچھے شعروں کے انتخاب اور مطالعے نے میرے اندر بھی شعر کہنے کی ہمت پیدا کی۔ ابتدائی طور پر کچھ وقت تک بندی کرتا رہا۔ حفیظ شاہد سے ابتدائی ملاقاتوں میں بیت بازی کا مسوّدہ پیش کیا۔ میرے ادبی ذوق کو دیکھتے ہوئے حفیظ شاہد صاحب نے مُسرّت کا اظہار کیا۔ مسوّدے میں کچھ اشعار کی اِصلاح بھی کی۔ بیت بازی کا وہ مسوّدہ آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ البتہ بعد میں دوبارہ نئے رجسٹر پر بھی اسے نہایت خوش خط لکھا گیا۔

حفیظ شاہد صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ وقتاً فوقتاً چلتا رہا۔ اسی دوران ادبی ذوق کی تسکین بھی مختلف اخبارات و رسائل میں مضامین اور کہانیوں کی صورت ہوتی رہی۔ مختلف ادبی، سماجی اور ثقافتی فورمز میں بھی شرکت ہوتی رہی اور ساتھ ساتھ غمِ روزگار بھی چلتا رہا۔ ۲۰۰۶ء کے آواخر میں بچوں کے لیے ایک مجلّہ شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ مشاورت پر حفیظ شاہد صاحب نے نہایت خوشی کا اظہار کیا۔

سات شعری مجموعوں کے خالق، اُردو غزل کا توانا حوالہ حفیظ شاہد جسے گزشتہ ۷۰ سالوں میں اقلیمِ سخن کے نامور

اور قدآور اُدباء و شعراء نے اپنے اپنے انداز اور الفاظ میں خوب صورت خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

حفیظ شاہد کی ساری شاعری جدید انقلابی، سماجی اور معاشرتی روّیوں کے تجزیوں سے بھرپور ہونے کے ساتھ ساتھ مکمل کلاسیکی ہیئت میں غزل کے مزاج سے سراپا ہم آہنگ ہے۔ حفیظ شاہد کی غزل میں وہی تغزل اور رنگ و مٹھاس ہے جس سے اُردو اور فارسی کی غزلیہ شاعری متصف ہے۔ اُردو غزل گوئی میں اُن کا نام کوئی نیا نہیں ہے۔ حفیظ شاہد کو غزل گوئی کا بڑا سلیقہ ہے۔ غزل کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

یہ اعجازِ محبت ہے، محبت بے اثر کب ہے
تمہیں اپنی خبر کب ہے، ہمیں اپنی خبر کب ہے

رموزِ زندگی کی جو حقیقت تک پہنچ جائے
میسر اہلِ دُنیا کو ابھی ایسی نظر کب ہے

ابھی دیوارِ قصرِ شامِ غم کے پار کیا دیکھیں
ہمیں حاصل چراغِ وسعتِ فکر و نظر کب ہے

ابھی اس شہر میں اپنی پذیرائی نہیں ممکن
ابھی اس شہر میں دستورِ توقیرِ ہنر کب ہے

ہمیں جانا ہے شاہدؔ منزلِ شہرِ تمنا تک
مگر آسان یہ شہرِ تمنا کا سفر کب ہے

اس غزل کے اور شعر بھی قابلِ توجہ ہیں۔ اس کا مطلع خاص طور پر لائقِ تحسین ہے۔ اس مطلع میں کوئی بڑا فلسفہ نہیں ہے بلکہ نہایت سادا الفاظ میں بات صرف یہ کہی گئی ہے کہ ہر آدمی اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں محبت کی بے کراں تاثیر کو محسوس کر سکتا ہے۔

حفیظ شاہد کی ایک اور غزل کے چار شعر ملاحظہ فرمائیں:

یہ پیکرِ جمال تو عتاب کے لئے نہیں
مرے خدا یہ آدمی عذاب کے لئے نہیں

یہ مجھ سے احتراز کیوں، یہ مجھ سے اجتناب کیوں
سوال تجھ سے ہے مگر جواب کے لئے نہیں

جو غم اُٹھا چکا ہے تو انہیں نہ اب شمار کر
یہ مختصر سی زندگی حساب کے لئے نہیں

زمیں پہ شاہدِؔ حزیں حقیقتیں تلاش کر
یہ دشتِ زندگی کسی سراب کے لئے نہیں

اِن اشعار میں غزل کا وہ حسن بھی ہے جو حسرتؔ، جگرؔ اور فانی بدایونی کے یہاں ملتا ہے اور وہ لب ولہجہ بھی حفیظ شاہدؔ کی شاعری کے لیے مختص ہے۔ غزل کا یہ آب و رنگ نرم و عمومی حفیظ شاہد کی غزلوں میں اُن کے عہد کی

مروجہ غزل گوئی کے زیرِ اثر آیا ہے۔ "یہ دریا پار کرنا ہے" سے ایک غزل کے مزید چند شعر دیکھیے:

کٹھن حالات میں اپنے ارادوں کو جواں رکھنا
ہمیں آتا ہے دل میں شعلۂ غم کو نہاں رکھنا
اکیلے گھر میں کیسے وقت کاٹو گے تنِ تنہا
کوئی تصویر لٹکا کر سرِ دیوارِ جاں رکھنا
اجل اور زندگی کی دوستی اک حرفِ باطل ہے
بہت دشوار ہے پانی پہ بنیادِ مکاں رکھنا
نہ جانے اِس میں پوشیدہ ہیں اُس کی حکمتیں کیا کیا
ہمیشہ گردشوں میں یہ زمین و آسماں رکھنا
کہاں آسان ہے اہلِ سخن کی بھیڑ میں شاہد
جُدا اُوروں سے اپنا طرزِ گفتار و بیاں رکھنا

یہ اشعار اسی اندازِ غزل گوئی کی عمدہ عکاسی ہیں جن کا سکہ امیر مینائی اور داغ کی جمائی ہوئی محفل میں چل رہا تھا۔ حفیظ کا اُسلوبِ خاص ہی یہی ہے کہ غزل کو نہایت عمدگی، شائستگی اور پاکیزگی سے پیش کرتا ہے۔ حفیظ کی غزل میں بھرپور زندگی جینے کے لیے' اُمید اور روشنی' عمدہ دلیل ہے۔ روشنی ان کا پسندیدہ استعارہ ہے۔ بقول حفیظ الرحمٰن اُحسن:

"حفیظ شاہد کی غزل" زندگی آمیز بھی ہے اور زندگی آموز بھی۔" انہوں نے زندگی کو اس کی تلخیوں اور رعنائیوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ رجائیت حفیظ شاہد کی غزلوں میں روح کی طرح سرایت کیے ہوئے ہے اور یہی رجائیت روشنی کی علامت بن کر زندگی کی تلخیوں اور تاریکیوں کو کم کر رہی ہے۔

حفیظ شاہد کی شاعری "زندگی آمیز بھی ہے اور زندگی آموز بھی" کی عمدہ مثال اس غزل میں ملاحظہ فرمائیں:

پریشانی میں بھی زندہ دلی سے کام لیتا ہوں
بنامِ زندگی میں زندگی سے کام لیتا ہوں
اندھیروں میں جہاں مِلتا نہیں ہے راستہ کوئی
وہاں میں اپنے دل کی روشنی سے کام لیتا ہوں
ہمیشہ آدمی سے رابطہ رکھا ہے یوں میں نے
کسی کے کام آتا ہوں، کسی سے کام لیتا ہوں
کسی دل کا اندھیرا دُور کرنا ہو اگر مجھ کو
محبت کی مقدّس چاندنی سے کام لیتا ہوں
سلیقہ زندگی کا زندگی سے میں نے سیکھا ہے
کوئی مشکل بھی ہو خندہ لبی سے کام لیتا ہوں

پہنچنے کی کسی منزل پہ میں جلدی نہیں کرتا
سفر کوئی ہو آہستہ روی سے کام لیتا ہوں
مرے مسلک میں دھوکہ دوستوں سے کفر ہے شاہد
شکایت بھی اگر ہو دوستی سے کام لیتا ہوں

غزل کے یہ اشعار مروجہ روش سے جدا، خاص حفیظ کے لہجے اور اُسلوب میں ہیں۔ ایسا منفرد آہنگ جسے بعد میں ان کے شاگرد یاور عظیم، اظہر عروج اور دیگر نے اپنایا اور اپنی شعری ریاضت و مشقت سے بامِ عروج کی طرف محوِ سفر ہیں۔

حفیظ شاہد کا شمار اُردو غزل کے توانا لب و لہجے کے شعراء میں ہوتا ہے۔ حفیظ شاہد کی غزل گوئی پر چند مثالوں کے ساتھ اظہارِ خیال کا مقصد صرف یہ ہے کہ حفیظ شاہد نے اُردو غزل کو توانائی بخشنے کے لیے ۵۰ سالوں میں چھ شعری مجموعوں میں شامل ۱۰۰ غزلوں کے ذریعے کٹھن سفر طے کیا ہے۔ حفیظ شاہد نے چند نظمیں بھی کہیں۔ چند ایک شائع بھی ہوئیں لیکن حفیظ شاہد نے مجموعی طور پر اپنے کسی مجموعے میں اور بالعموم تعارف میں نظم کی طرف کوئی خاص میلان نہیں رکھا۔

حفیظ شاہد کو اعلیٰ فطری اوصاف کے ناطے جھوٹ، نفرت، بغض اور منافقت سے سخت نفرت تھی۔ لیکن منفعت اور پراگندگی و فطرتی میلان سے انسان کہاں باز آتا ہے۔ حفیظ شاہد نے اپنے ماحول میں ایسے دوستوں کو دیکھا ہے جو تیسرے درجے کے مفادات کی خاطر مکروہ منافقت پر اتر آتے ہیں اور پھر منافقت سے کھلی دشمنی کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ ایسے گندے معاشرے میں پراگندہ ذہنیت کے حامل لوگ جا بجا ملتے ہیں۔ حفیظ شاہد نے ایسے منافق دوستوں کو اپنی شاعری میں آئینہ دکھایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

زباں پہ اُس کی رہا دوستی کا دعویٰ بھی
سلوک اس کا مرے ساتھ ناروا بھی رہا

....

دشمنوں سے منہ چھپاتے پھر رہے ہیں ہم حفیظ
بھول کر ہم آ گئے تھے دوستوں کے شہر میں

....

نہ جانے دوست مرے، کیوں ہوئے مرے دشمن
امیر ہوں نہ کوئی تخت و تاج رکھتا ہوں
بے مرحلہ در مرحلہ روداد مسافت
انجام سفر اصل میں آغازِ سفر ہے

حفیظ شاہد اُردو غزل کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔ اُردو غزل کے سفر میں حفیظ شاہد کا حوالہ بطور اُردو غزل کا معتبر اور مضبوط شاعر کے طور پر اُردو ادب کی تاریخ میں شمار ہوگا۔ بلاشبہ حفیظ شاہد جدید اُسلوبِ غزل کے نمائندہ

اور منفرد لہجے کے شاعر ہیں۔ جن کو فکر و فن، خیال و ہنر اور جذبہ و پیرائیہ اظہار کی رعنائیاں ودیعت ہوئی ہیں۔ جن کی غزلیات کے سات مجموعے منصۂ شہود پر آ کر اہلِ فکر و بصیرت و صاحبانِ علم و حکمت اور نقادانِ شعر و سخن سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ حفیظ شاہد کی غزل میں صداقت کے پھول مہکتے اور انسانی زندگی کے احساسات چمکتے ہیں۔ حفیظ کی غزل میں مٹھاس ہے اور تغزل کی نکہت ہے۔ منتخب اشعار سے لطف اُٹھاتے ہیں:

کچھ نئے منظروں میں ڈھلتی ہے
زندگی رنگ جب بدلتی ہے
نرم و نازک سی اک کلی دیکھو!
کیسے کانٹوں کے ساتھ پلتی ہے

(سفر روشنی کا)

پریشانی میں بھی زندہ دلی سے کام لیتا ہوں
بنامِ زندگی میں زندگی سے کام لیتا ہوں
ہمیشہ آدمی سے رابطہ رکھا ہے یوں میں نے
کسی کے کام آتا ہوں کسی سے کام لیتا ہوں

(چراغِ حرف)

ہم اُن سے وفاؤں کا ثمر مانگ رہے ہیں
ناداں ہیں کہ پانی سے شرر مانگ رہے ہیں
اک اشک بھی آنکھوں کے سمندر میں نہیں ہے
ہم خشک سمندر سے گہر مانگ رہے ہیں

(مہتابِ غزل)

جانے کیا بات ہے کہ میں تنہا
محفلِ دوستاں میں رہتا ہوں
کیا دریچوں کو بند کرنا ہے
آندھیوں نے تو اب گزرنا ہے

(یہ دریا پار کرنا ہے)

اب مرے سامنے رہگزر اور ہے
اک سفر کٹ گیا، اک سفر اور ہے
تیرے چہرے پہ تحریر ہے اور کچھ
تیرے لب پر کہانی مگر اور ہے

(فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی)

یہ زندگی ہے ایک حسین خواب کی طرح
یہ زندگی ہے ایک کڑا امتحان بھی
شاہد مجھے یقین ہے فصلِ بہار میں
بھر جائے گا گلوں سے مرا گلستان بھی

(سورج بدل رہا ہے)

الغرض حفیظ شاہد اُردو غزل کے روشن ماضی، حال اور مستقبل کا نمایاں حوالہ ہیں۔ حالیہ شمارہ میں ''خصوصی گوشہ حفیظ شاہد'' شائع کیا جانے تھا، لیکن تحریروں اور مواد کی فراوانی کے ساتھ ساتھ وقت کے تقاضے کو نبھاتے ہوئے نثری تحریروں کے ساتھ حفیظ شاہد کا غیر مطبوعہ کلام بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

خصوصی شمارہ ''حفیظ شاہد نمبر'' کے حصہ نظم اور نثر میں شامل تحریریں نہایت جاں فشانی اور خلوص و محبت کے ساتھ ترتیب دی گئی ہیں۔ اُمید ہے کہ قارئین کو ہماری یہ کاوش پسند آئے گی۔

حفیظ شاہد کا غیر مطبوعہ کلام بھی پہلی مرتبہ ''حاصلِ غزل'' کے عنوان سے خاص طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔ اُمید ہے حفیظ شاہد کے اس کلام کو بھی بے پذیرائی نصیب ہوگی۔

ہم معزز قلم کاروں، ادباء و شعرا کے بے حد ممنون و مشکور ہیں کہ جنھوں نے ہمیں خاص نمبر کے لیے تحریریں عنایت فرمائیں۔ ''حفیظ شاہد نمبر'' کی جملہ مشاورت اور معاونت پر میں خاص طور پر سلمان شاہد، یاور عظیم، اختر رسول چودھری صاحب کا ممنون ہوں۔ صحت و سلامتی کی دُعاؤں کے ساتھ

اللہ تعالیٰ کا بے حد احسان و کرم کہ سہ ماہی 'شعور و اِدراک' کا شمارہ نمبر 6 (اپریل تا جون 2021ء) نئی آب و تاب کے ساتھ آپ تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ تازہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ انسانی بساط و کوشش کے تحت نمایاں اور عمدہ موضوعات پر مشتمل تحریریں حصہ نثر و نظم میں شامل ہیں۔

'شعور و اِدراک' کے صفحات اُردو، پنجابی اور سرائیکی زبان و اَدب سے منسلک قلم کاروں، فن کاروں اور دانش وروں کے لیے حاضر ہیں۔ قلم اُٹھائیے اور اپنے علاقے، ادب اور زبان و بیان پر کچھ لکھئے۔

'شعور و اِدراک' کے آئندہ شمارے کے لیے اپنی تحریریں 'نظم و نثر' میں ای میل یا واٹس اپ کریں۔

آپ کی قیمتی آرا و تجاویز کا منتظر رہوں گا۔ والسلام!

۱۵۔ مئی ۲۰۲۱ء

محمد یوسف وحید

*سلمان حفیظ (خان پور)

اظہارِ تشکر

حفیظ شاہد... بہترین انسان اور عمدہ شاعر

حفیظ شاہد صاحب جہاں نہایت عمدہ شاعر تھے اُس سے کہیں بڑھ کر بہترین انسان تھے۔ والدِ محترم کی سب سے بڑی خوبی انسان دوستی تھی۔ میں نے ہمیشہ اُنہیں دوسرے لوگوں کی خوشیاں اور دُکھ درد بانٹتے دیکھا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اُن کی شخصیت کا مثبت پہلو کہ وہ کبھی کسی کے ساتھ نیکی کر کے اُسے جتلاتے یا اُس کی تشہیر نہیں کرتے تھے۔ میرے نزدیک کسی بھی انسان کی عظمت اور نیک ہونے کا یہ بین ثبوت ہے۔

والد صاحب گھر میں ہمیشہ دھیمے مزاج والے مہربان اور شفیق انسان تھے۔ چھوٹوں، بڑوں سب سے شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اُن کے کلام میں سب سے طاقت ور عنصر ''اُمید'' تھا۔ اُن کے کلام میں کہیں بھی آپ کو مایوسی اور نا اُمیدی کی بات نظر نہیں آئے گی۔ اُن کی آنکھوں میں ہمیشہ روشن صبح کے خواب نظر آتے تھے۔

والد صاحب علالت کے دنوں میں بھی ہمیں اُمیدیں اور حوصلے دیتے تھے۔ اور اگر میں بلا مبالغہ کہوں تو حقیقت یہ ہے کہ اُنہوں نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہمت اور حوصلے کے ساتھ مردانہ وار بیماری کا سامنا کیا۔ یقیناً عزم و ہمت کا سفر اُن کے کردار اور بلند حوصلے کی ترجمانی کرتا ہے۔

آخری دنوں میں کہی گئی ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

اے میری زندگی، خدا حافظ | پھر ملیں گے کبھی، خدا حافظ

آ گئی تیرے سامنے شاہدؔ | پھر سفر کی گھڑی، خدا حافظ

والد صاحب کے جملہ اوصاف میں سے ایک وصف یہ بھی تھا کہ چاہے کتنے بھی بیمار ہوں اپنے دوستوں اور شاگردوں کو کبھی ملاقات سے انکار نہیں کرتے تھے۔ رات گئے اُن کی میزبانی کرتے۔

دُعا ہے کہ اللہ کریم اُن کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

محترم محمد یوسف وحید کا حفیظ شاہد صاحب کے ساتھ بہت دیرینہ اور گہرا تعلق رہا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یوسف وحید صاحب نے مجلّہ ''شعور و ادراک'' کی حالیہ اشاعتِ خاص کے ذریعے والد صاحب سے تعلق اور محبت کا حق ادا کر دیا ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ کریم محمد یوسف وحید کو مزید کامیابیاں اور کامرانیاں نصیب فرمائے اور اُن کا ادب سے تعلق تادیر قائم و دائم رکھے۔ مجلّہ ''شعور و ادراک'' کا حالیہ شمارہ ''حفیظ شاہد نمبر'' کے لئے انہوں نے پوری جان فشانی اور جملہ وسائل کے ساتھ دن رات ایک کر کے نہایت محنت اور خلوص و محبت سے ترتیب دیا ہے۔ تازہ شمارہ میں حفیظ شاہد صاحب کا غیر مطبوعہ (اُردو اور پنجابی) کلام بھی خاص طور پر شامل ہے جو کہ خوش آئند عمل ہے۔

میں اُن کی جملہ خدمات پر اُنہیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں اور اُن کے روشن مستقبل کے لیے دُعا گو ہوں۔ ☆

*(سلمان حفیظ، حفیظ شاہد کے چھوٹے بیٹے ہیں)

تحقیق و ترتیب: سعدیہ وحید

سوانحی خاکہ

حفیظ شاہد... شخص و عکس

نام	:	عبدالحفیظ شاہد
قلمی نام	:	حفیظ شاہد
مذہب	:	اسلام
تاریخ پیدائش	:	۲۶/ جون ۱۹۴۲ء
مقام پیدائش	:	نبی پورہ الراعیاں، لاہور
والد کا نام	:	میاں خیر الدین
والدہ کا نام	:	رشیدہ بی بی
دادا کا نام	:	میاں فتح الدین
تعلیم	:	گریجوایٹ
زبانیں	:	پنجابی / اُردو
آبائی تعلق	:	گڑھا و ہنداں، ضلع جالندھر، مشرقی پنجاب، انڈیا
شادی	:	۱۰ اکتوبر، ۱۹۶۵ء میں خالہ کی بیٹی ثریا یانو سے ہوئی
اولاد	:	دو بیٹے اور چار بیٹیاں بالترتیب: نجم حفیظ، سلمان حفیظ شبانہ حفیظ، فرزانہ حفیظ، ثوبیہ حفیظ اور طیبہ حفیظ
ابتدائی ملازمت	:	۱۹۶۳ء۔ حبیب بینک لمیٹڈ، داتا دربار برانچ لاہور
ابتدائی تعیناتی	:	شاہ محمد غوث برانچ لاہور، بطور اسسٹنٹ کیشیئر / کلرک
ملازمت کا اختتام	:	دو سال بعد ۱۹۶۵ء میں صحت کی خرابی اور کاروبار کی وجہ سے
ہجرت	:	۱۹۷۶ء میں مستقل طور پر لاہور سے خان پور آ گئے
مصروفیات	:	۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۶ء دس سال تک کوکا کولا فیکٹری رحیم یار خان، ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۸ء تک اسلم کاٹن فیکٹری اور ۱۹۹۸ء سے ۲۰۱۲ء تک بطور منیجر عائشہ کاٹن فیکٹری میں کام کیا۔
سکونت	:	گلی نمبر ۵، جناح ٹاؤن، خان پور
شعری سفر	:	۱۔ سفر روشنی کا ۱۹۸۳ء ۲۔ چراغ حرف ۱۹۸۹ء ۳۔ مہتاب غزل ۱۹۹۴ء ۴۔ یہ دریا پار کرنا ہے ۱۹۹۹ء

سفر روشنی کا (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) ۱۹۹۹ء
۵۔فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی ۲۰۰۴ء
۶۔سورج بدل رہا ہے ۲۰۰۸ء
۷۔ختمِ سفر سے پہلے (کلیات) ۲۰۱۰ء

کلام اشاعت : ہفت روزہ ''قندیل'' لاہور، ماہنامہ ''رومان'' لاہور، ''شمع'' لاہور، ''نیاز مانہ'' لاہور، ''شمع'' نئی دہلی، ''بیسویں صدی'' نئی دہلی

تحقیقی مقالہ جات : ''حفیظ شاہد... فن و شخصیت''۔مقالہ ایم فل اُردو،
سال ۲۰۰۵ء۔اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور
مقالہ نگار: مظہر عباس۔لیکچرر گورنمنٹ ڈگری کالج
خیر پور ٹامے والی ضلع بہاول پور
نگران مقالہ: ڈاکٹر شفیق احمد

جزوی تذکرہ : (۱)۔''خان پور کی شعری روایت''۔مقالہ ایم فل اُردو،
سال ۲۰۱۷ء۔اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور
مقالہ نگار: صفدر عباس ملک، اسسٹنٹ پروفیسر اُردو
گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، خان پور
(۲)۔''خان پور میں اُردو غزل کی روایت کا تحقیقی مطالعہ''
سال ۲۰۱۶۔۲۰۱۴ء۔مقالہ ایم فل اُردو۔نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس بہاول پور کیمپس
مقالہ نگار: نذیر احمد بزمی، ماہر مضمون اُردو
گورنمنٹ بوائز ہائیر سیکنڈری سکول کوٹ سمابہ رحیم یار خان
نگران مقالہ: ڈاکٹر نواز کاوش
(۳)۔''خان پور میں اُردو نعت کا سفر''۔مقالہ ایم فل اُردو
سال ۲۰۱۶۔۲۰۱۴ء۔نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس بہاول پور کیمپس
مقالہ نگار: رانا نصر اللہ ناصر، پرائمری سکول ٹیچر
نگران مقالہ: ڈاکٹر نواز کاوش
(۴)۔''بہاول پور کا اُدب''۔مقالہ پی ایچ ڈی اُردو۔
سال ۱۹۹۶ء۔اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور
مقالہ نگار: ڈاکٹر نواز کاوش، نگران مقالہ: ڈاکٹر سلیم ملک

چیئرمین شعبہ اُردو، نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن
اینڈ اکنامکس بہاول پور کیمپس

(۵)۔ گلدستۂ ادب (بہاولپور کا نثری و شعری ادب)
تحقیق و تدوین: محمد یوسف وحید
اشاعت: ۲۰۱۵ء۔ ناشر: الوحید ادبی اکیڈمی خان پور

(۶)۔ شفق رنگ۔ مرتب: حیدر قریشی، ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز خان پور۔ ۱۹۷۹ء۔

(۷)۔ سات ادیب، گوشہ حفیظ شاہد مدیر: حیدر قریشی، فرحت نواز
مرتب: سعید شباب،، جدید ادب پبلی کیشنز خان پور۔ ۱۹۸۶ء

(۸)۔ کاروانِ خیال' گوہر ملسیانی 'عکسِ صادق' صادق آباد، ۲۰۰۱ء

سرپرستی : بانی: ادبی تنظیم "معارف"۔ خان پور
علمی، ادبی اور ثقافتی تنظیم: الوحید ادبی اکیڈمی خان پور

ادارت : سہ ماہی "بچے من کے سچے" خان پور میں بطور چیف ایڈیٹر
۲۰۰۷ء تا ۲۰۱۴ء (عرصہ ۷ سال)

خصوصی گوشہ : سہ ماہی "بچے من کے سچے" خان پور کے خاص شمارہ
اپریل تا جون ۲۰۱۷ء میں حفیظ شاہد کی علمی و ادبی خدمات
کے اعتراف میں خصوصی گوشہ شائع ہو چکا ہے۔
جس میں مقامی اُدباء و شعراء کی مخصوص تحریریں شامل تھیں۔

ایوارڈز : حفیظ شاہد کو "بہترین شاعر ایوارڈ" چولستان ویلفیئر کونسل
2000ء میں دے چکی ہے۔ جوہر ہومیو کالج خان پور کی
طرف سے 2001ء میں حفیظ کو "ادبی خدمات ایوارڈ" ملا۔

وفات : ۲۲۔ نومبر ۲۰۱۴ء بروز ہفتہ بوقت ۱۱ بجے شب
(شیخ زید ہسپتال رحیم یار خان)
انا للہ وانا الیہ راجعون

تدفین : ۲۳ نومبر کو جامعہ مخزن العلوم خان پور میں ۲ بجے نماز جنازہ
اور ۳ بجے جامعہ سے متصل قبرستان میں تدفین کر دی گئی۔

عرصۂ حیات : ۷۲ سال، ۴ ماہ، ۲۶ دن

☆☆☆

محمد یوسف وحید (مدیر)

خلوص و محبت کا پیکر... حفیظ شاہدؔ

"سفرِ روشنی کا" سے اپنے ادبی و تخلیقی سفر کا آغاز کرنے والے اور "ختمِ سفر سے پہلے" کے خالق نہایت عمدہ شاعر اور خوب صورت انسان اور ادب نواز شخصیت عبدالحفیظ شاہد قلمی نام حفیظ شاہدؔ ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ایک معتبر اور پُر تاثیر آواز، اُردو غزل کی دنیا میں ایک تابندہ ستارہ۔ چھ گہر ہائے تابدار سے گلشنِ سخن کو حسن و جمال عطا کرنے والے حفیظ شاہدؔ اپنے دور کے کہنہ مشق اور اُستاد شعراء میں شمار ہونے والے حفیظ شاہد مرحوم کو کن کن القابات سے یاد کروں۔ ایک مدت سے بحرِ سخن میں غوطہ زن ہو کر زندگی کے حسین موتی چن چن کر ادب کے سمندر میں اپنا حصہ ملاتے رہے۔ نہ کبھی منجدھار کی پروا کی نہ ساحلِ مراد سے دور ہونے کا شکوہ۔ وسیع مطالعہ رکھنے والے ہمہ جہت شخصیت کے مالک حفیظ شاہد کمال درجے کے شاعر اور اُس سے کہیں اچھے انسان تھے۔ سراپا خلوص و محبت اور شرافت کا پیکر۔ حفیظ جالندھری اور احسان دانش کی محافل میں اپنے نغمات پیش کرنے والے دادِ سخن پانے والے حفیظ شاہدؔ خان پور کی مردم خیز دھرتی کے عظیم شاعر تھے۔ ندرتِ خیال اور بلند تخیل کی کلاسیکی روایات کا امین۔ غزل کا معتبر حوالہ بلاشبہ حفیظ شاہد ہی کو کہا جاسکتا ہے۔

حفیظ شاہدؔ غزل کی روایت کے ساتھ ساتھ جدیدیت کا حسن بھی لیے ہوئے ہیں ہماری تہذیب و روایت کو زندہ کرنے میں اُن کی غزلیات اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔ ایسا رچاؤ، چاشنی اور تغزل کی کشش موجود ہے کہ ہم اپنے حقیقی ماحول اور صداقت سے لبریز تصورات میں کھو جاتے ہیں۔ صرف کربِ ذات تک محدود نہیں ہیں بلکہ تضاداتِ زمانہ اور حقائقِ روزگار سے بھی غزل کا خمیر اُٹھاتے ہیں۔ نقوشِ پارینہ کی باز آفرینی اُن کی غزل کا درخشاں پہلو ہے۔ کہیں کہیں فکر کے ایسے غنچے چٹکتے ہیں کہ ان کی خوشبو چار سو ماحول کو معطر کرتی چلی جاتی ہے۔ الفاظ و تراکیب کا انتخاب، مصرعوں کی بُنت اور اشعار میں شعری تلازمات کا استعمال حفیظ شاہد کے کلام کے محاسن ہیں۔ اُن کے ہاں تشبیہات و استعارات کا نادر انتخاب متوازن اور مناسب اُسلوب اِس سلیقے سے ملتا ہے کہ غزل کی کائنات پُرکشش اور دیدہ زیب بن جاتی ہے۔ حُسنِ بیان میں انفرادیت اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔ ایک ایسا آہنگ ان کے ردیف و قافیہ میں جھنکار پیدا کرتا ہے کہ ہر شعر ترنم سے لبریز دکھائی دیتا ہے۔ غزل کی دنیا میں یہ ایک منفرد اعزاز جو اہلِ ذوق اور سخنورانِ غزل سے داد حاصل کر رہی ہے۔

حفیظ شاہدؔ "بچے من کے سچے" کے 2007ء میں آغاز سے 2014ء تک بطور چیف ایڈیٹر ذمہ داریاں بہ احسن و خوبی ادا کرتے رہے۔ "بچے من کے سچے" کے پلیٹ فارم سے ترویج و ادب کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لاتے رہے۔ شعر و ادب سے والہانہ محبت کرنے والے مخلص تھے۔ ترویجِ ادب کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ حفیظ شاہد با اخلاق اور سراپا خلوص انسان تھے۔ جب بھی میں اُن سے ملنے کے لیے گیا، جس قدر تھکاوٹ

اور مصروفیت ہوتی، کبھی محسوس نہیں ہونے دیتے تھے۔ بچوں سے خاص محبت کرتے تھے۔

تقسیم ہند سے قبل حفیظ شاہد کے والدین جالندھر سے ترک سکونت کر کے لاہور آگئے، پاکستان بننے سے چار سال قبل آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد بینک میں ملازمت کر لی۔ شعر و ادب کا شوق بچپن ہی سے تھا جب بھی فرصت ملتی، فن شاعری سیکھنے اور اپنے ذوق کی تسکین میں صرف کرتے۔ لاہور میں اُس دور کے نامور شعراء کی صحبت میسر رہی۔ بینک سے چھٹی کے بعد معروف شاعر طفیل ہوشیار پوری کے ادبی رسالے "محفل" کے دفتر چلے جاتے۔ وہاں اُن کی ملاقاتیں طفیل ہوشیار پوری کے علاوہ شرقی بن شائق، رشید کامل، ارمان عثمانی، الیف ڈی گوہر اور یزدانی جالندھری ایسے اساتذہ سے ہوئیں۔ مصرع ہائے طرح دیے جاتے اور طبع آزمائی ہوتی۔ حفیظ شاہد کا کلام معروف و مقبول رسائل "محفل"، "قندیل"، "اقدام"، "بیسویں صدی" (نئی دہلی)، "شمع" (نئی دہلی)، "لیل و نہار"، "رومان"، "نیا زمانہ" (لاہور) ہفت روزہ "زندگی"، "جدید ادب"، سہ ماہی "بچے من کے سچے" اور "شعور و ادراک" (خان پور) وغیرہ میں شائع ہوتا رہا۔

لاہور میں رہ کر حفیظ شاہد نے فلمی گیت نگاری بھی کی۔ حفیظ شاہد نے اُردو اور پنجابی گیت لکھے۔ ایک پشتو فلم بھی بنائی مگر فلاپ ہو گئی اور مالی طور پر بہت زیادہ نقصان کا باعث رہی۔ حفیظ شاہد نے متعدد پنجابی فلموں کے گیت لکھے، ایک فلم "بلبل پنجرے دی"۔ اس فلم کے ڈائریکٹر رحمان ورما تھے۔ اس کے چار گیت ریکارڈ ہوئے جو میڈم نور جہاں، نسیم بیگ، تصور خانم اور مسعود رانا نے گائے تھے۔ لیکن یہ فلم تکمیل کے مراحل تک نہ پہنچ سکی۔ دوسری پنجابی فلم جس کا نام "چھڈ بُرے دی یاری" تھا۔ اس فلم کے دو گیت لکھے۔ اس فلم کے ڈائریکٹر اے ریاض تھے۔ یہ فلم کافی مقبول ہوئی۔ حفیظ شاہد کا لکھا ہوا تھیم سانگ، رجب علی کی آواز میں بہت مقبول ہوا۔ جس کے بول تھے:

اپنے ای پیاریاں دا پیار لُٹ لیندے نیں ..... کدی کدی یاراں نوں وی یار لُٹ لیندے نیں

حفیظ شاہد 1976ء میں مستقل طور پر لاہور سے خان پور منتقل ہو گئے اور فلمی گیت نگاری کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

حفیظ شاہد کی شاعری کا ایک اور پہلو تاریخ گوئی ہے۔ تاریخ گوئی میں کسی خاص واقعے پر نثر میں یا قطعہ کہہ کر اور آخری مصرعے یا شعر سے ابجد کے حساب سے اس کی تاریخ نکالی جاتی ہے۔ اس طرح اہم تاریخیں ان سطروں، مصرعوں یا شعروں کے ذریعے سے ذہنوں میں نکالی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ فن بہت پرانا ہے لیکن اس میں نام پیدا کرنے والے صرف چند ہی شاعر مشہور ہیں جیسے غالب، مومن، داغ، شمیم متھراوی، رئیس امروہوی، علامہ قابل گلاؤٹھوی، صبا اکبر آبادی، محشر بدایونی اور نیساں اکبر آبادی وغیرہ

خان پور میں رہتے ہوئے شعر و ادب کی محافل برپا کیں اور معاصر شعراء کے ساتھ ادبی اور شعری نشستوں میں مستقل شرکت کرتے رہے۔ خان پور میں حفیظ شاہد کے ہم عصر شعراء میں گلزار نادم صابری، رفیق راشد، حیدر قریشی، اسد حسین ازل، آسی خانپوری، مجاہد جتوئی اور دیگر شامل تھے۔ 2004ء میں "معارف" کے نام سے ادبی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ جس کے تحت نامور علمی وادبی شخصیات کے اعزاز میں ماہانہ ادبی محافل کا اہتمام کیا۔

☆☆☆

میگزین رپورٹ

دبستانِ خان پور کا قیمتی اثاثہ... حفیظ شاہدؔ

مرحوم اپنے پیچھے قیمتی ادبی سرمایہ چھوڑ گئے ہیں جو انہیں تادیر زندہ رکھے گا۔
حفیظ شاہد مرحوم کے فن و شخصیت کے حوالے سے ادبا اور شعراء کے تاثرات

معروف ادیب و شاعر اور چیف ایڈیٹر ''بچے من کے سچے'' حفیظ شاہد مرحوم کو ہم سے بچھڑے سات سال ہو چکے ہیں۔ حفیظ شاہد اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ہر شخص سے محبت و احترام سے پیش آنے والے کمال انسان تھے۔ سہ ماہی ''بچے من کے سچے'' کے لیے حفیظ شاہد کی بطور چیف ایڈیٹر خدمات ہمارے لیے اعزاز اور فخر کا باعث ہیں۔ حفیظ شاہد کی علمی و ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے یادِ رفتگاں ''بچے من کے سچے'' ایک خاص شمارہ (اپریل تا جون ۲۰۱۷ء) میں خصوصی گوشہ کے تحت حفیظ شاہد کے فن و شخصیت کے حوالے سے مقامی اُدبا و شعراء کی تحریروں پر مشتمل شائع کر چکا ہے۔ خصوصی گوشہ میں نامور اُدبا و شعراء کے تاثرات پر مشتمل ایک رپورٹ تیار کی گئی تھی۔ حفیظ شاہد نے خان پور کے ادبی حلقوں میں جو یادیں چھوڑی ہیں۔ ان کو دُہراتے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کی آراء ملاحظہ کیجئے۔ (مدیر)

☆--- **اظہر ادیب (شاعر)**

یوں تو خان پور کے تمام احباب سے بھی تعلق قائم رہا لیکن حفیظ شاہد اور آسی خان پوری سے قربتیں مزید بڑھ گئیں۔ دونوں احباب سادہ مزاج، محبت کرنے والے نہایت خوب صورت انسان تھے۔ دونوں کی طبیعت میں بچوں جیسی معصومیت تھی۔ حفیظ شاہد ادبی دنیا میں ایک اہم شناخت رکھتے تھے۔ انہوں نے سینئر شاعر ہونے کے ناطے ادبی، ثقافتی اقدار کو فروغ دیا اور نئے آنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے ان کی منفرد پہچان تھی۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

☆--- **سیّد محمد فاروق القادری مرحوم (محقق، ادیب۔ شاہ آباد پور شریف، گڑھی اختیار خان)**

حفیظ شاہد بے حد شفیق اور مہربان انسان تھے۔ ہمیشہ مثبت سوچ رکھتے تھے۔ بحیثیت شاعر انہوں نے جو ادبی سرمایہ چھوڑا ہے، وہ اُنہیں مدتوں زندہ رکھے گا۔ وہ پرانی اقدار کے حامل اور روایتی وضع داریوں کے امین تھے۔ وہ محبت کرنے والے ہمدرد اور مخلص انسان دوست شخص تھے۔ اب ایسے اخلاق نظر نہیں آتے۔

☆--- **ایم عبدالواحد افغانؔ (چیف ایڈیٹر: بچے من کے سچے، خان پور)**

حفیظ شاہد کی ادب کے فروغ میں خدمات قابلِ فخر ہیں۔ منفرد و ندرتِ خیال کے شاعر، الفاظ و معانی کو صاف

کہنا اور اسے لکھنے کے استاد حفیظ شاہد ایک طرحدار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا شعر پڑھنے کا منفرد انداز قاری کو دعوتِ فکر بھی دیتا ہے۔ حفیظ شاہد سب سے مسکراتے ہوئے ملتے اور اپنی شگفتہ طبیعت سے محفل کو زعفران بنا دیتے تھے۔ حفیظ شاہد کا کلام ہی اُن کی قابلیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انہوں نے ہمیشہ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ''بچے من کے سچے'' کے لیے علمی و ادبی خدمات لائقِ صد تحسین ہیں۔

☆ گوہر ملسیانی مرحوم (صادق آباد)

جدید تر اُسلوبِ غزل کے نمائندہ اور منفرد لہجے کے شاعر حفیظ شاہد۔ جدید غزل کو زندہ اُسلوب دے کر بامِ عروج تک پہنچانے میں جن شعرائے کرام نے گلستانِ جذبہ و خیال سجایا ہے اور اظہار و بیان میں رنگا رنگ پھول کھلا کر انفرادیت کا روپ دکھایا ہے' حفیظ شاہد اُن میں سر و قد ہیں۔ حفیظ شاہد نے ہمیشہ اپنی ذات کو ہدف بنا کر بات کی۔ لیکن جب اس کے بعد انہوں نے کسی دوسرے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا تو کسی نے برا نہیں منایا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ حفیظ شاہد لاکھوں میں ایک تھے۔ انسانیت کے رمز شناس، بے حد حساس مگر رفاقت میں دمکتے الماس۔

☆ ــــ ڈاکٹر مختار احمد عزمی (چیئرمین شعبہ اُردو منہاج یونیورسٹی، لاہور)

حفیظ شاہد خان پور کی معروف علمی و ادبی شخصیت تھے۔ الوحید ادبی اکیڈمی سے طویل عرصہ منسلک رہے۔ علمی و ادبی حلقوں میں خاصا اثر رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں اقبالؒ کا رنگ ملتا ہے۔ اصلاحی اور منفرد خیالات کے مالک تھے۔ ان کے شعر پڑھنے کا انداز دل کو موہ لینے والا تھا۔

☆ ــــ رفیق احمد صدیقی (پرنسپل: گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، بوائز۔ خان پور)

حفیظ شاہد ایک شریف اور نفیس انسان تھے۔ جنہوں نے اپنی ساری زندگی ادب کی خدمت و فروغ میں گزری۔ وہ ہمیشہ انسانیت سے محبت کرتے رہے۔ حفیظ شاہد کی وفات سے پیدا ہونے والا خلا کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔ اُن کی ادبی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ وہ ادب کے اُفق کے درخشندہ ستارے تھے۔ حق مغفرت کرے۔

☆ ڈاکٹر محمد اجمل بھٹی (پرنسپل: خواجہ فرید پوسٹ گریجوایٹ کالج، رحیم یار خان)

حفیظ شاہدؒ نیاز مندی کے قائل تھے۔ وہ سب سے پیار کرتے تھے۔ وہ سب کا احترام کرتے اور سب کے محترم تھے۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کا کلام با کمال محبتوں اور معصومیت کا آئینہ دار تھا۔ مخلص، غیر جانبدار اور ضابطہ اخلاق کے پابند شاعر تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میرے وطن کے سارے شاعر ان جیسے ہوں تو شاعری کا صحیفہ ایسے نکھر جائے جیسے کھلا ہوا گلاب۔

☆ ــــ شمسہ اختر ضیاء (معروف ادیبہ و شاعرہ)

حفیظ شاہدؒ ہمارے ادب کا قیمتی سرمایہ تھے۔ کلیات ''ختمِ سفر سے پہلے'' کی شکل میں جو اثاثہ چھوڑا ہے وہ بے مثال و کمال ہے۔ حفیظ شاہد اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ خوب صورت انسان بھی تھے۔

☆ ــــ پروین عزیز (سابق چیئرمین شعبہ انگلش، گورنمنٹ گرلز کالج، خان پور)

حفیظ شاہد کی ادبی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انہوں نے ادب میں خوب نام کمایا۔ اپنی شاعری کے

ذریعے معاشرتی اور سماجی خامیوں کی نشاندہی کی۔

☆اظہر عروج (حفیظ شاہد کے شاگرد، مدرس)

حفیظ شاہد میرے اُستاد شاعر تھے۔ وہ نئے لکھنے والوں کی بہت حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند کرے۔ آمین

☆یاور عظیم (حفیظ شاہد کے شاگرد، مدرس)

اُستادِ محترم حفیظ شاہد (مرحوم) بلاشبہ اعلیٰ پائے کے شاعر تھے اور شاعروں کے اُستاد بھی تھے۔ انسانی اور اخلاقی پہلوؤں سے بھی وہ قابلِ رشک مقام پہ فائز تھے۔ میں اُن کی شاگردی میں تقریباً گیارہ سال رہا۔ ان کی غزلوں میں متعدد رندانہ اور رومانی طرز کے اشعار کی موجودگی فارسی، اُردو غزل کی عمومی روایت سے اُن کا رشتہ جوڑتی ہے۔ اُنہیں اپنے خدا اور شارع سے محبت تھی۔ حفیظ شاہد کا کلام جا بجا خیر کے پہلوؤں سے عبارت ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے استادِ محترم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین

☆محمد یوسف وحید (ایڈیٹر: ''بچے من کے سچے'' خان پور)
(جنرل سیکرٹری: الوحید ادبی اکیڈمی خان پور)

خان پور کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت ''حفیظ شاہد'' ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ حفیظ شاہد ایک بلند پایہ ادیب و شاعر جنہوں نے ساری زندگی ادب کی تخلیق میں صَرف کر دی اور اہلِ علم و باذوق قارئین کیلئے بیش قیمتی خزانہ چھوڑ گئے۔ اُن کی شعری تخلیقات موجودہ اور آنے والے ادب کا ذوق وشوق رکھنے والوں کے لیے قیمتی اثاثہ ہے۔ تحقیق کے متلاشی ان سے ادبی رہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ اُنہیں کروٹ کروٹ راحت نصیب فرمائے۔ آمین

(بحوالہ: گوشہ حفیظ شاہد، مجلّہ: ''بچے من کے سچے'' خان پور۔ اشاعت: اپریل تا جون ۲۰۱۷ء)

☆☆☆

کلام حفیظ شاہد

کم تو ہو گا جنوں کہیں نہ کہیں
گھر سے نکلوں، چلوں کہیں نہ کہیں

اے خدا پھر وہ چاند سا چہرہ
اک نظر دیکھ لوں کہیں نہ کہیں

مجھ کو اپنی تلاش رہتی ہے
میں بھی موجود ہوں کہیں نہ کہیں

اک تماشا بنا کے چھوڑے گا
مجھ کو میرا جنوں کہیں نہ کہیں

دیکھنا ! بر سرِ زمیں ہو گا
آسماں سرنگوں کہیں نہ کہیں

سوچتا ہوں کہ چھوڑ کر سب کچھ
دشت میں جا بسوں کہیں نہ کہیں

ہم بھی شاہدؔ گزار ہی دیں گے
زندگی بے سکوں کہیں نہ کہیں

☆☆☆

اظہر ادیب (صادق آباد)

حفیظ شاہد... کچھ یادیں

حفیظ شاہد کے دیرینہ دوست اظہر ادیب کے تاثرات

حفیظ شاہد سے میرا تعلق ۸۰ء کی دہائی میں قائم ہوا اور پھر یہ تعلق گہری دوستی میں تبدیل ہوتا گیا۔ ہر ہفتے دو تین دن ہم اکٹھے گزارتے تھے۔ بعض اوقات ساری ساری رات محفل جمی رہتی تھی۔ ہمارے ساتھ آسی خانپوری بھی شریک ہوتے تھے۔ حفیظ شاہد، بہت پرگو اور منجھے ہوئے شاعر تھے۔ وہ بات کو گھما پھرا کر کرنے کے عادی نہیں تھے۔ سیدھے سادے انداز میں کہے ہوئے اشعار سہلِ ممتنع کے درجے تک جا پہنچتے تھے۔ عام طور پر پرگو شعرا معیار برقرار نہیں رکھ سکتے لیکن حفیظ شاہد اس معاملے میں کہیں بھی ٹھوکر نہیں کھاتے تھے۔

اُن کی شاعری کے بارے میں تو وقت اور نقادانِ فن ہی کوئی فیصلہ صادر کر سکتے ہیں۔ مجھے تو دوست کی کہی ہوئی ہر بات اچھی لگتی تھی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک مانع نہیں کہ مجھے صاحبِ کتاب کرنے میں ان کا ہاتھ تھا۔ میں تو بہت کاہل واقع ہوا ہوں۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اپنی کتاب چھپواؤں لیکن حفیظ شاہد کے بے حد اصرار پر میں اس کام کو کرنے پر آمادہ ہوا۔ اُن کے خلوص کی انتہا یہ تھی کہ انہوں نے مجھے مسودہ مکمل کر کے ان کے حوالے کرنے پر اصرار کیا اور جب میں نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا تو نہ صرف یہ کہ انہوں نے کتابت اپنی نگرانی میں کروائی بلکہ کتاب پر آنے والے تمام اخراجات بھی خود برداشت کیے۔ آج کے دور میں ایسے مخلص دوست کم لوگوں کو میسر آتے ہیں۔ یادوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے لیکن آج لفظ میرا ساتھ نہیں دے رہے اس لئے میں صرف اپنے ایک شعر پر بات ختم کر رہا ہوں۔

اب تجھے کیسے بتائیں کہ کسی کا اپنا
شہر کی بھیڑ میں کھو جائے تو کیا ہوتا ہے

☆☆☆

(مطبوعہ خصوصی گوشہ سہ ماہی "بچے من کے سچے"۔ اپریل تا جون ۲۰۱۷ء)

یاور عظیم (خان پور)

میں اور اُستاذی

یہ غالباً ۲۰۰۳ء کے اُواخر کی بات ہے جب میں نے اُستادِ محترم، حفیظ شاہد مرحوم سے اصلاح لینا شروع کی۔ اس وقت میں انٹرمیڈیٹ کا طالبِ علم تھا۔ قافیے اور ردیفیں کی تو پہچان تھی البتہ وزن اور آہنگ وغیرہ کا زیادہ پتا نہ تھا۔ استادِ محترم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق شعر خوانی کرتا تھا۔ استادِ محترم نے یہی تو فرمایا تھا کہ پہلے شعر پڑھنا سیکھیں، شعر پڑھنا آجائے گا تو شعر کہنا بھی آجائے گا۔ میں نے ان کے کہنے کے مطابق شعر خوانی کی اچھی خاصی مشق شروع کر رکھی تھی۔ یہ ان دنوں میری زندگی کا جزوِ لاینفک تھا۔ کالج سے گھر واپس آتا تو سلام و طعام کے بعد سیدھا بیٹھک میں جا گھستا۔ بعض اوقات دونوں اطراف کے دروازے تک لاک کر لیتا تا کہ میرے مطالعے میں خلل نہ پڑے۔ امی جان یا گھر میں سے کوئی اور دروازہ بجاتا تو میرے موڈ اور وجود پہ بے چینی کی سلوٹیں پڑنے لگتیں۔ فرمایا جاتا کہ بھئی ماسی کو جھاڑ و پوچا اور صفائی ستھرائی تو کرنے دو۔ یہ سن کر بادلِ نخواستہ بیٹھک سے باہر آتا اور کہتا کہ ایک باری میں ہی سب کام کرا لیں تو ٹھیک ہے۔ مجھے بار بار تنگ نہ کیا کریں۔ ماسی بیچاری جلدی جلدی سارے کام نمٹاتی تو میں دوبارہ حالتِ تقفیل میں چلا جاتا۔

اس انہماک کا یہ نتیجہ نکلا کہ دو تین ماہ کے عرصے میں میرے ذہن میں مختلف بحروں میں لکھے ہوئے شعروں کے آہنگ اچھی طرح رچ بس گئے۔ الفاظ کا اتار چڑھاؤ مجھ پہ خاصا واضح ہو گیا۔ میں نے (استاد کے تعلیم کردہ طریقے کے مطابق) جس کتاب سے باقاعدہ شعر خوانی کا آغاز کیا تھا وہ استادِ محترم کی اولین کتاب تھی۔ جس کا نام "سفر روشنی کا" تھا۔ یوں کہہ لیں کہ "سفر روشنی کا" سے واقعی میری ادبی زندگی میں اک روشنی کا سفر شروع ہوا جو آج تک جاری و ساری ہے۔ یہ روشنی تھی علم و آگہی کی، زبان و بیان کی متنوع خوبیوں اور الفاظ کے فنکارانہ استعمال کی، صنائع بدائع کو بروئے کار لانے کی، عروض اور اس کی باریکیوں سے آشنائی کی، زحافات سے واقفیت کی، جہان ہائے معنی کو دریافت کرنے کی، شعری جمالیات سے لطف اندوز ہونے کی، اور سب سے بڑھ کر تہذیب و اقدار کی روشنی جس نے دھیرے دھیرے میرے باطن کو منور کرنا شروع کر دیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں شاگردی کے ابتدائی تین چار سالوں میں اوسطاً تین سے چار گھنٹے شاعری خاص کر غزل کا مطالعہ کرتا۔ استادِ محترم کیونکہ بنیادی طور پہ غزل کے شاعر تھے۔ اس لیے ان کی شاگردی اور مصاحبت کا مجھ پہ جو پہلا اثر ہوا وہ یہی تھا کہ میں مشرف بہ غزل ہو گیا۔ اگرچہ میں نے کچھ نظمیں اور قطعات وغیرہ بھی گیارہ سالہ مدتِ تلمذ میں کہے لیکن اُن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ٹھہری۔

"سفر روشنی کا" سے میری شعر خوانی اس شد و مد اور لگن سے شروع ہوئی تھی کہ میں دورانِ مطالعہ ایک ایک مصرعے کو بیس بیس مرتبہ دہراتا اور اس قدر آواز سے پڑھتا تھا کہ میری آواز کم از کم میرے کانوں میں ٹھیک سے

پڑتی رہے۔ اس طرح میں نے وہ پہلی کتاب تقریباً دو سے ڈھائی ماہ میں ختم کی۔ استادِ محترم کی کوئی کتاب سو سے کم غزلوں پہ مشتمل نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے ایک کتاب سے بھی سیکھنے کے خاطر خواہ مواقع ہاتھ آتے تھے۔ بحریں، قافیے، ردیفیں، مصرعوں کی پیوستگی، تراکیب، مضمون آفرینی، لب ولہجہ، لفظ کا برمحل اور شاعرانہ استعمال وغیرہ ایسی ڈھیروں باتیں تھیں جو میں اپنی بساط کے مطابق سیکھتا رہتا تھا۔ لہٰذا جب میں نے صرف ایک کتاب پڑھی اور اس کے بعد ایک غزل کہہ کر استادِ گرامی کی خدمت میں بغرضِ اصلاح لے گیا تو مجھے یاد ہے اس میں وزن کی محض ایک دو غلطیاں نکلی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ میں نے "دراصل" کو صاد متحرک (مفتوح) کے ساتھ باندھا تھا جبکہ یہ لفظ صاد ساکن کے ساتھ موجود ہے۔ یعنی مجھے آہنگ تو سمجھ آنے لگا تھا اور اُس کے مطابق درست لکھ لایا تھا لیکن میرا تلفظ کیونکہ غلط تھا اس لیے وہ مصرعہ ازرُوئے تلفظ غلط قرار پایا۔ اس کی جگہ استاد نے کوئی اور لفظ لکھ دیا تھا جو مجھے اب یاد نہیں۔

حفیظ شاہد مرحوم کی اصلاح کا طریقہ کار قدیم دور کے اساتذہ سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ میں جب ان کے پاس کوئی غزل اصلاح کے لیے لے جاتا تو وہ اس کو عموماً ایک لگے بندھے انداز سے دیکھتے۔ ایک بات جو شاعری میں ہمیشہ ناقابلِ قبول سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ شعر خارج الوزن نہیں ہونا چاہیے۔ مزید برآں یہ کہ خلافِ محاورہ بات نہ ہو۔ روز مرّہ کی حتی الامکان پابندی کی جائے۔ دونوں مصرعوں کا آپس میں معنوی ربط ہو۔ قاری شعر پڑھے تو ابہام کے سمندر میں غوطے نہ کھاتا رہ جائے اور نہ یہ کہ بے معنویت کے دریا میں غرقاب ہو کر رہ جائے۔ شعر کا کم از کم ایک معنی سامنے کا ضرور ہو جس کا ابلاغ قاری یا سامع کو سہولت سے ہو سکے۔ اگر معنی کی ایک سے زیادہ پرتیں ہوں تو یہ بعض صورتوں میں مستحسن ہے، البتہ یہ کوئی لازمی شرطِ شعر نہیں۔ قافیے درست استعمال کیے جائیں۔ ردیف عمدگی سے کھپائی جائے جس کو شعرا کے یہاں ردیف بولنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ حفیظ شاہد (مرحوم) جب میری غزلیں دیکھتے تھے تو زیادہ تر انھی پہلوؤں سے اصلاح اور نشان دہی کرتے تھے۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ کم سے کم الفاظ تبدیل کر کے شعر کو سنوار دیا جائے۔ اس کے علاوہ ان کی یہ پہلی کوشش ہوتی تھی کہ جو خیال میں نے پیش کرنا چاہا ہے، میرے شعر کا جو قضیہ ہے وہ تبدیل نہ ہو۔ جس بات کے لیے میں نے شعر آرائی کی ہے، وہ مکمل نہیں تو تقریباً وہی رہے۔ مجھے ایک شاگرد ہونے کے ناتے ان کا یہ طریقۂ اصلاح مرغوب بھی تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھے میری مرضی کی کوئی بات کہنے سے روکا جائے یا میری بات کو کچھ سے کچھ بنا دیا جائے۔ ہر انسان کا مختلف مزاج ہوتا ہے۔ آپ ایک شاگرد پر یہ پابندی نہیں لگا سکتے کہ وہ آپ کی کاربن کاپی بن جائے۔ اصلاح اور اکتسابِ ہنر ایک علیحدہ چیز ہے اور طبائع کا فرق ایک الگ معاملہ ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شاعر تو حفیظ شاہد (مرحوم) بلاشبہ اعلیٰ پائے کے تھے اور شاعروں کے استاد بھی تھے۔ انسانی اور اخلاقی پہلوؤں سے بھی وہ قابلِ رشک مقام پہ فائز تھے۔ میں ان کی شاگردی میں قریباً گیارہ سال رہا۔ اس دوران حفیظ شاہد مرحوم نے کبھی مجھ سے کوئی فرمائش نہیں کی۔ کبھی مجھے کسی چھوٹے بڑے کام کے لیے دوڑایا نہیں۔ کبھی مجھے ایک گلاس پانی پلانے کا نہیں کہا۔ کبھی حقِ محنت طلب نہیں کیا۔ کبھی مجھے ملاقات کو آنے سے منع نہیں کیا۔ کبھی ملاقات کے دوران مجھ سے یہ نہیں کہا کہ اچھا اب میں تھک گیا ہوں یا کوئی مصروفیت ہے تو پھر ملاقات ہو گی۔ میں ان

کے پاس گھنٹوں بیٹھا کرتا۔ بسا اوقات دن میں دو دفعہ ملاقات ہوتی یعنی دو پہر سے شام تک ان کے دفتر میں اور پھر قریباً عشا سے رات دیر تک اُن کے گھر پہ نشست جمتی۔ امرِ واقعہ یہ ہے جب تک میں بیٹھا ہوں وہ بھی متوجہ بیٹھے ہیں۔ چاہے رات کے ڈیڑھ یا دو ہی کیوں نہ بج رہے ہوں۔ جب میں ۲۰۰۷ء میں پنڈی چلا گیا اور چار پیسے کمانے لگ گیا تو ایک دفعہ خانپور آمد کے موقع پہ حسبِ معمول خانۂ استاذ پہ حاضری دی۔ بیٹھک میں جا بیٹھا۔ استادِ محترم کی زیارت نصیب ہوئی۔ گفتگو کے دوران اندازہ ہوا کہ اُن کے سگریٹ ختم ہونے کے قریب ہیں اور وہ شاید سلمان بھائی (استاد کے فرزندِ خورد) کے انتظار میں ہیں کہ ان سے کہہ کر سگریٹ منگوائیں۔ میں یہ صورتِ حال بھانپ گیا۔ اتنا تو پتا تھا کہ اگر استادِ محترم سے سگریٹ لانے کی رسمی اجازت طلب کی تو کبھی نہ ملے گی۔ لہٰذا جوں ہی استادِ محترم درونِ خانہ کسی کام سے گئے تو میں فٹافٹ بیٹھک کے بیرونی دروازے سے نکلا اور گلی میں موجود ایک دکان سے "کے۔ٹو" سگریٹ کی ڈبّی لے آیا اور بڑے احترام سے میز پہ رکھ دی۔ استاد جی اس وقت یہی برانڈ پیتے تھے اور کبھی کبھی سگار بھی ان کو پیتے دیکھا تھا۔ خیر جب تک میں آیا تو استادِ محترم ابھی واپس نہیں آئے تھے۔ جب آئے اور تھوڑی دیر میں میز پہ نظر پڑی تو استفسار کیا کہ یہ پیکٹ کون لے کر آیا؟ کیا سلمان رکھ گئے ہیں؟ میں نے عرض کی کہ استاد جی میں لے آیا تھا کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ آپ کے سگریٹ ختم ہو رہے ہیں۔ اس پہ انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ نے یہ تکلیف کیوں کی؟ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور میرے اس معمولی سے عمل کی وجہ سے وہ خاصے شرمندہ اور معذرت خواہ سے نظر آئے۔

اربابِ عدل و انصاف! آپ خود سوچیں کہ ایک آدمی جس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہو۔ وہ ایک فیکٹری میں منیجر ہو۔ صبح سے لے کر شام تک کھاتے اور حساب کتاب دیکھتا ہو۔ اس کا گھر بار اور بیوی بچے ہوں۔ وہ خود شعر کہتا ہو۔ مطالعہ کرتا ہو۔ اس پہ اپنے شاگرد کو ہفتے کے متعدد ایام میں بہت سا وقت دیتا ہو۔ یہاں تک کہ جب وہ شام کو فیکٹری سے تھکا ہارا گھر چلا جائے تو اکثر اوقات شام میں اس کا شاگرد مکرّر توجہ و رہنمائی کے لیے حاضر ہو۔ وہ محفل شام سے شروع ہو کر بارہ بجے رات تک اور کبھی ایک دو بجے تک جاری رہتی ہو۔ ایسا ایک آدھ ہفتے نہیں، ایک آدھ مہینے نہیں بلکہ تین چار برسوں سے جاری ہو۔ اس سب کے باوجود اس نے ایک دھیلہ تک اپنے شاگرد سے نہ طلب کیا ہو اور نہ کبھی اس کی توقع رکھی ہو۔ نہ کبھی کسی غلطی پر، نہ کبھی کسی تکلیف پر ترش جبیں ہوا ہو۔ اگر تین چار سالوں کے بعد شاگرد کمانے جوگا ہو جائے اور استادِ محترم کو سگریٹ کی ایک ڈبی اپنی محبت سے لا دے تو اس پہ بھی استاد معذرت اور شرمندگی کا اظہار کرے۔ ایسی مثالیں اس حرص و ہوس اور نفسا نفسی کے دور میں ناپید نہیں تو نایاب ضرور ہیں۔

حفیظ شاہد (مرحوم) عرفِ عام میں کوئی مولوی نہیں تھے۔ ان کی غزلوں میں متعدد رندانہ اور رومانی طرز کے اشعار کی موجودگی فارسی اردو غزل کی عمومی روایت سے ان کا رشتہ جوڑتی ہے۔ لیکن وہ اپنی غزل گوئی میں یک گونہ احتیاط رکھتے تھے۔ ایسے اشعار سے گریز کرتے تھے جن سے (بزعمہٖ) دین کی حرمت پہ کوئی آنچ آئے۔ جن سے خدانخواستہ ہمارے اسلاف و اکابر کی ہتک کا پہلو نکلتا ہو۔ جن سے ہماری روشن روایات کی تضحیک ہوتی ہو۔ انھیں اپنے خدا اور شارع سے محبت تھی۔ انھیں ارضِ پاکستان اور اس کے باسیوں سے پیار تھا جس کا وہ اپنی

شاعری میں بار بار اظہار کرتے تھے۔ وہ نئے علوم، افکار اور نظریات کی چکا چوند میں اپنے دین، اپنی مٹی، اپنی تہذیب اور اپنی روایات کو عزیز رکھنا بہتر خیال کرتے تھے۔ ان کی شاعری پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر کہیں نہ کہیں خیر کا علم بردار ضرور ہوتا ہے۔ اس کے سینے میں انسانیت کا درد ہوتا ہے۔ وہ ایک بہتر سماج کی تشکیل چاہتا ہے۔ وہ عدل و مساوات کا داعی اور حق و صداقت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ حفیظ شاہد (مرحوم) کا کلام جا بجا ایسے ہی خیر کے پہلوؤں سے عبارت ہے۔ وہ آج کے انسان میں شرفِ انسانیت کو قائم دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے من کو اجالنا چاہتے ہیں۔ اُس کو دوسروں کی مدد پہ آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔ انسان کا اپنے خالق اور اپنی فطرت سے قرنوں پرانا رشتہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ یہی بات وہ غیر اعلانیہ انداز میں میرے شعروں میں بھی دیکھتے رہتے تھے کہ کہیں میں نے ان حدود سے تجاوز تو نہیں کیا جو ہمارے دینی، ادبی، وطنی اور تہذیبی تناظر میں ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہیں۔

۲۰۰۳ء سے ۲۰۰۷ء کے دوران مَیں دین پور (خانپور سے ملحقہ ایک قصبہ) سے تھوڑا آگے موجود عائشہ کاٹن جنرز، (جو ان کے کزن کی تھی اور جہاں حفیظ شاہد مرحوم مینیجر تھے) اور جناح ٹاؤن میں موجود حفیظ شاہد (مرحوم) کے گھر جاتا رہا۔ اس دوران مَیں استادِ محترم سے یکے بعد دیگرے شاعری کی کتابیں لاتا رہا۔ ان کو غزلیں دکھاتا۔ ان سے قدیم و جدید شاعروں اور شاعری کے متعلق سوالات کرتا۔ ان سے لاہور میں گزرے ہوئے دنوں کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنتا۔ میں نے ان کے نجی کتاب خانے میں ایسی کتابیں اور رسائل دیکھے جو مجھے آس پاس کی کسی دوسری لائبریری میں نظر نہیں آسکے۔ مثلاً یزدانی جالندھری (مرحوم) کی کتاب توراتِ دل، انھی کی نعتیہ مثنوی ''صبحِ سعادت''، شرقی بن شائق کا بعد از وفات چھپنے والا ضخیم کلیات ''لمعاتِ شرقی''، شہرت بخاری کی کتاب ''شبِ آئینہ''، ''نقوش'' کے خاص نمبرز، ''اردو لغت، تاریخی اصول پر''، ''لیل و نہار'' کے شمارے جو استادِ محترم نے سنون کی ترتیب سے مجلد کرا رکھے تھے، انیس و دبیر کے کلام کے پرانے چھپے ہوئے نسخے، پاکستان کے ابتدائی سالوں کی ایک اردو گرامر جو انگریزی میں پڑھائی جاتی تھی اور اس میں عروض کا بھی باب موجود تھا، اس کے علاوہ ان کے پاس قدیم و جدید کلیات کی اچھی خاصی ورائٹی تھی۔ میں جب ان سے ملنے جاتا تو بقدرِ موقع کتابیں دیکھتا رہتا، اور جب بھی استادِ محترم درونِ خانہ تشریف لے جاتے تو کوئی نہ کوئی کتاب لے کر پڑھنے بیٹھ جاتا۔ وہ کتاب اگر پسندِ خاطر ہوتی تو پڑھنے کے لیے لے آتا۔ اس طرح مجھے حفیظ شاہد (مرحوم) کی صورت میں ایک ایسا چھتنار درخت میسر آ گیا جس کی شیتل چھاؤں میں میرے ادبی میلانات کی تسکین کا پورا سامان موجود تھا۔

حفیظ شاہد (مرحوم) لاہور سے خصوصی محبت رکھتے تھے۔ وہ خانگی اور معاشی مجبوریوں کے تحت لاہور سے خانپور تو آگئے تھے اور جب میں ان کا شاگرد ہوا تو اس ہجرت کو دو عشروں سے زائد زمانہ گزر چکا تھا۔ اس کے باوجود ان کے سینے میں لاہور سے بچھڑنے کا داغ تازہ تھا جس کی آنچ ان کی گفتگو سے محسوس ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنی شاعری میں بعض مقامات پر لاہور سے اپنی نسبت اور محبت کا دردمندانہ اور برملا تذکرہ کیا ہے۔ اس حوالے سے بہاولپور کے پروفیسر سہیل اختر (مرحوم) نے حفیظ شاہد (مرحوم) کے پانچویں مجموعہ کلام ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' کے دیباچے میں استادِ محترم کے لاہور قیام اور وہاں کے مشاغل کے بارے میں کافی باتیں لکھی ہیں۔ اس طویل دیباچے سے حفیظ شاہد (مرحوم) کی شخصیت، ان کے ادبی سفر اور ذہنی تشکیل کا اندازہ

کرنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ بعد ازاں کچھ دوستوں نے حفیظ شاہدؔ (مرحوم) کے بارے میں لکھے ہوئے اپنے مضامین میں انھی باتوں کی جگالی کی ہے۔ اس لیے میں ان باتوں کو یہاں دہرانا مناسب نہیں سمجھتا۔ اگر آپ حفیظ شاہدؔ (مرحوم) اور لاہور میں ان کے دوستوں جیسے یزدانی جالندھری (مرحوم) اور شرقی بن شائق (مرحوم) وغیرہ کے کلام کا تقابلی مطالعہ کریں تو آپ کو ان شعرا کے یہاں کچھ غزلوں کی زمینیں مشترک دکھائی دیں گی۔ یہ وہی غزلیں ہیں جو لاہور میں ماہنامہ "محفل" کے دفتر میں ہونے والی ادبی نشستوں اور اُن میں دیے جانے والے مصرعہ ہائے طرح کی دین ہیں۔

میرے استادِ محترم پنجابی، ارائیں تھے اور ان کے گھر میں پردے کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ ان کے معتقدات کا، ان کے پابندِ صوم وصلوٰۃ ہونے کا اور ان کے اعلیٰ اخلاق کا اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ میں خود جٹ قوم سے تعلق رکھتا ہوں اور میری گوت چنبہ ہے (میرے نانا جان، غفراں مآب، محمود مرزا البتہ گوالیار، انڈیا سے آئے تھے اس بنا پر میری مادری زبان اردو ہے)۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے والدین نیک خُو اور صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں۔ خاص کر میرے والدِ گرامی قدر، پنجگانہ نماز کی پابندی کے ساتھ چاشت، اشراق اور تہجد کی پابندی بھی کرتے آئے ہیں۔ میرے والدین نے میری تربیت پہ روزِ اوّل سے توجہ دی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے ابتدائے تعلیم سے نیک سیرت اور محبت کرنے والے استادوں سے تعلیم حاصل کی ہے۔ اسکول کے دنوں سے استاد کی تقدیس و عظمت کا تصور میری لوحِ دل پہ نقش تھا۔ اور حفیظ شاہدؔ (مرحوم) تو مجھے سب استادوں سے بڑھ کر تھے۔ لہٰذا میں جب استادِ محترم کے گھر جاتا تو بیل دے کر تھوڑا دُور ہٹ کے کھڑا ہو جاتا۔ منھ دروازے سے اک طرف پھرا ہوتا اور گردن قدرے جھکی ہوتی تاکہ دروازہ کُھلے تو کسی سے براہِ راست سامنا نہ ہو اور خدانخواستہ گھر کے اندر بھی نظر نہ پڑے۔ اگر حفیظ شاہدؔ (مرحوم) یا اُن کے بیٹے کی آواز آتی تو میں رخ اُدھر کر لیتا ورنہ استادِ محترم کا پوچھ کر اور ان کی موجودگی کا سُن کر بیٹھک کے بیرونی دروازے کی طرف آ کھڑا ہوتا۔ وہ دروازہ استادِ محترم یا سلمان بھائی کھولتے تو وہیں میری استاد کے ساتھ ملاقات ہوتی۔ کبھی کبھار جب استادِ محترم کے گھر کی خواتین موجود نہ ہوتیں تو ہم کسی اور کمرے میں بھی بیٹھ جاتے تھے۔ وہ بلاشبہ مجھے سگے بیٹوں کی طرح عزیز رکھتے تھے اور میرے لیے وہ پدرِ معنوی تو تھے ہی لیکن مجھے ان سے اُسی طرح پیار تھا جیسا پدرِ حقیقی سے کیا جاتا ہے۔ میں نے بھرپور ادبی اور سماجی زندگی گزاری ہے اور زندگی میں ہزاروں لوگوں سے ملا ہوں۔ ان کے گھروں میں بطور شاعر، بطور دوست اور بطور مہمان گیا ہوں۔ اس کے باوجود میں نے اکثر افراد کی زندگی میں رشتوں ناتوں کے حوالے سے یہ توازن کم کم دیکھا ہے کہ گھر کی روایات بھی برقرار رہیں اور دوست داری، مہمان داری یا استادی شاگردی کا رشتہ بھی اپنی جگہ پنپتا رہے۔

شاگردی کے گیارہ سالوں میں استادِ محترم کا تقریباً سارا گھر میں نے دیکھ رکھا ہے۔ ایک دفعہ میں خانپور سے چلے جانے کے بعد ان کے گھر ٹھہرا بھی تھا۔ بیٹھک میں تو کتابیں رکھنے کا رواج عام رہا ہے۔ حفیظ شاہد مرحوم کے گھر میں کچن اور واش رومز کو چھوڑ کر سب کمروں میں کتابیں موجود تھیں۔ ان کتابوں کے لیے باقاعدہ ریک اور الماریاں وغیرہ بنوائی گئی تھیں۔ استادِ محترم کے بیڈ روم میں بھی بستر کی عقبی دیوار میں کتابوں کا شیلف بنا

تھا تاکہ اگر رات کو بھی کسی وقت مطالعے کا من ہو تو بلا تردد اس ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکے۔ ایک دفعہ کوئی کتاب تلاش کرنی تھی تو وہ اسٹور روم میں رکھی ہوئی کتابوں سے ملی تھی۔ میں نے خانپور میں یہ پہلا گھر تھا جس میں اس کثرت سے کتابیں موجود تھیں۔ ایسا نہیں کہ استادِ محترم صرف شاعری پڑھتے تھے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کی شاعری میں وہ تنوع کہاں سے آتا جو ان کی شاعری کے جملہ اوصاف میں سے ایک نمایاں وصف ہے۔ وہاں شاعری کی کتابیں تو خاص طور پہ تھیں۔ اس کے علاوہ مذہب، تصوف، اخلاقیات، تاریخ، سیاست، عمرانیات، فلسفہ، غیر ملکی کتابوں کے تراجم اور ادب کی بیشتر اصناف پہ اچھی خاصی تعداد میں کتابیں موجود تھیں۔ ایک دفعہ میں ان سے ملنے گیا تو وہ ''جاسوسی ڈائجسٹ'' یا شاید ''ڈر ڈائجسٹ'' کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی اور میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا کہ استاد جی آپ جاسوسی ڈائجسٹ بھی پڑھتے ہیں تو انھوں نے کہا تھا کہ ایسی چیزیں بھی کبھی کبھار پڑھ لینی چاہئیں، ذہن میں کوئی نہ کوئی نئی بات آ جاتی ہے۔

میں جو کتابیں استادِ محترم کے گھر سے لاتا ان کا تسلی سے مطالعہ کرتا۔ لغت سے مشکل الفاظ کے معانی دیکھتا۔ اس کے ساتھ روزانہ کی بنیاد پہ مشقِ سخن کرتا۔ میں نے ابتدائی تین چار سالوں میں پانچ شعروں سے پچیس شعروں تک یومیہ کی بنیاد پہ شعر کہے ہیں۔ مقدار اور معیار سے قطعِ نظر میرا مطمحِ نظر اس وقت صرف بات کرنے کا سلیقہ سیکھنا اور اپنے آپ کو تخلیقی عمل میں مصروف رکھنا تھا۔ میری کئی بیاضیں اس دور کی یادگار کے طور پہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان بیاضوں میں موجود مصرعہ طرازی کو دیکھوں تو کسی کسی مقام پہ ناپختگی اور اوٹ پٹانگ سی قافیہ پیمائی دیکھ کر ہنسی آتی ہے تو کہیں کہیں استعجاب ہوتا ہے کہ میں بطور مبتدی اس وقت کیسے کیسے الفاظ شعر میں برجستہ لے آیا یا کوئی شعر بہ پایۂ شعر کہنے میں کامیاب رہا۔ یہ سب استادِ محترم کی توجہ اور ان کی محبت کا نتیجہ تھا جو روز بروز مجھے بہتری کی طرف گامزن کر رہی تھی۔ اِدھر کچھ ایسی مثالیں ادب کے عام قارئین اور مبتدیوں کے لیے بالخصوص دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہیں جن میں باقاعدہ شعری نمونے کے ساتھ حفیظ شاہد (مرحوم) کی دی ہوئی اصلاحوں کا ذکر کیا جائے۔ ان اصلاحات کا تعلق میری شاعری کے ابتدائی دور سے ہے۔ اس سلسلے میں پہلا واقعہ یہ ہے کہ میں نے بحرِ ہزج مثمن مقبوض میں ایک غزل کہی اور استادِ محترم کے پاس اصلاح کے لیے لے گیا۔ اس بحر کے افاعیل یہ ہیں: مَفاعِلُن مَفاعِلُن مَفاعِلُن مَفاعِلُن۔ غزل کا مطلع یہ تھا:

جو مدتوں لگا رہا تھا اپنا گھر بنانے میں　　گری ہیں ساری بجلیاں اُسی کے آشیانے میں

جب استادِ محترم نے مطلع دیکھا تو فرمایا کہ بجلیاں آشیانے پر گرتی ہیں، آشیانے میں نہیں گرتیں۔ لہٰذا مصرعہ بدلنا پڑے گا۔ میں نے اتفاق کیا۔ جس پر انھوں نے یہ تبدیلی کی:

جو مدتوں لگا رہا تھا اپنا گھر بنانے میں　　لگا دی آگ برق نے اُسی کے آشیانے میں

زبان کے برتاوے کے لحاظ سے ظاہر ہے کہ ''(برق کی وجہ سے) آشیانے میں آگ لگنا'' درست ہے۔ جبکہ ''آشیانے میں بجلی گرنا'' درست نہ تھا (یہ غزل مجھے اب زیادہ پسند نہیں رہی اس لیے اس کو ترک کر چکا ہوں۔)

ایسے ہی ایک اور موقع کا ذکر ہے کہ میں نے ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف الآخر میں ایک غزل کہی۔ یہ بحر شاعری کے ابتدائی دنوں سے میری پسندیدہ بحروں میں سے ایک ہے اور میں نے (شعوری اور لاشعوری طور

پہ) اسے جا بجا استعمال کیا ہے۔ اس بحر کے افاعیل یہ ہیں: مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن۔ میں نے جو غزل کہی اُس کا مطلع یہ تھا:

کیا ربط حضور انجمن آرائی سے میرا؟
بھرتا ہی نہیں دل کبھی تنہائی سے میرا

استادِ محترم نے مطلع دیکھا اور فرمایا کہ لفظ ''حضور'' یہاں اضافی لگ رہا ہے۔ الفاظ کا اس طرح کا استعمال حشو زوائد کی ذیل میں آتا ہے۔ میرے دل میں بھی ایک کھٹکا سا اس مصرعے کے حوالے سے ضرور تھا اور اندر ہی اندر کوئی بے اطمینانی سی تھی لیکن بطور مبتدی، مشق کی کمی اور فنی بے بضاعتی کے سبب مصرعے پہ اس سے زیادہ کام نہ کر پایا تھا۔ اس لیے جب استاد نے نشان دہی کی تو فوراً تائیدِ دلی اور تائیدِ زبانی کی۔ یہاں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ حفیظ شاہد (مرحوم) جبراً اصلاح نہیں دیتے تھے۔ وہ پہلے غلطی کی نشان دہی کرتے تھے۔ پھر ضرورت پڑنے پر اساتذہ فن کے کلام سے یا کبھی کبھار کسی مستند لغت سے مثال دے کر اپنی بات کی وضاحت کرتے تھے۔ جب میں ان کی بات سمجھ لیتا اور قائل ہو جاتا تو وہ مجھے نیا مصرعہ کہنے پہ مائل کرتے تھے۔ اگر میں اُس مذکورہ عیب سے پاک مصرعہ کہہ لیتا اور وہ اسے مناسب قرار دیتے تو وہی مصرعہ رکھ لیتا۔ بصورتِ دیگر وہ خود کوئی خاص لفظ، یا مصرعے کا کوئی ٹکڑا یا پورا مصرعہ یا شعر ہی تبدیل کر دیتے۔ اس ساری دماغ سوزی کے بعد وہ بڑی نرمی سے کاغذ میری طرف بڑھاتے اور فرماتے کہ دیکھ لیں اگر آپ کو ٹھیک لگ رہا ہے تو رکھ لیں۔ میں اس وقت کم عمر اور کم فہم تھا۔ شاعری کے اسرار و رموز سے اب بھی بہتیری واقفیت نہیں اور اس وقت تو نہ ہونے جیسی تھی۔ پھر یہ کہ میں ان کا غالباً واحد شاگرد تھا اور اس بات میں شاید کسی کو شک نہ ہو کہ میں حفیظ شاہد (مرحوم) کا سب سے لاڈلا شاگرد تھا جس نے پورے گیارہ سال ان سے فیض حاصل کیا۔ اس لحاظ سے اگر میں کبھی کبھار اُن کے کہے ہوئے مصرعے کے متعلق آدھے منہ سے کہتا کہ استاد جی! یہ مصرعہ۔۔۔۔ (جس کا مطلب یہ ہوتا کہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا) تو وہ کمال شفقت اور توجہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود نوشتہ مصرعہ بدل دیتے تھے۔ خیر بات ہو رہی تھی مذکورہ بالا شعر کی تو اس پہ استادِ محترم نے یہ اصلاح دی تھی۔

کیا ربط کسی انجمن آرائی سے میرا؟
بھرتا ہی نہیں دل کبھی تنہائی سے میرا

اوپری مصرعے میں ''حضور'' کی جگہ ''کسی'' آنے سے مصرعہ زوردار ہو گیا اور روانی بھی بڑھ گئی نیز حشو وزوائد سے برأت بھی حاصل ہوئی۔ میں خوش قسمت ہوں کہ حفیظ شاہد (مرحوم) کی صورت میں مجھے ایسے پیار کرنے والے اور قابل استاد ملے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھ میں اگر آج کوئی خوبی ہے تو وہ ان کی چشمِ عنایت کا صدقہ ہے اور اگر کوئی کمی کوتاہی ہے تو وہ میری اپنی نااہلی اور تساہل کی بدولت ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے استادِ محترم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے!

☆☆☆

نذیر احمد بزمی (خان پور)

اُردو غزل کا فخر... حفیظ شاہد

خان پور ایک قدیم شہر ہے اور سابق ریاست بہاول پور میں ضلعی ہیڈ کوارٹر، جنکشن اور نوابانِ بہاول پور کے پیر و مرشد خواجہ غلام فریدؒ کے مولد مسکن ہونے کی وجہ سے اہمیت کا حامل رہا ہے۔ خان پور علم و ادب کے لحاظ سے مردم خیز دھرتی ہے، یہاں اُردو نظم اور نثر میں بہت سا کام ہوا ہے۔ خواجہ غلام فریدؒ نے ڈیڑھ سو سال پہلے سرائیکی کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی شاعری کی اور ان کا اُردو دیوان بھی شائع ہوا۔ خان پور سے تعلق رکھنے والے محسن خان پوری کو ''ریختی'' کے سبب شہرت نصیب ہوئی، عبدالرحمٰن آزاد ''امیر الکلام'' ٹھہرے، خواجہ محمد یار فریدی، خواجہ غلام قطب الدین فریدی، گلزار نادم صابری تصوف اور نعت کے شاہسوار ٹھہرے، حیدر قریشی، زاہد شمسی، رفیق راشد، آسی خان پوری، صفدر صدیق رضی، سعید شباب، عارف عزیزی، فرحت نواز نے اُردو غزل و نظم کی ترویج میں قابلِ قدر کام کیا اور خان پور کا نام روشن کیا۔

جدید اُردو غزل کے حوالے سے خان پور سے تعلق رکھنے والے شاعر حفیظ شاہد کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ حفیظ شاہد اُردو غزل کا ایک معروف نام ہیں اور اُردو ادب کے بیشتر نقاد ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت علی بریلوی، ڈاکٹر سہیل آغا اور عارف عبدالمتین نے حفیظ شاہد کی کتابوں کے دیباچے اور فلیپ لکھ کر اُن کی شعری عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ خان پور کی اُردو غزل کی تاریخ حفیظ شاہد کے حوالے کے بغیر نامکمل ہے، بلاشبہ وہ خان پور کی ادبی دھرتی کا فخر ہیں۔ حفیظ شاہد کے ۶ شعری مجموعے اور ۱۴۰۰ صفحات پر مشتمل ضخیم کلیات ''ختمِ سفر سے پہلے'' ان کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

حفیظ شاہد ۲۶۔ جون ۱۹۴۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام عبدالحفیظ تھا۔ حفیظ شاہد کے آباؤ اجداد کا تعلق گڑھا ہنداں ضلع جالندھر مشرقی پنجاب ہندوستان سے تھا۔ ان کے والد میاں خیر الدین ملٹری میں بطور مکینیکل فٹر ملازم تھے۔

مظہر عباس اپنے تحقیقی مقالہ میں حفیظ شاہد کے خاندان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حفیظ شاہد کا تعلق گڑھا ہنداں، ضلع جالندھر کے ایک کاشت کار آرائیں خاندان سے ہے۔'' (۱)

حفیظ شاہد نے میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول باغبان پورہ سے پاس کیا، اس کے بعد انہوں نے دیال سنگھ کالج لاہور میں داخلہ لیا مگر معاشی مجبوریوں کے سبب امتحان نہ دیا بلکہ حبیب بینک میں ملازمت کر لی اور جلد ہی چیف کیشئر کے عہدے پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد حفیظ شاہد فلم انڈسٹری کی طرف گئے مگر وہاں سے ناکام ہونے کے بعد لاہور چھوڑنے کا ارادہ کیا اور ۱۹۷۶ء میں مستقل طور پر لاہور سے خان پور آ گئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ خان پور آنے کے بعد وہ مختلف فیکٹریوں میں بطور اکاؤنٹینٹ اور منیجر ملازمت کرتے رہے اور اپنی

وفات ۲۲۔نومبر ۲۰۱۴ء تک انہوں نے کام، کام اور کام کے اُصول کو اپنائے رکھا۔

حفیظ شاہد بچپن سے شاعری کی طرف راغب تھے، ان کے محلے نبی پورہ الراعیاں کے ادبی ماحول کی وجہ سے اُن کے شوق کو مہمیز ملی۔ مظہر عباس، حفیظ شاہد سے لئے گئے انٹرویو کے حوالے سے ان کی شاعری کے آغاز کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''بچپن سے میرا رُجحان شعروادب کی طرف تھا لہٰذا میں دس بارہ سال کی عمر سے شاعری کی طرف مائل ہو چکا تھا اور تک بندی کا آغاز کر چکا تھا۔ ہمارے محلے نبی پورہ الراعیاں کے اِردگرد کا ماحول ادبی تھا...... اکثر یہاں ادبی مجالس اور مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے لہٰذا یہیں میرے ادبی ذوق کی تربیت ہوئی۔'' (۲)

ہائی سکول میں دورانِ تعلیم حفیظ شاہد کو طالب انصاری بدایونی کی صحبت نصیب ہوئی جس سے ان کا ذوق نکھر گیا۔ اس کے بعد حفیظ شاہد ینگ لٹریری سرکل مال روڈ لاہور کے ممبر بن گئے جن کے مشاعروں اور تنقیدی نشستوں نے حفیظ شاہد کو بہت فائدہ پہنچایا۔ کالج کی تعلیم کے دوران ہی حفیظ شاہد کا کلام ''رومان'' لاہور، ''قندیل'' لاہور، ''شمع'' لاہور، ''نیا زمانہ'' لاہور، ''شمع'' دہلی اور ''بیسویں صدی'' نئی دہلی جیسے معروف ادبی جرائد میں چھپنا شروع ہو چکا تھا۔

حفیظ شاہد کے اَب تک چھ شعری مجموعے اور ایک ضخیم کلیات ''ختمِ سفر سے پہلے'' شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''سفر روشنی کا'' جولائی ۱۹۸۳ء میں ادارہ مطبوعاتِ اُدوار خان پور کے پلیٹ فارم سے شائع ہوا۔ جس کے فلیپ پر جیلانی کامران اور ڈاکٹر عبادت بریلوی جیسے نقادانِ فن کے تاثرات موجود ہیں۔ اس مجموعہ کلام میں ۷۱ غزلیات موجود ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں ۱۱ غزلیات حذف کر کے ۴۱ مزید غزلیات شامل کر دی گئیں جس کی وجہ سے ان کی کل تعداد ۱۰۱ ہو گئی۔ حفیظ شاہد کا دوسرا مجموعہ کلام ''چراغِ حرف'' سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور کے پلیٹ فارم سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۹۴ غزلیات شامل ہیں اور اس کا مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی اور فلیپ یزدانی جالندھری نے لکھا ہے۔ ''مہتاب غزل'' حفیظ شاہد کا تیسرا مجموعہ کلام ہے، اسے بھی سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۱۹۹۴ء میں شائع کیا۔ اس میں ۹۰ غزلیں شامل ہیں پیش لفظ آغا سہیل نے اور فلیپ ڈاکٹر خواجہ زکریا نے لکھا ہے۔ حفیظ شاہد کا چوتھا مجموعہ کلام ''یہ دریا پار کرنا ہے'' بھی سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا۔ اس مجموعہ کلام میں غزلیات کی تعداد ۱۰۳ ہے اور شبنم رومانوی نے تقریظ لکھی ہے۔ ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' حفیظ شاہد کا پانچواں شعری مجموعہ ہے جسے الحمد پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۴ء میں شائع کیا اس مجموعہ کلام میں ۷۵ غزلیات اور ۲۲ قطعات شامل ہیں اور اس کا فلیپ ڈاکٹر شفیق احمد نے اور پیش لفظ سہیل اختر نے تحریر کیا ہے۔ حفیظ شاہد کا ان کی زندگی میں آخری مجموعہ کلام ''سورج بدل رہا ہے'' ہے جس میں مئی ۲۰۰۴ء سے ستمبر ۲۰۰۷ء تک کی غزلیات شامل کی گئی ہیں یہ ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۱۳۲ غزلیات شامل ہیں اور یہ ان کا سب سے ضخیم مجموعہ ہے۔

حفیظ شاہد گزشتہ چودہ سال سے اَدبِ اطفال کی نمائندگی کرنے والا بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول مجلّہ

سہ ماہی ''بچے من کے سچے'' کے ۲۰۰۷ء تا ۲۰۱۴ء (۷ سال) چیف ایڈیٹر رہے۔

حفیظ شاہد کا ۱۴۰۰ صفحات پر مشتمل کلیات جس میں اُن کے چھ مجموعۂ کلام (۱) ''سفر روشنی کا' (۲) چراغ حرف' (۳) مہتابِ غزل' (۴) یہ دریا پار کرنا ہے' (۵) فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی اور (۶) سورج بدل رہا ہے'' پر مشتمل ہے' ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا جسے الحمد پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا اور پروفیسر سہیل اختر نے مرتب کیا اور آخر میں حفیظ شاہد کے فن پر سیر حاصل تبصرہ بھی لکھا ہے۔

کلیات ''ختمِ سفر سے پہلے'' کی اشاعت سے لے کر حفیظ شاہد کی حیات تک یعنی ۲۰۱۰ء تا ۲۰۱۴ء کا غیر مطبوعہ کلام کی اوّلین اشاعت حالیہ شمارہ ''شعور و ادراک'' میں شامل خصوصی گوشہ میں مدیر محترم محمد یوسف وحید نے بعنوان ''حاصلِ غزل'' ترتیب دیا ہے جو کہ قارئین اور محققین کے لیے ایک خوب صورت تحفہ ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی حفیظ شاہد کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حفیظ شاہد اپنے تازہ ترین شعری مجموعے میں اپنی منفرد انداز کی شاعری کے نقطۂ عروج پر ہے۔ ان کی غزل گوئی جدید عہد کی تازگی اور ڈرامائی کیفیتوں کے ساتھ کلاسیکی شاعری کے محاسن سے مزین ہے اور اپنے قارئین کے ذہنوں پر خوش گوار تحیر کے احساسات مرتب کرتی ہے۔'' (۳)

جب ہم حفیظ شاہد کے آخری مجموعہ کلام ''سورج بدل رہا ہے'' کی آخری غزل کو دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ حفیظ شاہد کا فن نقطۂ عروج پر ہے، غزل کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

پاگل دل کو بہلانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے
غم کا موسم کٹ جانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے
تم کیوں اتنے آزردہ ہو اپنے بگڑے کاموں پر
اُلجھی ڈور کو سلجھانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے
کیوں تم اپنے آپ سے ہر دم بگڑے بگڑے رہتے ہو
اپنے آپ کو سمجھانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے
آج برے دن ہیں تو کل کو اچھے دن بھی آئیں گے
موسم کے آنے جانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے
آتے ہیں کچھ دیر کو مے کش، پیتے ہیں چل دیتے ہیں
اس دنیا کے میخانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے
یہ دل کے جذبے بھی شاہد پھولوں سے کچھ کم تو نہیں
ان جذبوں کے مرجھانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے

(۴)

پروفیسر سہیل اختر حفیظ شاہد کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جنوبی پنجاب میں حفیظ شاہد بہترین بلکہ اگر اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے تو عظیم ترین غزل گو کے

منصب پر فائز ہیں۔ انہوں نے یہ منصب اپنے چھ غزلیہ مجموعوں کی روشنی اور تابنا کی سے حاصل کیا ہے۔ آج کل جبکہ بعض نوجوان دو چار سال کے شعری سفر کے بعد ہی خود کو مسند شہرت و مقبولیت پر براجمان سمجھنے لگ جاتے ہیں، حفیظ شاہد کی شاندار کامیابیوں کا سفر نصف صدی سے زیادہ سالوں پر محیط ہے۔ اور پھر یہ صرف نظریاتی بات نہیں کہ حفیظ شاہد نے کشتِ غزل کو اپنے خون سے سینچا ہے بلکہ عملی کیفیت اس کی شاہد ہے۔" (۵)

حفیظ شاہد کی شاعری میں ہمیں اُردو غزل کے تمام تر لوازمات ملتے ہیں، فصاحت و بلاغت، تغزل، چستی بندش اور لفظوں کی برمحل نشست و برخاست ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ وہ محبتوں کے امین ہیں اور محبت ان کی فطرت میں داخل ہے اندھیروں سے گھبراتے نہیں بلکہ اندھیروں کو روشنی میں بدلنے کا درس دیتے ہیں۔ نمونہ کلام

قدم قدم ہیں اندھیرے نگاہ میں رکھنا
دیا جلا کے محبت کی راہ میں رکھنا
مجھے ہے یاد یہ انداز اس کی چاہت کا
سجا کے پھول مری خواب گاہ میں رکھنا
یہی تو کام محبت میں ہم نے سیکھا ہے
خزاں سے ربط بہاروں کی چاہ میں رکھنا
جو ہو سکے تو ہمیں ہجر کی تمازت میں
تم اپنے سایۂ زلفِ سیاہ میں رکھنا
نئے نئے ابھی آئے ہیں شہرِ خوباں میں
ہماری ذات کو اپنی پناہ میں رکھنا
قریب اس کے بہت آج کل ہو تم شاہدؔ
کچھ احتیاط مگر رسم و راہ میں رکھنا

(۶)

حفیظ شاہد کی شاعری حالاتِ حاضرہ کی شاعری ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اپنے اردگرد کے حالات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا اور ان کی شاعری سے تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ علاقائی رسوم ورواج ہوں یا ملکی بین الاقوامی حالات سب کچھ ہمیں حفیظ کی شاعری میں ملتا ہے۔ ان کی شاعری حالاتِ حاضرہ کا عکس بھی ہے۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

کس سے پوچھے جا کر کیوں بگڑ گئے بچے
آتشیں کھلونوں سے کھیلنے لگے بچے
کچھ نئے تقاضے ہیں، اس نئے زمانے کے
اب کہاں مچلتے ہیں چاند کے لئے بچے

اس طرف جو گھائل ہیں ، اس طرف وہ قاتل ہیں
یہ بھی ہیں مرے بچے، وہ بھی ہیں مرے بچے
کھوگئے تعصب کے بے کراں اندھیروں میں
شہر کی فضاؤں میں میرے گاؤں کے بچے
دو گھڑی لڑائی ہے پھر وہی صفائی ہے
ہم بڑوں سے اچھے ہیں بے شعور سے بچے
رنگ تھے مسرت کے پھول جیسے چہروں پر
خواب میں نہ جانے کیا دیکھتے رہے بچے
اک قدم بھی پھر آگے میں نہ چل سکا شاہد
جب کڑی مسافت میں یاد آگئے بچے

(۷)

حفیظ شاہد مایوسیوں کا نہیں بلکہ اُمید ورجائیت کا شاعر ہے اور اپنی شاعری میں یہ درس دیتا نظر آتا ہے:

ابھی سر سبز ہے نخلِ تمنا
خزاں کا تذکرہ کیوں کر رہے ہو

(۸)

نچھاور کر کے اس دھرتی پہ کرنیں
پیامِ زندگی دیتا ہے سورج

(۹)

ایام رُتِ بہار دکھائی دیے تو ہیں
شاخوں پہ برگ وبار دکھائی دیے تو ہیں

(۱۰)

پھر سرِ شاخِ تمنا مسکرائے ہیں گلاب
اِک پیامِ زندگی پھر گلشنِ دل کو ملا

(۱۱)

حفیظ شاہد کی شاعری کے بارے میں سید عامر سہیل اپنے مضمون ''زندہ حقیقتوں کا شاعر'' میں لکھتے ہیں:

''حفیظ شاہد کی شاعری اپنے عہد کی آئینہ دار ہے ان کے یہاں شعر اپنی نازک لطافتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ شعر کو فلسفہ یا تصوف کے نکلیں نہیں ہونے دیتے اور نہ ہی بے ربط جدیدیت کے علمبردار ہیں بلکہ اُنہوں نے شعر کو شعر ہی کے انداز میں کہا ہے۔ وہ زندگی کو حقیقت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور شاید شاعری کی بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر انسان

کی ترتیب کرتی ہے اور اس اعتبار سے حفیظ شاہد نے کامیاب غزل کہی ہے۔'' (۱۲)

حفیظ شاہد نے غزل کی ہیئت میں مختلف تجربات کیے ہیں، انہوں نے مختصر اور طویل بحر میں بہت عمدہ غزلیں کہی ہیں، طویل بحر کی ایک غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں جس میں لمبی ردیف ''نہ تیرے بس میں نہ میرے بس میں'' اُن کی قادرالکلامی کو ظاہر کرتی ہے

دلوں میں پھیلے غموں کے سائے نہ تیرے بس میں نہ میرے بس میں
یہ زندگی کے گزرتے لمحے نہ تیرے بس میں نہ میرے بس میں
(۱۳)

الغرض حفیظ شاہد اُردو غزل کا سرمایہ افتخار اور خان پور کی سرزمین کا فخر ہیں۔
اللہ تعالیٰ اُن کے دَرجات بلند فرمائے۔ آمین

حوالہ جات:

۱ مظہر عباس: تحقیقی مقالہ ایم فل اُردو بعنوان: ''حفیظ شاہد۔فن وشخصیت''
اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور، ص:۱

۲ ایضاً

۳ حفیظ شاہد، ''ختم سفر سے پہلے (کلیات)'' لاہور: الحمد پبلی کیشنز، اگست ۲۰۱۰ء، بیک فلیپ

۴ ایضاً ''سورج بدل رہا ہے'' ص:۲۷۹

۵ حفیظ شاہد، ''ختم سفر سے پہلے (کلیات)'' لاہور: الحمد پبلی کیشنز، اگست ۲۰۱۰ء، ص ندارد

۶ حفیظ شاہد، ''ختم سفر سے پہلے (کلیات)'' لاہور: الحمد پبلی کیشنز، اگست ۲۰۱۰ء

۷ حفیظ شاہد، ''مہتابِ غزل'' لاہور: سنگ میل پبلشرز، ۱۹۹۴ء، ص:۸۵

۸ حفیظ شاہد، ''ختم سفر سے پہلے (کلیات)'' لاہور: الحمد پبلی کیشنز، اگست ۲۰۱۰ء
''سفر روشنی کا'' ص:۶۷

۹ ایضاً ص:۲۱۹

۱۰ ایضاً ص:۵۹

۱۱ حفیظ شاہد، ''ختم سفر سے پہلے (کلیات)'' لاہور: الحمد پبلی کیشنز، اگست ۲۰۱۰ء
''چراغ حرف'' ص:۴۴

۱۲ ایضاً ص:۷۹

۱۳ حفیظ شاہد، ''ختم سفر سے پہلے (کلیات)'' لاہور: الحمد پبلی کیشنز، اگست ۲۰۱۰ء، ص:۲۱۳

۱۴ گلدستۂ ادب۔ تحقیق وتدوین: محمد یوسف وحید، الوحید ادبی اکیڈمی خان پور، ۲۰۱۵ء

۱۵ سہ ماہی ''شعور وادراک'' خان پور۔ مدیر: محمد یوسف وحید، شمارہ نمبر ا۔ (جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء)

☆☆☆

اظہر ادیب (صادق آباد)

یادوں کی کہکشاں اور حفیظ شاہد

محمد یوسف وحید نے فون پر بتایا کہ مجلّہ ''شعور وادراک'' کے آئندہ شمارہ میں خصوصی گوشہ ''حفیظ شاہد'' شائع کر رہے ہیں۔ یہ جان کر جہاں بے حد خوشی ہوئی وہاں حفیظ شاہد اور اپنے اکٹھے گزرے وقت کی بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں۔

میں خان پور سے گیارہ بارہ کلومیٹر دُور ایک ادارے میں کام کرتا تھا۔ حیدر قریشی بھی اسی ادارے میں ملازم تھے۔ لیکن میری گوشہ نشینی کی عادت کے سبب ہماری ملاقات بہت دیر بعد ہوتی۔ یہ ہمارے درمیان دوستی اور محبت کا ایسا رشتہ استوار ہوا جو آج تک قائم ہے (اگر چہ برسوں تک رابطہ نہیں ہوتا)۔ اُس وقت خان پور میں بہت اچھے شاعروں کی کہکشاں جگمگا رہی تھی۔ جس میں آسی خان پوری، نزدوش ترابی، صفدر صدیق رضی اور حفیظ شاہد کے علاوہ اور بھی بہت سے احباب شامل تھے۔ حیدر قریشی خان پور رہتے تھے اور وہ بھی اس کہکشاں کا حصہ تھے۔ اُن کے ساتھ خان پور آنا جانا ہوا تو ان تمام احباب سے بھی ایک تعلق خاطر قائم ہو گیا۔ میں خان پور کی ادبی تقاریب میں شامل ہونے لگا اور خان پور کے یہ احباب ادبی گروہ بندی کا شکار ہو گئے۔ ان کے آپس کے تعلقات پہلے جیسے نہ رہے۔ میں اس گروہ بندی کا حصہ نہیں بنا اور دونوں طرف کے احباب سے میرے تعلقات میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ بعد ازاں حیدر قریشی اس ادارے کی کالونی میں آ گئے۔ میں پہلے ہی وہاں رہائش پذیر تھا۔ حیدر قریشی سے میرا تعلق مزید گہرا ہو گیا۔ یوں تو خان پور کے تمام اُحباب سے بھی تعلق قائم رہا لیکن حفیظ شاہد اور آسی خان پوری سے قربتیں مزید بڑھ گئیں۔ دونوں احباب سادہ مزاج، محبت کرنے والے نہایت خوب صورت انسان تھے۔ دونوں کی طبیعت میں بچوں جیسی معصومیت تھی۔

حفیظ شاہد سے تعلق اتنا بڑھا کہ میں اکثر اُن کے ہاں چلا جاتا اور ہم رات گئے تک جاگتے رہتے۔ حفیظ شاہد کا مطالعہ بہت زیادہ تھا۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جس دن وہ غزل نہ کہتے ہوں۔ غزل کہنے کے بعد یہ تو ناممکن تھا کہ وہ سب سے پہلے مجھے غزل نہ سنائیں۔ اگر میں اُن کے ہاں میں چلا گیا تو ٹھیک ورنہ وہ میرے پاس میرے دفتر تشریف لے آتے۔ اس دوران اُن کے شعری مجموعے چھپتے رہے۔ وہ اکثر مجھے اصرار کرتے کہ آپ بھی اپنا مجموعہ لے آئیں۔ لیکن میں اس سلسلے میں بہت لاپرواہ اور کاہل تھا۔ جب اُن کے مسلسل اصرار کے باوجود مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا تو اُنہوں نے ایک اور طرح سے محبت بھری ضد شروع کر دی۔ اب اُن کا اصرار یہ ہوتا کہ آپ مجھے مسودہ دے دیں۔ باقی میں جانوں اور میرا کام۔ آخر مجھے اُن کی پُر خلوص ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے اور میں نے اپنے شعری مجموعے ''منڈیروں پر دیئے رکھنا'' کا مسودہ اُن کے حوالے کر دیا۔ کمپوزنگ کا دَور نہیں تھا۔ کتابت کروائی جاتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے میرے مجموعے کی کتابت بھی اُسی کاتب سے کروائی جس

سے وہ اپنی کتابوں کی کتابت کرواتے تھے (یہ کاتب لاہور میں رہتے تھے)۔ اس سلسلے میں مجھے معلوم نہیں کہ اُنہیں کتنی بار لاہور جانا پڑا ہوگا۔ مجھے تو کتابت مکمل ہونے کے بعد بعض اَغلاط دُرست کروانے اور کتاب کے لیے تصویر بنوانے کے لیے بس ایک بار لاہور جانا پڑا۔ ناشر کے انتخاب سے لے کر کتاب کی اُشاعت کے آخری مرحلے تک اور اُس پر اُٹھنے والے اخراجات بارے میں اُنہوں نے کبھی بھول کر بھی مجھ سے تذکرہ نہیں کیا۔ مجھے تو اُنہوں نے شائع شدہ کتاب لا کر دے دی۔ اُس دور میں اتنی محبت کرنے والا اور اچھا مخلص دوست مل جانا میری خوش بختی تھی۔ تب مجھ میں کتاب چھپوانے کی استطاعت بھی نہیں تھی۔ اگر حفیظ شاہد یہ سب کچھ نہ کرتے تو کم از کم اُس وقت تو میرا شعری مجموعہ نہیں چھپ سکتا تھا۔

مجھے اُن کی شاعری پر لکھنے سے زیادہ اچھا لگا کہ میں اُن کی یادوں میں دوستوں کو شریک کروں۔ کیوں کہ اُن کے فن پر تو بہت سے فاضل دوست لکھ چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ حفیظ شاہد کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

☆☆☆

تذکرۂ یاراں

☆.... رشید ناصر (اُردو کے عمدہ شاعر)۔ ☆.... گُل خان گُل (اُردو اور سرائیکی شاعر) ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر وغیرہ مرمت کرتے تھے اور ان کی دکان ناز سینما کے سامنے مارکیٹ میں تھی۔ بدقسمتی سے گل خان کو ان کے سُسر نے قتل کر دیا تھا۔ ☆.... امیر بخش حاذق (سرائیکی شاعر)۔ ☆.... عبدالرحیم خوش دل (چند سرائیکی ڈوہڑے کہے)۔ ☆.... علی بخش سیف (شاعر)، ☆.... رفیق عامل (پنجابی زبان کے شاعر) عبدالکریم دلشاد کے شاگرد تھے، ان کی لالو بازار میں جوتوں کی دکان تھی۔ ☆.... سردار ملک (نامور گلوکار انو ملک کے بھائی) پنجابی شاعر اور گلوکاری بھی کرتے رہے۔

(محمد یوسف وحید اور مجاہد جتوئی کے درمیان ایک ملاقات کے دوران خان پور میں ۸۰۔۱۹۷۰ء کی دہائی میں ادبی دنیا کے احباب کا تذکرہ)

☆

سعید شباب (خان پور)

سادہ مزاج دوست.... حفیظ شاہد

حفیظ شاہد کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ ان کی شخصیت کے کس پہلو کو موضوع بناؤں اور کس سے کنی کترا کر گزر جاؤں کیونکہ حفیظ شاہد ایسی ہمہ جہت شخصیت کے کسی پہلو کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

حفیظ شاہد کے تین بڑے روپ ہیں۔ شاعر، دوست اور انسان۔ لیکن یہ تینوں روپ مثلث کی صورت نہیں کہ انہیں الگ الگ دیکھا جا سکے بلکہ دائرے کی صورت ایک اکائی میں منسلک ہیں ان کی شاعرانہ حیثیت کا تعین کرنا ناقدین کرام کا کام ہے۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ ان کی شاعری صرف مجھے ہی پسند نہیں بلکہ وزیر آغا، جیلانی کامران، عارف عبدالمتین، عبادت بریلوی، مظہر امام، حیدر قریشی، حسن اکبر کمال جیسے متعدد اُدبا بھی بحیثیت شاعر اُن کی توصیف کرتے ہیں تو یقیناً اُن کی شاعری ایک ادبی مرتبہ رکھتی ہے۔ ان کی دوستی بڑی تہہ دار ہوتی ہے، مخالف سے دوستی نبھانے کا ہنر بھی اُنہیں آتا ہے جن دنوں ایک شاطر مہربان نے خانپور کے دوستوں میں باہم رنجشیں پیدا کر دی تھیں۔ ان دنوں حفیظ شاہد کی پوزیشن بڑی عجیب تھی۔ ان کے دوست دونوں طرف بٹ گئے تھے اور انہوں نے خود کو ایک طرف منسلک رکھنے کے باوجود دوسری طرف سے رابطہ منقطع نہیں کیا۔ دراصل وہ شروع سے ہی جان گئے تھے کہ اصل شرارت کیا ہے لیکن دوستوں کو قائل نہ کر سکتے تھے۔ پھر انہوں نے...... جی ہاں یہ حقیقتاً صرف انہی کا کمال ہے۔ انہوں نے حالات و واقعات کے آئینے دوستوں کے روبرو رکھ دیئے۔ سب نے ایک دوسرے کو پہچانا، اپنے آپ کو پہچانا، اسی اصل شاطر کی حقیقت بلکہ اصلیت کو جانا اور پھر سارے اچھے دوست باہم شیر و شکر ہو گئے۔ خان پور کے پڑھے لکھے اور باقاعدہ اُدباء کو دوبارہ ایک پلیٹ فارم پر جمع کر لینا حفیظ شاہد کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ میں کتنے ہی ایسے کم ظرفوں کو جانتا ہوں جن پر حفیظ شاہد کے ذاتی احسانات ہیں جب تک وہ لوگ ضرورت مند رہے ضرورتیں پوری کراتے رہے جب ضرورتیں ختم ہو گئیں تو پلٹ کر دُعا سلام کرنے کے روادار نہ رہے...... لیکن وقت تو بڑا ظالم ہوتا ہے پھر ضرورتیں پیدا کر دیتا ہے۔ وہ لوگ پھر شرمندہ شرمندہ حفیظ شاہد کے پاس آئے اور حفیظ شاہد نے کبھی اشارتاً بھی انہیں ان کے سابقہ غلط کردار کی طرف توجہ نہیں دلائی۔ حفیظ شاہد نے زندگی میں بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ اچھے دن بھی دیکھے، پھر برے دن بھی آئے لیکن حفیظ شاہد ہر دَور میں خدا کے شکر گزار رہے۔ خدا کے حضور شکر گزاری اور اپنے سے کم تر لوگوں کے سامنے بھی انکساری ان کی شخصیت کا بنیادی وصف ہے اور شاید ان کی تمام تر ترقی میں ان کی اسی خصوصیت کا دخل ہے۔ حفیظ شاہد دوستوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ دشمنوں کا بھی بھلا چاہتے ہیں۔ البتہ منافقوں اور خاص طور پر منافق دوستوں سے بے حد الرجک ہوتے ہیں ایک سیدھے سادھے اور صاف گو شخص کے لیے منافقت اور سیاست کے رویے سے ہمیشہ تکلیف دہ ہی ہوتے ہیں۔

حفیظ شاہد بحیثیت گیت نگار اور پروڈیوسر پاکستان فلم انڈسٹری سے بھی منسلک رہے ہیں۔انہوں نے بیشتر پنجابی فلموں کے گیت لکھے ہیں اور فلمی شاعری میں بھی اپنے ادبی معیار کو قائم رکھا۔رجب علی کا گایا ہوا مشہور گیت

اپنے ای پیاریاں دا پیار لٹ لیندے نیں.. کدی کدی یاراں نوں یار لٹ لیندے نیں

اس گیت کے مکھڑے سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فلمی شاعری میں بھی اپنے مخصوص شعری محاسن اور سادگی کو ہمیشہ مدنظر رکھتے رہے ہیں۔ان کے گیت نور جہاں، مالا، نسیم بیگم، مسعود رانا، رجب علی اور ساجدہ فروز ایسے متعدد نامور گلوکار گا چکے ہیں۔جب فلمی شاعری میں فحاشی کا عنصر در آیا انہوں نے فلمی شاعری کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کر دیا۔حفیظ شاہد اپنی شاعری کو گھریلو فرائض پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔گھریلو ذمہ داریوں کو ایک اچھے شوہر اور ایک اچھے باپ کی حیثیت سے نبھاتے ہیں۔اگر حفیظ شاہد فل ٹائم شاعر ہوتے تو اب تک ان کے دس پندرہ شعری مجموعے چھپ چکے ہوتے۔کیونکہ ان کے اندر ایک بہت بڑا پرگو شاعر چھپا بیٹھا ہے۔لیکن حفیظ شاہد کی معاشرتی ذمہ داریاں ہمیشہ اس اندر کے پرگو شاعر کو پوری طرح باہر آنے سے روکتی ہی رہتی ہیں۔

حفیظ شاہد بیک وقت غزل کی کلاسیکل روایت پر بھی گہری نظر رکھتے تھے اور جدید غزل کے مزاج سے بھی آشنا تھے۔ان کے ہاں جدید غزل بے معنی اشعار اور لخت لخت مصرعوں کی صورت میں نہیں بلکہ جدید عہد کے مسائل سے لفظ و معنی کا ایک باوقار ربط قائم کرنے کی صورت میں اُبھرتی تھی۔خانپور میں حفیظ شاہد جیسے خوبصورت شاعر اور اچھے دوست کا وجود خان پور کے تمام اچھے ادیبوں کو ایک لڑی میں پروئے رکھنے کی علامت تھے۔حفیظ شاہد مسلسل سفر میں رہتے تھے یہ سفر معاشی ہو یا تخلیقی' ہر جہت میں ہمیشہ جاوداں پیہم رواں کی تصویر بنے رہتے تھے چنانچہ ملازمت کے سلسلے میں روزانہ بس کا سفر ہو یا آسی خانپوری کی چار پائی......غزلیں بلا روک ٹوک ان پر اُترتی رہتی ہیں۔حفیظ شاہد کی غزل کہنے کی رفتار اور اسی رفتار کا تسلسل بے حد حیرت انگیز ہے۔حفیظ شاہد کو فی البدیہہ اشعار کہنے میں جو ملکہ حاصل ہے وہ شاید اس عہد میں بہت کم شاعروں کو نصیب ہوگا۔حفیظ شاہد نے سیاسی اور طنز و مزاح کے رنگ میں معاشرتی شاعری بھی کی ہے۔قطعات بھی لکھے ہیں اور ان وادیوں میں بھی حفیظ شاہد نے اپنے فن کے شاندار جوہر دکھائے ہیں،ان کی سیاسی شاعری ہفت روزہ زندگی اور متعدد رسائل میں چھپ چکی ہے۔تاہم حفیظ شاہد کی اصل پہچان ان کی غزل ہے،جو ان کی شاعرانہ دوستانہ اور انسانی تینوں حیثیتوں کی پہچان کراتی ہے۔

نہ آرزو نہ کوئی احتیاج رکھتا ہوں
غریب شہر ہوں سادہ مزاج رکھتا ہوں
میں دشمنوں سے بھی ملتا ہوں دوستوں کی طرح
بڑے عجیب سے رسم و رواج رکھتا ہوں
نہ جانے دوست میرے کیوں ہوئے میرے دشمن
امیر ہوں نہ کوئی تخت و تاج رکھتا ہوں

(بشکریہ: سات ادیب (ایک گوشہ حفیظ شاہد کیلئے) مجلسِ مشاورت: حیدر قریشی، فرحت نواز، مرتب: سعید شباب، جدید ادب پبلی کیشنز خان پور، اشاعت: ۱۹۸۶ء۔ص:۱۸۸)

مرزا حبیب الرحمٰن (خان پور)

اُردو غزل کا معتبر حوالہ.... حفیظ شاہد

منفرد لب و لہجے اور کلاسیکی روایت کے علمبردار اُردو غزل کے نامور استاد شاعر حفیظ شاہد ۲۶/جون ۱۹۴۲ء کو چوہدری خیر الدین کے ہاں لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام عبدالحفیظ تھا۔ آپ کے خاندان کا تعلق ضلع جالندھر بھارت سے ہے جبکہ آپ کے والد انجینئرنگ سروس (MES) لاہور میں بطور مکینیکل فٹر ملازم تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ پرائمری سکول شالیمار لاہور سے حاصل کی اور ۱۹۵۸ء میں گورنمنٹ ہائی سکول باغبان پورہ لاہور سے میٹرک کی ڈگری حاصل کی اور گھر کی ذمہ داریوں کے سبب ۱۹۶۲ء میں حبیب بینک لاہور میں ملازمت اختیار کر لی۔

شعر و ادب کا شوق آپ کو قدرت نے بچپن میں ہی ودیعت کیا تھا چنانچہ دورانِ تعلیم ہی شعر کہنے لگے اور آپ کے فن اور شاعری کو پختگی تب ملی جب آپ معروف شاعر جناب طالب انصاری بدایونی سے اصلاح لینے لگے اور لاہور میں بینک کی ملازمت کے بعد فنِ شاعری سیکھنے اور اپنے شعری تسکین کیلئے معروف و مقبول شاعر جناب طفیل ہوشیار پوری کے ادبی ماہنامے ''محفل'' کے دفتر چلے جاتے وہاں خوش قسمتی سے ان کی شامیں طفیل ہوشیار پوری کے علاوہ احسان دانش، شرقی بن شائق، رشید کامل، ایف ڈی گوہر، یزدانی جالندھری اور ارمان عثمانی جیسے اساتذہ فن کی صحبت میں گزرتیں، محفلیں، جمتی، ادبی لطیفوں کی رنگینیاں بکھرتی، ایک دوسرے کو تازہ کلام سنایا جاتا۔ بیشتر اس وقت کے استاد، بزرگ، کہنہ مشق اور پرگو شاعر شامل تھے اور فن میں ایک سے بڑھ کر ایک قد آور شخصیت کا مالک تھا۔ یوں ان کی قربت میں حفیظ شاہد کو فنِ سخن میں مشق و ریاضت کے ایسے مواقع ہاتھ آئے جو عام طور پر ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتے۔

لاہور میں قیام کے دوران حفیظ شاہد کا کلام اس وقت کے معروف و مقبول ادبی جرائد ''محفل، قندیل، اقدام، بیسویں صدی نئی دہلی، شمع نئی دہلی، لیل و نہار'' اور ہفت روزہ ''زندگی'' میں چھپنے لگا۔

طفیل ہوشیار پوری ایک مترنم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ باکمال فلمی گیت نگار بھی تھے چنانچہ طفیل ہوشیار پوری کی صحبت میں رہ کر حفیظ شاہد نے بھی فلمی گیت نگاری کا فن اور اس کے اسرار و رموز سیکھے اور اپنے قیام لاہور کے دوران دو سال فلم انڈسٹری میں بطور گیت نگار و پنجابی فلموں کے گیت لکھے۔ ایک فلم تھی ''بلبل پنجرے دی'' اس فلم کے میوزک ڈائریکٹر رحمان ورما تھے اور اس کے چار گیت ریکارڈ ہوئے جو میڈم نور جہاں، مالا بیگم، مسعود رانا، نسیم بیگم اور تصور خانم نے گائے لیکن یہ فلم تکمیل کے مراحل طے نہ کر سکی۔

دوسری پنجابی فلم تھی ''چھڈ برے دی یاری'' اس فلم میں حفیظ شاہد کے دو گیت شامل تھے۔ اس فلم کے موسیقار مشتاق علی تھے اور ہدایت کار رائے ریاض تھے۔ یہ فلم کافی مقبول ہوئی۔ حفیظ شاہد کا لکھا ہوا تھیم سانگ جو رجب علی

کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا بہت مقبول ہوا جس کے بول تھے ۔

اپنے ای پیاریاں دا پیار لٹ لیندے نیں
کدی کدی یاراں نوں وی یار لٹ لیندے نیں

بطور فلمی گیت نگار اور بھی گیت لکھتے مگر آپ کے تلاشِ معاش کیلئے ۱۹۷۶ء میں مستقل خان پور آنے سے یہ سلسلہ رُک گیا۔

حفیظ شاہد نے ابتداء میں حبیب بینک لاہور میں ملازمت کی اور ۱۹۷۶ء میں مستقل خان پور تشریف لے آئے جہاں پر آپ کے خاندان کے بعض افراد پہلے ہی رہائش پذیر تھے چنانچہ آپ نے خان پور میں قیام کے دوران ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۶ء دس سال تک کوکا کولا فیکٹری رحیم یار خان، ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۸ء تک اسلم کاٹن فیکٹری اور ۱۹۹۸ء سے ۲۰۱۲ء تک بطور منیجر عائشہ کاٹن فیکٹری میں کام کیا۔

حفیظ شاہد نے اپنے خیالات کے اظہار کیلئے غزل جیسی صنف کا انتخاب کیا جو ہر دَور میں مقبول، تر و تازہ اور دلکش رہی، حفیظ شاہد کے چھ مجموعے ''سفر روشنی کا'' ۱۹۸۳ء، چراغ حرف ۱۹۸۹ء، مہتاب غزل ۱۹۹۴ء، یہ دریا پار کرنا ہے ۱۹۹۹ء میں طبع ہو کر دنیائے ادب سے تحسین حاصل کر چکے جبکہ آپ نے اپنی پہلی کتاب ''سفر روشنی کا'' جو ۱۹۸۳ء میں طبع ہوئی دوبارہ ترامیم و اضافہ کے ساتھ ۱۹۹۹ء میں دوبارہ طبع کروائی۔ پانچویں کتاب ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' ۲۰۰۴ء میں اور چھٹی کتاب ''سورج بدل رہا ہے'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی۔

جبکہ تقریباً چھ سو سے زائد غزلیات پر اور آپ کے چھ شعری مجموعوں پر مشتمل کلیات ''ختم سفر سے پہلے'' پروفیسر سہیل اختر نے ۲۰۱۰ء میں مرتب کیا۔ آپ نے غزل کے ساتھ ساتھ اخبارات میں قطعات اور قطعہ تاریخ بھی لکھے۔ آپ ۲۰۰۷ء سے اپنی وفات تک الوحید ادبی اکیڈمی کے سرپرست اور ''بچے من کے سچے'' خان پور کے چیف ایڈیٹر رہے اور ادبی تنظیم ''معارف'' کے چیئرمین رہے۔

حفیظ شاہد کی ادبی خدمات کے پیشِ نظر ۲۰۰۵ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور لیکچرار مظہر عباس نے ایم فل کا مقالہ حفیظ شاہد.. فن و شخصیت (تحقیقی و تنقیدی مقالہ) لکھ کر ایم فل کی سند حاصل کی۔

حفیظ شاہد کے ۱۹۷۶ء میں خان پور آمد سے قبل خان پور میں محسن خان پوری، امیر الکلام ماسٹر عبدالرحمن آزاد، عارف عزیزی، آسی خان پوری، نزدوش ترابی، حیدر قریشی ادبی دنیا میں اپنا نمایاں مقام رکھتے تھے مگر ۱۹۷۶ء سے ۲۰۱۴ء تک آپ آسمانِ ادب پر آفتاب کی مانند جگمگاتے رہے اور آپ کی روشنی سے مثلِ ماہتاب یاور عظیم، اظہر عروج، علی عباس ساجد، محمد یوسف وحید، ساجد درانی اور ڈاکٹر میاں ابراہیم دین پوری نے ضیاء پائی۔ جبکہ معاصر شعراء گوہر ملسیانی مرحوم، رفیق راشد مرحوم، صفدر صدیق رضی، سعید شباب، حیدر قریشی، نزدوش ترابی مرحوم، ارشد خالد، آسی خان پوری مرحوم، گلزار نادم صابری مرحوم، پروفیسر سہیل اختر مرحوم، قیس فریدی مرحوم، پروفیسر ڈاکٹر شفیق، سید ضیاء الدین نعیم، مجاہد جتوئی اور باقی احمد پوری اور خاص کر نامور شاعر اظہر ادیب سے محبت اور خلوص کا تعلق رہا۔

راقم الحروف کی حفیظ شاہد سے ملاقات غالباً ۲۰۰۵ء میں ہوئی۔ اس کے بعد آپ کی محبت، خلوص، پُرکشش شخصیت، مزاج کی سادگی، شائستہ ادبی اندازِ گفتگو نے تو مجھے دوسرے لوگوں کی طرح آپ کا گرویدہ بنا دیا پھر میں

اور یاور اکثر آپ کی صحبت کا لطف اُٹھانے کبھی آپ کے گھر اور کبھی عائشہ فیکٹری چلے جاتے اور یاور کے اسلام آباد جانے کے بعد پھر آپ کے ایک اور شاگرد اظہر عروج کی رفاقت میں آپ سے گاہے بگاہے شرف ملاقات ہوتی رہتی اگر کبھی ملاقات میں وقفہ آجاتا تو آپ اکثر خود فون کر کے بلوا لیتے کہ آپ دوست آجاؤ اور پھر گھنٹوں ادب پر بات چیت ہوتی اور پھر جب سید زاہد نقوی جو کہ بہترین خطاط، مصور، پینٹرز کے ساتھ ساتھ فنِ موسیقی میں بھی نمایاں مقام رکھتے تھے' اُن کی میوزک اکیڈمی کے دفتر میں جب میں اظہر عروج، یاور عظیم، حفیظ شاہد جاتے تو معروف ادیب اور گلوکار سعید شباب اور زاہد نقوی جب اپنی خوبصورت آواز میں استاد حفیظ شاہد صاحب کا کلام گاتے تو رات گزرنے کا پتہ ہی نہ چلتا۔ استاد حفیظ شاہد سگریٹ پر سگریٹ پیتے جاتے اور فن پر داد بھی دیتے جاتے۔

جب ۲۰۱۰ء میں استاد حفیظ شاہد کے کلیات ''ختمِ سفر سے پہلے'' طبع ہوئی تو خان پور کی ادبی وثقافتی تنظیم بزمِ ادراک کے اراکین پروفیسر منیر ملک، محمد یوسف وحید، اظہر عروج، نذیر بزمی، ایوب دھریجہ مرحوم نے خان پور کے جناح ہال میں ایک بہت بڑی تقریب رونمائی اور یادگار مشاعرہ منعقد کروایا جس میں مقامی تمام بڑے شعراء اور ادیبوں نے خصوصاً ڈاکٹر اجمل بھٹی، محمد عامر ملک اور پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد نے حفیظ شاہد کے فن و شخصیت پر تحقیقی مقالے پیش کیے اور ان کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

ایک موقع پر اظہر عروج سے پوچھا کہ آپ کہاں ہو؟ تو اس نے کہا کہ وہ اور استاد حفیظ شاہد' پریس مارکیٹ میں ہیں، اس دوران معلوم ہوا حفیظ شاہد کی تقریباً دو ماہ میں ہونیوالی چالیس غزلیں کمپوز ہو چکی ہیں، حفیظ شاہد ان کی پروف ریڈنگ کر رہے تھے۔ حفیظ شاہد نے کہا مجھے آپ کی ادبی کاوشوں کے بارے میں اظہر عروج نے بتایا ہے پھر خلاف توقع پنجابی میں کہنے لگے کہ ''مرزا صاحب کدی اساڈے اُتے وی لکھو گے'' تو میں نے عرض کیا استاد جی کیوں نہیں، آپ تو اُردو ادب اور ہمارے شہر کا سرمایہ اور اثاثہ ہیں۔

۲۲ نومبر ۲۰۱۴ء بروز ہفتہ رات سوا گیارہ بجے مختصر علالت کے بعد شیخ زید ہسپتال رحیم یار خان میں اُردو کے عظیم شاعر اور کلیات ''ختمِ سفر سے پہلے'' کے خالق حفیظ شاہد ۷۲ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔

آپ کی نماز جنازہ جامعہ مخزن العلوم میں ادا کی گئی جس میں سینکڑوں افراد نے شرکت کی ۲۳ نومبر ۲۰۱۴ء بروز اتوار کو تین بجے دن جامعہ مخزن العلوم خان پور سے ملحقہ قبرستان میں امیر الکلام ماسٹر عبدالرحمٰن آزاد، گلزار نادم صابری، سید مصور نقوی، سید محمود حسن شاہ جیسے صاحبانِ علم کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ آپ نے پسماندگان میں ہزاروں اہلیانِ ادب کے علاوہ دو فرزند نجم شاہد، سلمان شاہد، چار بیٹیاں اور بیوہ سوگوار چھوڑ گئے۔ آپ کی وفات پر نامور شاعر تنویر پھول مقیم نیویارک 2014 ہجری اور عیسوی کے حوالے سے قطعہ تاریخ وفات لکھا۔

دنیا سے چل بسے ہیں ختمِ سفر کے خالق
اے پھول ! وہ تھے گویا علم و ادب کا قلزم
اصلاح کر رہے تھے وہ جادہ سخن کی
شاعر حفیظ شاہد ، صلحِ ادب کہو تم

(تاریخ عیسوی وتاجدار ملک ادب حفیظ شاہد)

پھول! رخصت اِک سخن ور ہو گیا
سامنے جس کے سدا تھی فن کی رہ
اس کا یہ سرمایۂ فکرِ سخن
''مایۂ ختم'' سفر تاریخ کہہ
(ختم سفر، زاویہ طوبیٰ)

☆☆☆

حفیظ شاہد کا شعری سفر

حفیظ شاہد کی اُردو غزل سے پائے دار اور غیر متزلزل وابستگی رہی، انہوں نے غزل میں سادگی اور سلاست کو اپنا شعار بنایا، وہ شعر کے ابلاغ پہ خصوصی توجہ دیتے تھے، ان کے کلام میں لفظی یا معنوی الجھاؤ نہ ہونے برابر ہے، صاف ستھری زبان اور عام فہم الفاظ کے استعمال سے اپنی بات کہتے تھے، ان کی محبت میں شائستگی اور تہذیب ہے، وہ اپنے کلام میں گردوپیش کی زندگی کی عکاسی کرتے تھے، ان کی غزل عصری آگہی کا آئینہ ہے۔ انہوں نے نظمیں بھی کہیں مگر انہیں مجموعوں کا حصہ نہیں بنایا، ان کی پانچویں کتاب ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' میں بعض مشاہیر اور ان کے احباب کی وفات، کتابوں کی اشاعت اور گھر کی تعمیر وغیرہ سے متعلق بیس کے قریب قطعات تاریخ شامل ہیں، تاریخ گوئی کے نایاب فن کے حوالے سے خانپور شہر میں ان کے بعد کوئی نظر نہیں آتا۔

☆

شاہد اقبال جتوئی (خان پور)

اُستاد الشعراء...حفیظ شاہد

یوں تو خان پور میں ملکی سطح پر سیاست، صحافت، کھیل، زراعت، فنونِ لطیفہ غرض تمام شعبہ ہائے زندگی میں بڑی بڑی نامور شخصیات نے جنم لیا ہے مگر اُردو ادب کے حوالے سے خان پور کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ احمد ندیم قاسمی کے اُستاد، اُستادالشعراء عبدالرحمٰن آزؔاد نے ادب کی دنیا میں کئی چراغ روشن کیے اور اب ابدی نیند خان پور میں ہی سو رہے ہیں۔ پہلے منظوم ''شاہنامہ حسینؑ'' کے خالق گلزار حسین نادم صابری کا تعلق بھی خان پور سے ہے۔ یوں خان پور ادب کی آبیاری کے لیے نرسری کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی گلدستہ کا ایک پھول حفیظ شاہد ہے۔ جس کے ادب میں تخلیقی کام کو ملک کے تقریباً تمام مؤقر جرائد اور اخبارات نے اپنا اپنا تبصروں میں سراہا ہے۔ انہیں فیض احمد فیض، قتیل شفائی، طفیل ہوشیار پوری اور یزدانی جالندھری کے ساتھ مشاعرے پڑھنے کا اعزاز حاصل ہے ۔حفیظ شاہد کے مجموعہ کلام کے مقدمے، دیباچے اور فلیپ رئیس امروہی، ڈاکٹر جمیل جالبی، مظہر امام، شبنم رومانی، شفیق الرحمٰن، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، آغا سہیل، اظہر جاوید، پروفیسر سہیل اختر، ڈاکٹر شفیق احمد اور آسی خان پوری نے لکھے ہیں جب کہ محسن نقوی نے اپنے تاثرات ''سفرِ روشنی کا'' میں کچھ یوں تحریر کیے ہیں۔

> ''خان پور ایسے بے آب و گیاہ ادبی جزیرہ سے اِس قسم کے اشعار کا طلوع سنگلاخ زمین کو ''زم زم'' کی بشارت ہے۔ حفیظ شاہد عصری تقاضوں سے آگاہ ہی نہیں ان کا مرتب بھی ہے۔ اِس مجموعہ کی غزلیں فکر کی سبیل ہیں، وجدان و آگہی کے نطقِ رواں کی مفسّر اور جذبات و محسوسات کا آئینہ ہیں''۔

حفیظ شاہد نے جہاں غزل کو جدت کا رنگ دیا۔ وہاں استعاروں کا خوب استعمال کر کے اُردو ادب میں خود کو جدید غزل گو شاعروں کی صفِ اوّل میں لا کھڑا کیا۔ حفیظ شاہد کے کلام میں مایوسی اور نا اُمیدی کی کوئی بات نہیں۔ حفیظ شاہد ہمیشہ جہدِ مسلسل کا درس دیتے ہیں اور اسی بات پر حفیظ شاہد کا پختہ ایمان ہے۔ اس کی زندہ مثال خود اُن کی عملی زندگی ہے۔ روشنی جو کہ اُمید اور زندگی کی علامت ہے اُس کی بشارت دیتے ہیں۔ حفیظ شاہد حساس دل رکھنے والے انسان تھے۔ جنہوں نے ہمیشہ نئے احساس و شعور کی آگاہی دی۔ چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔ جس میں ان کے بلند تخیل کی جھلک نظر آتے ہے۔

کس کی بربادی کا غم ہے کس کے لٹ جانے کا سوگ
بال کھولے رو رہی ہے کیوں کھنڈر کی روشنی
دیتی ہے مجھ کو اذنِ سفر روشنی یہاں
سڑکوں پے جا بجا یہ اشارے عجیب ہیں

شہرِ خیال میں ہے ترا پرتوِ جمال
آنکھوں کی روشنی ہے تیری اک نظر کی یاد

عجیب ہے یہ تلاش میری، ہے میرے کندھوں پہ لاش میری
میں نفرتوں کا لباس پہنے، محبتوں کی تلاش میں ہوں

حفیظ شاہد 15 جون 1942ء کو میاں خیر الدین جو کہ اس وقت ملٹری انجینئرنگ سروس میں ملازم تھے، کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابھی یہ تین سال کے تھے کہ شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے۔ آپ آٹھ بھائیوں میں چھٹے نمبر پر تھے۔ ابتدا ہی سے رُجحان ادب کی طرف تھا۔ پرائمری کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول باغبان پورہ میں داخلہ لیا۔ خوش قسمتی سے ممتاز مفتی، طالب بدایونی اور مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی جیسے نامور ادب شناس اساتذہ کرام کی سرپرستی ملی۔ جہاں ان کو تعلیمی ماحول تو ملا مگر قابل اساتذہ کی سرپرستی نے ادبی ذوق کو مزید جلا بخشی۔ جس سے ان کی تحریروں میں پختگی اور نکھار پیدا ہوا۔ حفیظ شاہد کے اندر چھپے ادیب اور حساس دل نے اُنہیں سکون نہیں لینے دیا۔ وہ بطورِ گیت نگار، فلم انڈسٹری سے وابستہ ہو گئے۔ پنجابی فلمز ''بلبل پنجرے دی'' اور ''چھڈ برے دی یاری'' کے گیت لکھے۔ ان کے گیت میڈم نور جہاں، مسعود رانا، تصور خانم، رجب علی، مالا اور نسیم بیگم نے گائے۔ انہوں نے پروڈیوسر کی حیثیت سے بھی قسمت آزمائی کی۔ مالی مشکلات کی وجہ سے 1976ء میں لاہور کو مستقل خیر باد کہا اور خان پور سکونت اختیار کر کے یہاں کے ہو رہے۔

ملازمت کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کی محفلوں کو بھی جاری رکھا۔ مجلّہ ''بچے من کے سچے'' کے چیف ایڈیٹر رہے۔ حفیظ شاہد کے چھ شعری مجموعوں کے خالق تھے۔ (۱) سفر روشنی کا، (۲) چراغ حرف، (۳) مہتابِ غزل، (۴) یہ دریا پار کرنا ہے، (۵) فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی اور (۶) سورج بدل رہا ہے۔ شاعر کے پاس جو کہ ماضی کی یادیں، حال کی فکر اور مستقبل پر نظر ہوتی ہے۔ تبھی تو انہوں نے اپنے کلیات کا نام ''ختمِ سفر سے پہلے'' رکھا تھا۔ جبکہ مظہر عباس نے حفیظ شاہد۔ فن و شخصیت پر تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اُردو بھی ترتیب دے چکے ہیں۔ حفیظ شاہد کا انتقال 22 نومبر 2014ء کو ہوا اور جامعہ مخزن العلوم سے متصل قبرستان میں تدفین ہوئی۔ اللہ کریم انہیں کروٹ کروٹ راحت نصیب کرے۔ آمین

حفیظ شاہد کے دو شعر

ہم بھی دنیا سے شاہدؔ چلے جائیں گے
اک نئی داستانِ ہنر چھوڑ کر

آتے ہیں کچھ دیر کو میکش پیتے ہیں چل دیتے ہیں
موسم کے آنے جانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے

☆☆☆

رانا نصر اللہ ناصر (خان پور)

ادب کا سرمایہ... حفیظ شاہد

خان پور کی ادبی شخصیات کا جائزہ لیا جائے تو نعت اور غزل کے حوالے سے صاحب کتاب لوگوں میں گلزار نادم صابری، حیدر قریشی، رفیق راشد، غلام قطب الدین فریدی، زاہد شمسی، حفیظ شاہد اور دوسرے بہت سے شعراء کے نام قابل ذکر ہیں۔ حفیظ شاہد مرحوم کے 6 شعری مجموعوں پر مشتمل کلیات "ختم سفر سے پہلے" کی اشاعت کے بعد بلاشبہ حفیظ شاہد کو فیض احمد فیضؔ، ناصر کاظمیؔ ایسے شعراء کی صف میں شامل نہ کرنا ناانصافی ہوگا۔ حفیظ شاہد کے فنی کارناموں کا اعتراف اُردو ادب کے نامور نقادوں نے ان کی کتابوں کے دیباچے لکھ کر دیا ہے۔ ان میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر سہیل آغا، گوہر ملسیانی، شبنم رومانی اور پروفیسر سہیل اختر شامل ہیں۔

حفیظ شاہد بچپن ہی سے شعر و ادب کی طرف مائل تھے۔ چھوٹی چھوٹی کتابیں اور رسائل پڑھا کرتے تھے۔ شعر کہنے کی صلاحیت ان میں طالب بدایونی کی صحبت نے دی۔ حفیظ شاہد اپنے سکول کی ادبی تقریبات میں حصہ لیا کرتے تھے۔ دسویں جماعت میں حفیظ شاہد اچھے خاصے شعر کہتے تھے۔ اسی دوران ان کی غزلیں ادبی رسائل اور جرائد میں شائع ہو گئیں۔ حفیظ شاہد کی 600 غزلیات پر مشتمل چھ شعری مجموعے اور بعد ازاں کلیات بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ حفیظ شاہد کی غزل میں سچائی، حقیقت اور محبت چھلکتی نظر آتی ہے۔

حفیظ شاہد کا پہلا شعری مجموعہ "سفر روشنی کا" 1983ء ادارہ مطبوعات اَدوار، خان پور سے شائع ہوا۔ دوسرا شعری مجموعہ "چراغ حرف" 1989ء میں سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہوا۔ تیسرا مجموعہ "مہتاب غزل" 1994ء میں شائع ہوا۔ اس کا پیش لفظ آغا سہیل نے لکھا۔ حفیظ شاہد کا چوتھی شعری مجموعہ "یہ دریا پار کرنا ہے" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کا پیش لفظ سہیل اختر نے لکھا۔ پانچواں مجموعہ "فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی" 2004ء میں شائع ہوا، چھٹا اور آخری شعری مجموعہ "سُورج بدل رہا ہے" 2008ء میں شائع ہوا۔ کلیات حفیظ شاہد "ختم سفر سے پہلے" الحمد پبلی کیشنز، لاہور سے 2010ء میں شائع ہوا۔

حفیظ شاہد نے غزل کے ساتھ ساتھ نعتیہ شاعری بھی کی۔ انہوں نے نعت کو ایک نیا آہنگ دیا ہے۔ حفیظ شاہد نے 40 نعتیں لکھیں۔ جو بہت مقبول ہیں۔ کلیات "ختم سفر سے پہلے" کی پہلی نعت کے پہلے مصرعے میں پانچ الفاظ ہیں اور ہر لفظ اپنی جگہ فنی پختگی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ حفیظ شاہد کی نعتوں میں عشق رسولؐ انتہا درجے کا ملتا ہے۔ وہ پیغمبرِ اسلام کی سیرت اور رفعت کا بیان بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی عاجزی وانکساری کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ حفیظ شاہد کی دُعائیہ انداز میں لکھی ایک نعت ملاحظہ فرمائیں:

ہر اک رفعت زمانے کی تری رفعت میں شامل ہے
ہوئی تخلیق جو خوبی تری سیرت میں شامل ہے
مجھے پھر کیوں نہ آئے پیار اپنی بے نوائی پر
محبت بے نواؤں سے تری عادت میں شامل ہے
تری نسبت سے میں بھی معتبر ہوں اس زمانے میں
حوالہ جو بھی ہے میرا تری نسبت میں شامل ہے
یہ تیری ذاتِ اقدس ہے جو میری رہنما بن کر
مرے کردارِ انسانی کی ہر صورتمیں شامل ہے
میرے افکار کے پھولوں کو رکھتی ہے تروتازہ
تری رحمت مرے احساس کی جنت میں شامل ہے
اسے بھی اک نگاہِ لطف کی خیرات مل جائے
تیرا عاجز یہاں شاہد تری اُمت میں شامل ہے

حفیظ شاہد کی بچوں کیلئے لکھی ایک نظم ملاحظہ فرمائیں:

کس سے پوچھئے جا کر کیوں بگڑ گئے بچے
آتشیں کھلونوں سے کھیلنے لگے بچے
کچھ نئے تقاضے ہیں ، اِس نئے زمانے کے
اب کہاں مچلتے ہیں چاند کے لئے بچے
کھو گئے تعصب کے بے کراں اندھیروں میں
شہر کی فضاؤں میں میر ے گاؤ ں کے بچے
دو گھڑی لڑائی ہے ، پھر وہی صفائی ہے
ہم بڑوں سے اچھے ہیں بے شعور بچے
رنگ تھے مسرت کے پھول جیسے چہروں پر
خواب میں نہ جانے کیا دیکھتے رہے بچے
اک قدم بھی پھر آگے میں نہ چل سکا شاہد
جب کڑی مسافت میں یاد آگئے بچے

☆☆☆

مشرقی روایات کے امین.... حفیظ شاہدؔ

تاثرات: محمد اکرم (داماد حفیظ شاہد)

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے اتنی دور بسائی ہیں بستیاں

حفیظ شاہد مرحوم میرے سسر اگرچہ اب اس دنیا میں نہیں رہے مگر اُن کی یادیں اور اُن کی خوبیاں ایک رہنما کے طور پر اب بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ بحیثیت داماد اُن کے ساتھ چند سالہ رفاقت کے دوران میں نے اُن کو ایک شفیق باپ، ذمہ دار شوہر، پُر خلوص دوست، نہایت محنتی اور ایماندار ورکر، دردمند اور مُحبِ وطن شاعر، صوم وصلوٰۃ کے پابند، نہایت شفیق اور قابل اُستاد کے رُوپ میں دیکھا۔ وہ بچوں سے بہت محبت کرتے اور اُن کے ساتھ گھل مل جاتے۔ کبھی کسی غیر کا احسان تو کیا کبھی اپنی اولاد کا احسان بھی نہیں اُٹھایا۔

الغرض حفیظ شاہد مرحوم مشرقی روایات اور اَقدار کے امین تھے۔

اپنی یادیں چھوڑ کر کچھ لوگ چلے جاتے ہیں
پھر نہیں ملتے ، جانے کس دیس چلے جاتے ہیں

☆

محبت و اخلاق کا سرچشمہ.... حفیظ شاہدؔ

تاثرات: اختر رسول چودھری (داماد حفیظ شاہد)

حفیظ شاہد صاحب ایک فرشتہ صفت انسان تھے۔ وہ بہت شفیق اور محبت کرنے والے تھے۔ سادگی پسند تھے اور دین سے بہت لگاؤ رکھتے تھے۔ وہ ہر چھوٹے بڑے سے پیار کرتے۔ اُن کے عزیز و اقارب میں کسی کو اُن سے کوئی شکایت یا ناراضگی نہ تھی۔ وہ محبت و اخلاق کا سرچشمہ تھے۔ مجھے اُن کا داماد ہونے پر فخر ہے۔

☆☆☆

اکمل شاہد کنگ (صادق آباد)

عمدہ تخلیق کار... حفیظ شاہد

گزشتہ دنوں دونوں ہمارے خطے کے نوجوان ادیب، مدیر، فروغ علم وادب کے لیے سرگرم اور معتبر نام محمد یوسف وحید، جو ہمہ وقت بغیر کسی ستائش اور لالچ کے، خالصتاً علم وادب کی آبیاری کے لیے مگن رہتے ہیں، ان کا فون کال آئی اور ہمیشہ کی طرح انہوں نے ''شعور وادراک'' کے نئے آنے والے شمارے میں تحریر بھیجنے کے لیے کہا تو میرے استفار پر اُنہوں نے بتایا کہ آنے والے شمارے میں اُستاد الشعراء حفیظ شاہد مرحوم کے حوالے سے خوصی گوشہ شامل ہوگا جس میں خاص طور پر حفیظ شاہد کے فن وشخصیت پر منتخب مضامین اور دیگر تحریروں کے ساتھ ساتھ حفیظ شاہد کے کلیات کے بعد کا غیر مطبوعہ کلام بھی پہلی مرتبہ شائع کیا جارہا ہے۔
مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ محمد یوسف وحید کی بھی حفیظ شاہد سے پرانی یاد اللہ رہی اور حفیظ شاہد مجلّہ ''بچے من کے سچے'' کے چیف ایڈیٹر اور ادبی تنظیم الوحید ادبی اکیڈمی کے سرپرستِ اعلیٰ بھی رہے۔

☆☆☆

حفیظ شاہد کے ساتھ کچھ یادیں اور باتیں احباب کی نذر کر رہا ہوں۔
ربِّ کریم نے انسان کو اشرف بنایا اور اپنے فضل وکرم سے نوازا۔ اللہ کریم نے اس مخلوق کو ان گنت صلاحیتیں عطا فرمائیں۔ انسانی اوصاف اور خوبیوں میں سے سب سے عمدہ اور منفرد تخلیقی خوبی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیقی صلاحیت کا وصف اپنی خوبیوں سے عطا فرما کر انسان کو فضیلت کے درجے پر فائز کیا۔ کائنات کے مختلف اَدوار میں تخلیق کاروں نے اپنی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کے لیے طویل سفر طے کیا ہے۔
دنیا بھر کے تخلیق کاروں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نہایت عمدہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جن کی خدمات کا احاطہ ایک مضمون کی صورت ممکن نہیں ہے لیکن آج ہم شعروادب کے حوالے سے خانپور کے ایک روشن ستارے کا ذکر کریں گے جو اپنے فکروفن کی بدولت اُردو ادب میں غزل کا معتبر حوالہ ہیں۔ جو شعروادب کی دنیا میں حفیظ شاہد کے نام سے معروف ہیں۔
تاریخ کے ہر دَور میں کچھ شخصیات ایسی گزری ہیں جن سے چند لمحوں کی ملاقات عمر بھر یاد رہتی ہے۔ اللہ کریم کے لاکھوں احسان اور ہماری خوش بختی کہ ہمیں بھی حفیظ شاہد کی قربت حاصل رہی۔ حفیظ شاہد نہایت با اخلاق، ملنسار، مخلص اور باوقار شخصیت کے حامل خوب صورت انسان تھے۔
حفیظ شاہد سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ اُس وقت شروع ہوا جب ہم دونوں کوکا کولا کمپنی رحیم یار خان میں حصولِ معاش کے لئے کام کرتے تھے۔ میں سیلز کے شعبے میں تھا۔ لہٰذا میری ڈیوٹی کشمور، کندھ کوٹ، سوئی، ڈیرہ بگٹی وغیرہ شہروں میں تھی جو بعد ازاں ملازمت چھوڑنے کے بعد میں نے صادق آباد میں ۱۹۹۶ء سے کوکا کولا کی

ڈسٹری بیوشن کا آغاز کیا جو الحمدللہ تا حال جاری ہے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے کہ جب محترم حفیظ شاہد بھی کوکا کولا کے انتہائی اہم شعبہ فنانس کے انچارج تھے اور وہ اپنی ذمہ داریاں انتہائی ایمان داری سے نبھا رہے تھے۔ اُنہیں دنوں ان کے ایک جواں سالہ بیٹے نجم حفیظ بھی اکاؤنٹ کے شعبے سے منسلک تھے۔ یوں تو کمپنی کے سینکڑوں ملازمین تھے مگر حفیظ شاہد کا اخلاق، جذبہ ملنساری جدا تھا۔ دھیمے اور تحمل مزاج، اپنے کام میں مکمل ایمانداری کے ساتھ ڈیوٹی کرنا حفیظ شاہد کا خاصا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کمپنی کے چوکیدار سے جنرل منیجر تک سب لوگوں کی نظروں میں کردار و عمل کی وجہ سے نہایت محترم مقام رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ خان پور سے روزانہ رحیم یار خان تشریف لاتے تھے کیونکہ میری ڈیوٹی کی نوعیت مارکیٹ میں رہنے کی تھی لہٰذا حفیظ شاہد سے ملاقاتیں کم کم ہی ہوتی مگر جب کبھی مل بیٹھنے کا موقع ملتا تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ علم و عرفان سے لفظ لبریز شخصیت کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ گفت گو میں بہترین لفظوں کا استعمال، بھرپور اور مدلل انداز یقیناً حفیظ شاہد کا ہی امتیاز تھا۔ میل ملاقات کے کچھ ہی عرصے میں ہم پر یہ راز کھلا کہ حفیظ شاہد کا شمار تو سینئر شعراء میں ہوتا ہے اور شاعری کی تمام اصناف پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ بات حیران کن تھی کہ اُن کے متعدد شعری مجموعے بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اس کے بعد جب بھی ملاقات ہوتی تو ہماری درخواست پر کچھ کلام سناتے۔

ہمیشہ سچے تخلیق کار اَمر رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود آج بھی ہماری یادوں میں زندہ ہیں۔ اللہ کریم اُن کی مغفرت فرمائے اور اُنہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

حفیظ شاہد کے کلام سے چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ظلمت میں گھرا وقت کا صحرا بھی ہے ، میں بھی
آفات کی زد میں مری دنیا بھی ہے ،میں بھی

بگڑے ہُوئے ہیں شہر کے حالات آج کل
شاہدؔ تُو گھر میں بیٹھ کے گھر کا خیال کر

زباں پہ اُس کی رہا دوستی کا دعویٰ بھی
سلوک اُس کا مرے ساتھ ناروا بھی رہا

ابھی کسی سے وفاؤں کا تذکرہ نہ کرو
ابھی نہیں ہے زمانہ وفا شناس بہت

زندگی سے مطمئن تو کم ملیں گے شہر میں
لوگ اپنے آپ سے برہم ملیں گے شہر میں

بعد مدت کے جو آیا لوٹ کر میں شہر میں
اپنے گھر کا راستہ بھی مجھ کو مشکل سے مِلا

چند قطعات:

تجھ کو آیا نہ کبھی اُس کی مصیبت کا خیال
مدتوں جو تری دیوار کے سائے میں رہا
یُوں تو دشمن ہی رہا سارا قبیلہ میرا
پھر بھی شاہد میں شریک اپنے قبیلے میں رہا

کریں گے دوسروں کو کس طرح حلقہ بگوش اپنا
ابھی جو اپنے مسلک پر یقیں محکم نہیں رکھتے
سفر درپیش ہو شاہد جنہیں شامِ تمنا کا
چراغِ آرزو کی روشنی مدھم نہیں رکھتے

اُسے شجر پہ جو گزرے خبر نہیں ہوتی
ہوائے تند کو فکرِ ثمر نہیں ہوتی
میں اُس دیار میں کیسے بسر کروں شاہد
کہ جس دیار میں قدرِ ہنر نہیں ہوتی

ہمیشہ آدمی سے رابطہ رکھا ہے یوں میں نے
کسی کے کام آتا ہوں، کسی سے کام لیتا ہوں
مرے مسلک میں دھوکہ دوستوں سے کفر ہے شاہد
شکایت بھی اگر ہو دوستی سے کام لیتا ہوں

☆☆☆

صفدر بلوچ (گڑھی اختیار خان)

حق و صداقت کا پیامبر... حفیظ شاہدؔ

رُوداد جہاں کے اصلی تمدن اور فروعات کی پروردہ معاشرت کے نباض ذکی کاکوروی کا خوبصورت شعر ہے۔

موت سے بدتر ہے دل کی بے حسی
دل رہے زندہ کچھ ایسا کیجئے

اسی فلسفہ کو قلندرِ لاہوری حضرتِ اقبالؒ نے اپنے شعر کے ایک مصرعے میں کچھ یوں بیان کیا ہے

دلِ مردہ مردہ دل نہیں اسے زندہ کر دوبارہ

انسان کی فضیلت علم سے ہے، علم تحقیق سے ہے، تحقیق مقصد سے ہے اور مقصد کے بغیر انسان محض ایک Living Dead ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ امامِ عالی مقام امام حسین علیہ السلام نے اتنی بڑی قربانی ایک مقصد کے لیے ہی دی تھی اور "تخلیہ" سے تخلیق کا سفر بھی تو ایک مقصد کے تحت ہوا تھا۔
منتشر انسانیت کو عازمِ مرکز اور شائقِ مقصد بنانے کے لیے اسے دولتِ علم سے مالا مال کیا گیا۔ رُشد و ہدیٰ کا یہ نظام انبیاء کرام، اولیاء کرام، صوفیائے ذی مقام سے کائنات کے تھنک ٹینک فورم ان اعلیٰ ارکان کے ذریعے آج تک جاری ہے، جنہیں شعرا کہا جاتا ہے کیوں کہ آمدِ القاء ہے اور القاء وحی کی چوتھی قسم ہی ہے۔ شاعر ہر حال میں اصلاحِ احوال کا ضامن رہا ہے۔

کانٹے بھی لگیں ہاتھ تو کچھ غم نہیں ساغر
کلیوں کو ہر اک گام پہ بکھرا کے گذر جا

حفیظ شاہدؔ ایک فرد کا نہیں بلکہ دبستان کا نام ہے مگر ہماری وہ جو عادت ہے کہ وقت پر کسی کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے بلکہ اس کی دنیا سے روانگی کا انتظار کیا جائے اور بعد میں اس کے گُن گانے میں زمین و آسمان ایک کر دیئے جائیں۔ کچھ اس ہی طرح کا معاملہ حفیظ شاہد کے بارے میں بھی ہمیں نظر آتا ہے۔ ہم ایک پروگرام کی تیاری میں مصروف تھے۔ سو محترم صادق جاوید سے دریافت کیا کہ حفیظ شاہد کے شاگردوں کے بارے میں بتائیں تو معلوم ہوا کہ یاور عظیم اور اظہر عروج کے علاوہ چند نام شمار ہوتے ہیں۔ علی عباس ساجد (ٹیچر ٹرینر) بھی ان سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔ ہم علی عباس ساجد کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ ان کا حُسنِ انتخاب، تلفظ پر گرفت اور شعر کا برمحل استعمال سے اس اَمر کی تصدیق بخوبی ہو جاتی ہے۔
حفیظ شاہدؔ کے کلام میں عنوانات کی بندش، اَلفاظ کا چناؤ، قافیہ و ردیف سے نبھاؤ اور حُسنِ ترتیب کے ساتھ ساتھ آبشاری سلاست سونے پہ سہاگے کا کام کرتی چلی جاتی ہے مگر حفیظ شاہدؔ ایسے بے مقصد سفر کی بجائے حقیقت کا منادی ہو کر پکار اُٹھتا ہے۔

اے حسن گم شدہ مجھے تیری تلاش ہے
کچھ تو میری اداس نظر کا سوال کر

جی ہاں ۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آلباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبینِ نیاز میں

حفیظ شاہد یہ اعتراف کرتے ہوئے ذرہ برابر بھی نہیں گھبراتے کہ انہوں نے زندگی کے تمام تر پہلو دیکھ لیے ہیں اور اب ایک مشاق مسافر کی طرح سفر کی دشواریوں اور رہزنوں کے وجود کی آگاہی رکھتے ہیں اور اپنے پیرو کاروں کے لیے نشانِ منزل کے ساتھ ساتھ دشواریوں کی آگاہی بھی دان کرتے چلے جاتے ہیں۔ ۔

میرے خیالوں میں چاندنی ہے میری نگاہوں میں ہے اُجالا
میں روشنی کا سفیر بن کر نئے دِنوں کی تلاش میں ہوں

اب ذرا دوسرا رُخ دیکھیے اور داد دیجئے ۔

خزاں نے مجھ کو دیے ہیں چر کے بہار نے بھی عذاب بھگتے
میں زخم خوردہ ہوں موسموں کا میں نئی رُتوں کی تلاش میں ہوں

فنی پختگی پیغام کی ترسیل میں بے پایاں سہولت پیدا کر دیتی ہے اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حفیظ شاہد نہایت تجربہ کار اُستاد الشعراء اور رُموزِ شاعری کے دقیقہ دان ہیں۔ حفیظ شاہد نے شعری حُسن کے تمام جزیات کا حُسنِ ترتیب سے جو بہترین گلدستہ دنیائے ادب کو بطورِ تحفہ دیا ہے وہ احسانِ عظیم سے کم نہیں اور ترسیلِ پیغام کے ساتھ ساتھ تشریحاتِ ضرور یہ بھی دے۔

تلمیحات، اشاریہ کنایہ، استعارہ، منظر نگاری ہر طرح کی خوبیاں حفیظ شاہد کے ہاں نہایت حسین انداز میں برتی گئی ہیں۔ تبلیغ کے عنصر کو حفیظ شاہد نے خوب مدِ نظر رکھا ہے اور خوب نبھایا ہے۔ ایک جھلک دیکھیے ۔ ۔

تم اُجالوں کے تمنائی ہو اتنا سوچ لو
روشنی میں سائے بھی مدغم ملیں گے شہر میں
دیکھنا کچھ اور تازہ زخم لے کر آؤ گے
تم سمجھتے ہو تمہیں مرہم ملیں گے شہر میں

دیکھیے کس خوش الحانی سے آمدہ دشواریوں کے لیے سینہ سپر ہونے کا درس دیا جا رہا ہے اور مردانہ وار مقابلے کی لگن لگائی جا رہی ہے۔ اس طرح حفیظ شاہد عمل کے دھنی اور چستی کے اُستاد ثابت ہوتے ہیں۔

حفیظ شاہد کی اُدبِ اطفال کے حوالے سے بھی بھرپور خدمات ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی گزشتہ چودہ سال سے شائع ہونے والا بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول مجلّہ ''بچے من کے سچے'' ہے۔ جس کے ساتھ حفیظ شاہد بطور چیف ایڈیٹر منسلک رہے۔ بقولِ اسسٹنٹ ایڈیٹر مجلّہ سعدیہ وحید' حفیظ شاہد نہایت پُر خلوص اور دیانت دار انسان تھے۔ مجلّے کے تمام مراحل مثلاً حُسنِ ترتیب، تحریروں کا انتخاب، حصہ نظم کی تیاری اور جملہ اُمور کے حوالے

سے بھرپور رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرماتے ۔

مدیر مجلہ محمد یوسف وحید جو کہ ہمیشہ ادب پاروں اور گوشہ نشیں ادیبوں کو تلاش کر کے اَدبی دھارے میں شامل کرنے کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں' کس طرح ممکن تھا کہ حفیظ شاہد کے ساتھ طویل عرصے کی محبت و رفاقت کو بھول جاتے۔ محبت و خلوص کے اس سلسلے میں بھی پیش قدمی کرتے ہوئے حفیظ شاہد کا غیر مطبوعہ کلام جو کلیات کی اشاعت کے بعد 2010ء سے 2014ء کے دَوران لکھا گیا' جس میں اُردو، پنجابی غزلیں، گیت اور دیگر کلام شامل ہے' اِس خصوصی گوشہ میں ''ختمِ سفر کے بعد'' کے عنوان سے پہلی مرتبہ شائع کر رہے ہیں۔ جو نہایت اَحسن اقدام ہے' یقیناً یہ اہلِ ذوق و ادب کے لیے کارآمد تحفہ ہے۔

ادب کی خدمت' دراصل جہانِ ادب میں مخدومی دلا کر ہی دم لیتی ہے۔ محمد یوسف وحید نے جس طرح مناسب سمجھا، ادب کی خدمت کا بیڑہ اُٹھایا اور وقتی دشواریوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دن رات ایک کر کے خصوصاً کرونا ایسی آسمانی آفت کے دَور میں ادبی متلاشی کے طور پر' ادب کے کھوجی کے طور پر، سماجی کارکن کے طور پر دامیں، درمیں، سخنیں ہر طرح سے نخلِ ادب کی آبیاری کا جو فریضہ جس اُچھوتے انداز سے ادا کیا ہے' ہم اس پر اُن کو سراہتے ہیں اور نوخیزوں کو اُن کی تقلید کی دعوت یوں دیتے ہیں ۔

کر گیا ہے راہ جو ہموار یوسف کام کی
اک کڑی ہے جان لو تو نام کی، کام کی

شعور و ادراک کے صرف تین ہی نسخے دیکھ لیے جائیں تو ان میں موجود ادبی تذکرے' تاریخ کے تین سنہرے بابوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ ''خصوصی گوشہ علامہ سید محمد فاروق القادری'' سارے وَسائل اور جابز آفرز کے باوجود اپنی نگری' دھرتی سے محبت کی عمدہ مثال ''حیدر قریشی گولڈن جوبلی نمبر''، دیارِ غیر میں رَہ کر مٹی سے گہری عقیدت و محبت رکھنے والا اَدیب' حفیظ شاہد جو ظاہر میں صرف چند افراد کی اصلاح کر سکا مگر باطن میں اصلاحِ جاریہ کا سمندر جاری کر گیا۔

لفظوں کی مالا پرونے کو ہیرے
جو پائے تو ہے ایسی ہی مالا پروئی
ادیبوں کا چرچا ہوا دھیرے دھیرے
نکھر کے نمایاں ہوئی صاف گوئی

☆☆☆

نصرت جہاں (خان پور)

ہمہ جہت شاعر... حفیظ شاہدؔ

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے اپنے اشعار میں کیا شاندار ماضی یاد دلایا۔ حال کا رونا رویا اور مستقبل کی نوید سنائی۔ فرمایا:

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

☆

کھول کر آنکھیں میرے آئینۂ گفتار
آنے والے دَور کی دُھندلی سی اک تصویر دیکھ

علامہ محمد اقبالؒ کی شاعری الہامی شاعری ہے۔ یہ بات سچ ہے، شاعر اور ادیب معاشرے کا حساس اور ذہین ترین شخص ہوتا ہے۔ اس کی شاعری اس کے اردگرد ہونے والے حالات و واقعات، معاشرتی، سماجی روّیوں، معاشی ناہمواریوں، عدم استحکام و ناانصافی کے فیصلوں، لسانی و سیاسی تحریکوں، مذہبی منافرت اور ذات پات پر گزرنے والی وارداتوں سے شدید متاثر ہوتی ہے۔ شاعر کے مزاج کی حساسیت اِن تمام کیفیات کو لفظوں کا رُوپ دیتی ہے اور پھر ان لفظوں کی مضبوط اور دل کو چھوتی ہوئی ایسی مالا بن جاتی ہے کہ قاری اس کو بڑے ذوق و شوق سے پہنتا ہے۔ اسے اپنی ذات کے سے متعلق سمجھتا ہے۔

حالات و واقعات، تاریخ و تمدن وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ شاعر و ادیب ایک مورخ کا کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ جیسے خطوطِ غالب برِصغیر کے حالات و واقعات کی عکاسی کرتے ہیں۔

حفیظ شاہد آج کے دَور کا ہمہ جہت شاعر ہے۔ حفیظ شاہد کی شاعری میں جہاں دلی واردات کی عکاسی ملتی ہے وہاں حفیظ شاہد معاشرے اور اس کے مسائل کو حقیقت پسندی سے دیکھتے ہیں۔

کیا کتابِ مصحفی میں ہے یہی مرقوم دیکھ
ایک ہی صف میں کھڑے ہیں ظالم و مظلوم دیکھ
گر مری تقریر میں جدت نہیں تو کیا ہوا
میرے لہجے پر نہ جا تو معنی و مفہوم دیکھ

حفیظ شاہد مستند اور پختہ شعر کہتے تھے۔ حفیظ شاہد کی شعری قدر و منزلت کو نامور اُدبا، شعرا نے کھلے دل سے تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے حفیظ شاہد کی غزل کو بدلتی ہوئی زندگی کو سمجھنے اور دوسرے تک پہنچانے کا گہرا شعور رکھنے کا اعتراف کرتے ہیں۔

عارف عبدالمتین کہتے ہیں:

''حفیظ شاہد نے اپنے فن کو جدید اساسی عناصر پر اُستوار کیا ہے''۔

محسن نقوی لکھتے ہیں:

''خان پور ایسے بے آب و گیاہ ادبی جزیرے سے اس قسم کے اشعار کا طلوع ہونا سنگلاخ زمین کو زم زم کی بشارت ہے''۔

حفیظ شاہد کی شاعری پر ڈاکٹر وحید قریشی، یزدانی جالندھری، ڈاکٹر آغا سہیل، خواجہ محمد زکریا، شبنم رومانی اور دیگر نے اپنے اپنے انداز اور الفاظ میں اعتراف فن کا اظہار کیا ہے۔ حفیظ شاہد کی شاعری میں بلندیٔ خیال،، جدیدیت، کلاسیکیت، فنی و گہری آشنائیٔ فنِ غزل کا ایسا معتبر حوالہ ہیں کہ ان کی شاعری کا ہر قاری واہ واہ کر اُٹھتا ہے۔ یقیناً اُن کے چھ شعری مجموعے شعری و ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے انمول اور یادگار تحفہ ہیں۔ حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں اُن کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

سایہ تلاش کر نہ ثمر تلاش کر
اب سُوکھنے لگا ہے شجر کا خیال کر
بگڑے ہوئے شہر کے حالات ہیں آج کل
شاہدؔ تو گھر میں بیٹھ کے گھر کا خیال کر

☆☆☆

کلام حفیظ شاہدؔ

سرِ زمیں کہ سرِ آسماں تلاش کروں — تجھ اے موسمِ رفتہ کہاں تلاش کروں
بہت سے آبلہ پا تھے جو رہ گئے پیچھے — کسے کسے میں پسِ کارواں تلاش کروں
اُجاڑ دی ہے عجب زلزلوں نے یہ بستی — مکیں تلاش کروں یا مکاں تلاش کروں
گلوں کی بات اگر باغباں نہیں سمجھا — تو پھر کہاں میں کوئی ترجماں تلاش کروں
تُو خود ہی اپنے ٹھکانے کی دے خبر کوئی — تُو لامکاں ہے، ترا کیا مکاں تلاش کروں
عجب مزاج ہے میرا، عجب یہ عادت ہے — ہر ایک کام میں اپنا زیاں تلاش کروں
بلا کی دُھوپ ہے دشتِ حیات میں شاہد — کہاں رہوں مَیں، کہاں سائباں تلاش کروں

☆☆☆

فنی و فکری جہات

غلام قادر آزاد (لندن) ایک خط، ایک مضمون

منفرد اُسلوب کا شاعر... حفیظ شاہدؔ

ڈیئر حفیظ!... سلامِ شوق!

بہت دنوں سے تغافل نے ترے پیدا کی
وہ اِک نظر جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

آج صبح گیارہ کے قریب ہم یہاں سے ڈنکاسٹر روانہ ہوئے تھے اوراب سرِ شام گھر واپس آگئے ہیں۔ آتے ہی قلم اُٹھا کر آپ سے ہمکلام ہو رہا ہوں اور ایسے عالم میں کہ اپنی ایک پرانی غزل کا ایک شعر معاً میرے ذہن میں اُبھرتا ہے ۔

شام کے سے اکثر چائے سامنے رکھ کر
ہو کے کچھ فسردہ سا، سوچتا ہوں جانے کیا!

خیال چاہتا ہے کہ ان ہی سطور پر آج کی گفتگو تمام کر دوں تا کہ غالب کا جو شعر میں نے درج کیا ہے، وہ اپنی پوری شدت یا Intensity کے ساتھ آپ کے دل و دماغ پر حاوی ہو جائے اور وہ فکری اور جذباتی تفصیل خود بخود روشن ہو کر سامنے آسکے جو اس کے پردے میں پوشیدہ ہے۔ لیکن میں گفتگو کی Temptation کو بھی روک نہیں سکتا۔ دراصل ہمارے مابین چپ کا یہ طویل عرصہ کس قدر حیرت انگیز ہے۔ آپ نے اپنے خط میں نا تمام خطوط کی جو بات کی ہے اس کی سچائی کو میں پوری شدت کے ساتھ سمجھ رہا ہوں کیونکہ میں بعینہٖ انہی نا تمامیوں سے گزر رہا ہوں۔ میری نظر میں وہ لوگ جو ذہن کی 'موجِ پرِ فتح' مند ہوتے ہیں اور جب یہ سر اٹھاتی ہے تو اسے تکمیل تک پہنچائے بغیر نہیں چھوڑتے وہ کامیاب لوگ ہوتے ہیں۔ خصوصاً ادب و فن کی دنیا میں۔ اس کی عدم تکمیل ہی دراصل تساہل اور تغافل کہلاتی ہے۔ نابغے یا zenius کی میرے نزدیک تعریف ہی یہ ہے کہ وہ تساہل اور تغافل سے قطعی نابلد ہوتا ہے۔ کم از کم وہ فکر و فن کے معاملے میں اب ضرور ہوتا ہے۔ اسی لیے حالات کا جبر اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مادی حالات میں وہ قطعی طور پر تساہل و تغافل پسند نظر آتا ہے۔ عام لوگوں کی نظر میں، ناکام اور نامراد مگر وہ یہی قیمت ادا کر کے کامیابیوں کی بلندیوں کو چھو لیتا ہے۔ ہماری چپ کا سبب دراصل ہمارے اندر کا یہی تضاد ہے۔ ہم بیک وقت مثبت خیال کو منفی معیاروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ مثلاً آپ سے ہمکلام ہونے کے لیے میں نے قلم اُٹھایا اور باورچی خانے سے آواز آئی کہ مرچیں ختم ہیں۔ اب ذہن کو بیک وقت دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ یہی لمحے کا ردِعمل ایک ناکامی اور دوسری کامیابی کا سرچشمہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ لمحے کے اس تضاد کا جواب ہم نے کیا دیا۔ یہ صورتِ حالات انسان کو قدم قدم پر پیش آتی ہے۔ عمل اور ردِعمل کے اس مسلسل بہاؤ میں ہم نے فیصلے بھی جلد جلد کرنا ہوتے ہیں۔ یہی ہماری آزمائش ہے

جس کے لیے غیر معمولی سلامتیِ طبع درکار ہے۔ (ع) فغاں کہ فرصتِ نظارگی بہت کم ہے اور اس کے مقابلے میں حالات کے جبر کا سیلاب بھی کچھ کم طاقتور نہیں بلکہ پہاڑ کاٹنے کی بات ہے۔ میرے نزدیک انسان کی سب سے بڑی سب سے کٹھن سب سے مشکل اور شدید طور پر سنگین مشکلیں دو ہیں۔ ایک حالات کا جبر، دوسری ابلاغ یا communication کا مسئلہ، زندگی ہو یا فن دونوں ان کی زد پر ہیں، دونوں میں جو پیچیدگیاں یا complexities ہیں، دکھائی دیتی ہیں۔ وہ انہی دو کا نتیجہ ہے۔ حالات کے جبر میں انسان کے اندر سارے معاملات، اس کی جبلتیں، عادتیں، ضمیر و ضمیر کے اسالیب بھی شامل ہیں اور خارج کے احوال کا سب کچھ جس میں روزگار، رشتے، روایات اور سماج کا سارا گورکھ دھندا ابلاغ میں زبان و بیان سے لے کر اظہار و اخفا کی ساری حالتیں شریک ہیں۔ شخصیت انہی ارکھن گھاٹیوں سے گزرنے یا گزر جانے کی کوششوں سے عبارت ہے۔ یہ باتیں میں اپنے مابین اس لیے کر رہا ہوں کہ ہم بفضل خدا ان مسائل پر اگر فتح نہیں پا سکتے تو اس مشکل کو پہچان ضرور سکتے ہیں اور کسی مشکل کو پہچان لینا یا Identity کر لینا ہی مشکل حل کی طرف ایک قدم ہے۔

زندگی کے عام معاملات کی بات ہو یا ادب میں اظہار و ابلاغ کی جب ہم کسی سچائی کو پہچان لیتے ہیں اور جان جاتے ہیں تو ہم میں ایک تبدیلی غیر محسوس طور پر در جاتی ہے۔ جسے بعض اوقات ہم سمجھ ہی نہیں سکتے مگر ایک لطف اس سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بغیر ساری باتیں اوپری ہی رہتی ہیں۔ بناوٹی اور کاغذی یا لفظی، مثلاً اب کے آپ نے اُستاد کے پڑھانے اور شاگرد کے ناخلف ہونے میں گھریلو زندگی کی سب سے بڑی سچائی کی بات کی ہے تو میں چونک اُٹھا ہوں۔ یہ بات بھی زندگی کے جبر اور ابلاغ کے فقدان کے دائرے کی بات ہے۔ تسنیم نے بھی خط پڑھا اور میں نے کہا کہ تم اس خط کی سب سے اہم بات مجھے بتاؤ تو وہ آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گئی۔ وہ سب لوگ جو ایلی یا عائلی زندگی گزارتے ہیں۔ اسی مسئلے سے دوچار ہیں اس پر بڑے بڑے ادیبوں نے بہت خوب اشارے کیے ہیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ عائلی زندگی غیر معمولی طور پر منافقت کی زندگی ہے۔ آدمی ذہنی سطح پر معمولی اور عام قسم کی چیخ چیخ سے بچنے کے لیے کم و بیش ہر وقت ایک مصالحت کا رویہ اختیار کیے رہتا ہے۔ یہ کام عام ذہن سے ممکن نہیں اس لیے یہ بھی ایک بڑائی ہے۔ وہاں خاموشی ایک مکمل ابلاغ ہے جہاں ابلاغ قطعی ممکن نہیں اس کی طرف آپ نے ایک شعر میں خوبصورت اشارہ دیا ہے۔

قیامت کے اندھیرے ہیں گھروں میں
چراغاں ہو رہا ہے معبدوں میں

عجیب اتفاق ہے کہ گزشتہ برس میں نے ایک غزل کہی جو اس موضوع سے نمودار ہوئی تھی۔ تین چار شعر درج کرتا ہوں۔

دیکھو تو عافیت کا بسیرا گھروں میں ہے
جانو تو ہر وجود کڑے معرکوں میں ہے
حالاتِ جبر، شوقِ تمنائیں، مصلحت
سکھ چین دیکھنے کو بہت آنکھوں میں ہے

چپ ہے جو ایک شخص معانی کے کرب سے
وہ صاحبِ خیال گھرا پتھروں میں ہے
اُترے ہیں بام پر جو کئی خوشنما پرند!
لپکا کسی اُڑان کا ان کے پروں میں ہے

آخری شعر یوں ہی آپ کے تفنن طبع کے لیے درج کر دیا ہے۔ تیسرا شعر خاص آپ کے لیے ہے۔ زندگی اگر ان تضادات اور تناقضات سے عاری ہو تو اس میں کسی ہنگامے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ عام لوگ ان کا شکار ہوتے ہیں۔ فنکار خود کبھی زخمی ہو کر اور کبھی بالکل سلامت رہ کر ان کا شکار کر لیتا ہے۔ اسی لیے وہ دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے۔ مثلاً آپ نے دو آدمیوں کا قصہ لکھا ہے۔ وہ دونوں اس جبر کے اسیر تھے مگر قصہ بیان کرنے والا شخص اس سے اوپر اُڑ چکا ہے۔ اگر قصہ کہنے والا شخص ان دو میں سے ایک تھا مگر اس واقعہ سے گزرنے کے بعد اس پر تنقیدی نظر ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ تو اپنی جگہ ممتاز تر ہے۔ آپ کے پاس زندگی کے یہ تجربات جو باہمی انسانی رشتوں سے پھوٹتے ہیں جو زندگی سے براہِ راست دو چار ہونے سے ملتے ہیں۔ جو دل کے لخت لخت ہونے سے ابھرتے ہیں۔ وافر تعداد میں موجود ہیں۔ انہیں آپ اپنے شعر و فن کا حصہ بنا دیں تو قدرتی طور پر آپ کا فن مایہ دار بھی ہو گا اور منفرد بھی کہ فن اگر ذاتی تجربے کی دین ہے تو اسی قدر سچائیوں کا امین بھی۔ اس بات پر مجھے اپنا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

جو حرف و ذات کے رشتوں سے باخبر ٹھہرے
جہاں کہیں تھے ہیں لوگ معتبر ٹھہرے

آپ کا یہ شعر بھی براہِ راست اس بات کی تائید کر رہا ہے۔

شعورِ کامرانی مجھ کو شاہدؔ
ملا ہے زندگی کے تجربوں سے

آپ کے خط میں خانپور کے دوستوں کی غزلیں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ اگر میں خان پور یا لاہور میں ہوتا تو میری مسرت یک جہت کی مسرت ہوئی مگر اب فاصلوں نے اور دوری کے گھمبیر اور مختلف النوع تجربات نے اس مسرت کو کئی جہتیں عطا کر دی ہیں۔ مثلاً اس وسیلے سے مجھے خان پور کی وہ شام یاد آئی جب ہم آپ، محترم نرودش ترابی، صفدر صدیق رضی اور جناب آسی خانپوری جمع تھے اور آپ کے شعر و خیال نے اس خنک شام کو زندگی کی دوسری شاموں سے قطعی الگ ایک مستقل صورت دل و ذہن میں عطا کر دی تھی۔ اب آپ سب کے فکر واحساس کی چمک آپ لوگوں کی غزلوں میں پا کر وہ شام میرے ذہن میں روشن ہو گئی ہے اور کچھ یوں کہ

چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم سمجھتے تھے کہ اے میرؔ یہ آزار گیا

خوشی کی ایک جہت اور بہت واضح طور پر اُبھری اور وہ ہے آپ لوگوں کی ادب سے گہرا لگاؤ۔ آپ لوگوں کے خلوص اور جذبے کی بہار دیکھ کر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ پاکستان کے مختلف ادبی مراکز کے سامنے

اپنی شناخت کا عمل بھی ہے۔ اس طرح آپ لوگوں کی خانپور جیسے ریگزار اور مرکز سے دُور علاقہ میں موجودگی خان پور کے ادبی تشخص کی زندہ مثال بن گئی ہے۔ عین ممکن ہے آگے چل کر محترم نزدوش ترابی، صفدر صدیق رضی، آسی خانپوری اور آپ کی غزل کے دامن میں جذبے کا خلوص، سادگی اور زندگی کی وہ صحت مند اور توانا قدریں منفرد شکل میں اُبھریں جن کا وجود شہر کی مصنوعی، جامد، خود غرضانہ، مکارانہ اور ریاکارانہ زندگی کے بس کا روگ ہی نہیں۔ اقبالؒ کی یہ بات آپ لوگوں کے لیے بڑی معنی خیز ہونی چاہیے۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کوہستانی

شہر کی ہولناکیوں سے الگ آپ دوستوں نے اپنی غزلوں میں جو پھول اُگائے ہیں وہ اپنی جگہ لائقِ صد تحسین ہے۔ ہم ان کی رعنائی سے دور افتادگی کے کرب کا مداوا کریں گے۔ مذکورہ بالا دوستوں کی غزلوں کا ہر رنگ اپنی جگہ دل نواز ہے۔ نظر نوازی تو خیر رنگ کو قدرت سے ودیعت ہے ہی۔ جی چاہتا ہے کہ ہر فنکار کا ایک شعر جو لطف و سرور بخشا ہوا ہے میرے سامنے ہے یہاں لکھوں۔ آپ کی دلچسپی کے لیے۔ یہ ایک شعر ہی کسی صاحب فن کا سرمایہ نہیں مگر میں صرف اختصار اور آپ کی دلچسپی کے لیے صرف ایک شعر تک خود کو محدود رکھتا ہوں۔ زیادہ شعروں کے انتخاب میں میری رُسوائی کا سامان بھی اسی قدر زیادہ ہوگا۔

کسے خبر وہ مرا حال ہے، کہ ماضی تھا
وہ شخص جس سے گلے مل کے رو پڑا ہوں میں

(صفدر صدیق رضی)

☆......☆

یہ زہرِ غم ہی مری طبیعت کو راس تھا
وہ اجنبی بلا کا قیافہ شناس تھا

(نزدوش ترابی)

وہ شخص زینتِ دار و رسن ہو آسی
نقیب جو بھی بدلتی ہوں رُتوں کا ہوا

(آسی خانپوری)

☆......☆

داغِ وفا دلوں کے تقدس کا ہیں ثبوت
خود چل کے یہ چراغ مزاروں تک آئے ہیں

(حفیظ شاہد)

آل احمد سرور نے ایک جگہ ٹی ایس ایلیٹ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ جس شاعر میں طباعی ہوتی ہے وہ براہِ راست زندگی کی طرف جاتا ہے۔ جو شاعر تقلیدی اور خوشہ چیں قسم کا ہوتا ہے وہ ادب کی طرف ہوتا ہے۔ آل احمدؔ

سروراس کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ پہلی قسم کا شاعر زندہ زباں استعمال کرتا ہے اور دوسری قسم کا کتابی۔ ان کی یہ بات صحیح ہے مگر میری حقیر رائے میں پہلی قسم کا شاعر زندگی کے قلزم خوں میں اُترتا ہے۔ اس کے فکروفن کا خام موادزندگی کی کشمکش سے میسر آتا ہے، اس لیے اس کے یہاں لفظ تھرتھراتے ہوئے vibrating ہوتے ہیں جبکہ دوسرا شاعر سنی سنائی، لکھی لکھائی باتوں سے inspire ہوتا ہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ بات وہی درست ہے بڑا فنکار تاریخ کے جس لمحے میں سانس لیتا ہے اس کے سب کچھ کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اپنی کامیابی کے اس اظہار پر اتراتا ہے تو اس پر زندگی کی چھاپ صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس کے تجربے کی تازگی اس کے لیے تازہ زبان، تازہ اُسلوب کا تقاضہ کرتی ہے۔ غزل کے روایتی اور بنے بنائے سانچے میں وُسعت، تازگی، جدت، نئے پن کا احساس وہیں وہیں ہوا ہے جہاں جہاں شاعر نے زندگی کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ کسی کی غزل ہی کا شعر ہے ؎

لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

میرے خیال میں ایلیٹ کی بات ہم سب کے لیے رہنمائی کا حق ادا کر سکتی ہے اور ہم لفظ کے لفظ کے ساتھ ٹکرانے سے بچ کر تجربے کی گونج کو اسیر کر سکتے ہیں۔ اور تجربہ زندگی کے کسی بھی پہلو کا ہو، زمان و مکان کی تبدیلی سے آدمی کے انداز و فکر و نظر کے مختلف ہونے سے ہر ایک کے یہاں الگ اور جدا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں آج ہم نے شعروادب پر اپنی سی خاصی گفتگو کر لی ہے۔ بلکہ یوں لگتا ہے جیسے کہ محض شعر کہنے سننے والے حیوان ہیں اور بس۔

(بشکریہ۔ اُدوار۔ مدیر: آسی خان پوری، صفدر صدیق رضی، ادارہ مطبوعاتِ اُدوار، خان پور، ص:۲۶)

☆☆☆

کلامِ حفیظ شاہدؔ

سج گئی تاروں بھری رات ہماری خاطر
کس نے بھیجی ہے یہ سوغات ہماری خاطر

دو گھڑی آؤ کہیں بیٹھ کے باتیں کر لیں
پھر نہ آئیں گے یہ لمحات ہماری خاطر

جانے کس بات پہ وہ آج خفا تھا ہم سے
اُس نے چھیڑی نہ کوئی بات ہماری خاطر

کیا کہیں اور اسے، ہم جو محبت نہ کہیں
دل گرفتہ ہیں وہ دن رات ہماری خاطر

خود تو اُٹھتے نہیں حالات بدلنے کے لئے
کون بدلے گا یہ حالات ہماری خاطر

کتنے پُرغم ہیں یہ لمحاتِ جدائی شاہدؔ
اُس کی آنکھوں میں ہے برسات ہماری خاطر

☆☆☆

یاور عظیم (خان پور)

حفیظ شاہؔد کے کلام کا موضوعاتی جائزہ

حفیظ شاہؔد کی شاعری کا مجموعی مزاج:

حفیظ شاہد کی چھ کتابوں میں موجود اُن کی غزلیہ شاعری پڑھ کر اور اس کا بار بار جائزہ لے کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غزل کے فن میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے یہاں کہیں کہیں علامہ محمد اقبالؒ اور کچھ پرانے شاعروں کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ ان کو ہم باقاعدہ کسی ایک شاعر کا یا ایک سے زیادہ شاعروں کا مقلد (Follower) نہیں قرار دے سکتے۔ ہم ان کی شاعری کے بڑے حصے کو پڑھ کر یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک مختلف شاعر تھے جن کے سوچنے، بات کرنے اور لفظوں کو برتنے کا اپنا الگ انداز تھا۔ ان کی شاعری میں ابلاغ کا خوبصورتی سے اہتمام کیا گیا ہے۔ وہ جو بات کرنا چاہتے ہیں اس کو مناسب ترین لفظوں میں بڑی سہولت سے پڑھنے والوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ وہ اُردو غزل کی اس روایت کے شاعر ہیں جس پر فارسی زبان کے گہرے اثرات ہیں۔ اس لیے حفیظ شاہد کے یہاں بھی جگہ جگہ فارسی مرکبات اور لفظیات سے کام لیا گیا ہے۔ ان کے چھٹے مجموعے ''سورج بدل رہا ہے'' میں یہ تناسب (Ratio) دیگر مجموعوں سے کم ہے۔ ان کی شاعری آپ بیتی اور جگ بیتی کا امتزاج ہے، اور اس میں فرق کرنا ممکن نہیں۔ ذیل میں ہم اُن کی شاعری کے بعض اہم موضوعات کا مختصر جائزہ لیں گے۔

(۱) اخلاقی اور اصلاحی پہلو:

حفیظ شاہد کی شاعری کو پورے اعتماد کے ساتھ ایک مہذب آدمی کی شاعری قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کے یہاں زندگی کے ہر معاملے پر شائستگی سے اظہار ملتا ہے۔ وہ انسان کو بلند اخلاقی اقدار (High MoralValues) کا مالک دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ایسے معاشرے کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں جس میں حق گوئی، ادب آداب، بھائی چارہ، محبت اور احترامِ انسانیت ہو۔ یہ پہلو، اُن کی شاعری میں بہت توانائی سے موجود ہے، اور جگہ جگہ اس نوعیت کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔

(۲) اُمید اور حوصلہ مندی:

ایسے کتنے ہی شاعر ہوئے جن کی شاعری میں مایوسی اور نا اُمیدی کا پیغام موجود ہے۔ وہ زندگی کی تلخیوں کو برداشت کرنے کا پیغام دینے کی بجائے اور مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کی بجائے، زندگی ہار دینے کی بات کرتے ہیں۔ ایسی کیفیت کبھی کبھی انسان پر طاری ہو تو کوئی عجیب بات نہیں، لیکن جب ایک انسان اپنے آپ سے، اپنے حالات سے، اور اُس کی ذات سے مایوس ہو جائے تو وہ اپنی اور دوسروں کی زندگی کے لیے ایک زہر بن جاتا ہے۔ وہ خود تو مایوس ہوتا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی جد و جہد، حوصلہ مندی، اور کوششوں سے روکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک منفی رویہ ہے، اس کی روک تھام ضروری ہے تا کہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل

ہو سکے جو زندگی سے بھرپور ہو، جس کے لوگ محنتی ہوں، پرامید ہوں، حوصلہ مند ہوں، صبر اور ضبط والے ہوں، ان کو یقین ہو کہ رات کتنی ہی طویل سہی، صبح کا سورج ضرور نکلے گا۔

(۳) شہری زندگی کے مسائل:

شہر کے لوگوں کو جن مسائل کا سامنا ہے، اس کی تصویر کشی حفیظ شاہد کا محبوب مشغلہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس بے ہنگم اور تیز رفتار زندگی میں انسان اپنے آپ سے، بہت دور نکل آیا ہے۔ وہ خود فراموشی سے گھائل ہو چکا ہے۔ صبح سے شام تک پیسہ کمانے کی مشین بننے والے لوگوں کے لیے نہ اپنے لیے وقت رہا ہے، نہ اپنے ماں باپ کے لیے، نہ اپنی اولاد کے لیے۔ وہ عمر بھر ساتھ رہنے والے پڑوسیوں سے بھی لاتعلق رہنے لگا ہے۔ اپنے گھروں کو قیمتی پتھروں سے سجانے والے ان گھروں میں رہتے رہتے پتھرا گئے ہیں۔ وہ قناعت، وہ حسنِ سلوک، وہ حقِ ہمسائیگی، وہ صبر و سکون، وہ برداشت جو انسانی معاشرے کا حسن تھی اسے گھن لگ گیا ہے۔

(۴) فطرت نگاری:

ہم سے اکثر لوگ تسلیم کریں گے کہ انہوں نے کئی دنوں سے طلوعِ آفتاب کا منظر نہیں دیکھا، بغور پرندوں کی چہکار نہیں سُنی، مٹی کی سوندھی خوشبو نے اُن کی سانسوں کو معطر نہیں کیا، صبح کھلتے ہوئے سبزے نے ان کی آنکھوں کو تازگی نہیں بخشی، وہ صبح جلدی جاگیں تو یہ نعمتیں اُن کو نصیب ہوں۔ ہمارے اردگرد کتنے ہی رنگ ہیں، کس قدر خوشبوئیں ہیں، کتنی آوازیں ہیں، کتنے ذائقے ہیں جن سے ہم کبھی لطف اندوز نہیں ہو سکے۔ یہ سب مناظر اور ان کی خوبصورتی آپ کو حفیظ شاہد کے کلام میں محسوس ہوگی، وہ فطرت سے نہ صرف خود محبت کرتے ہیں بلکہ ہمارے دلوں میں بھی فطرت کی محبت اور اس کا احترام پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے دل میں پرندوں کے لیے مشفقانہ اور درختوں کے لیے ہمدردانہ احساسات ہیں۔ وہ فطرت کے سرمایے کو بچانے اور اس کو بڑھانے کی بات کرتے ہیں۔

(۵) سیاسی منظر نامہ:

غزل میں براہِ راست کسی واقعے کو پیش کرنا بہتر خیال نہیں کیا جاتا۔ اس کی خوبصورتی اس بات میں سمجھی جاتی ہے کہ آپ ڈھکے چھپے انداز میں بات کریں۔ کسی شخص کا نام لے لینا، کسی شہر کا تذکرہ دینا، کسی تاریخی واقعے کو اعداد و شمار کے ساتھ غزل میں لے آنا، عموماً غزل والوں کو شیوہ نہیں۔ حفیظ شاہد کا پہلا مجموعہ ''سفر روشنی کا'' ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ظاہر ہے اس میں مذکورہ سال اور اس سے پہلے کا کلام موجود تھا۔ اور ان کا چھٹا مجموعہ ''سورج بدل رہا ہے'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس دوران ہمارے سیاست دانوں کا، قومی رہنماؤں کا، ہمارے ساتھ جو سلوک رہا ہے، اور ہمارے ملک کے سیاسی منظر نامے میں جو اہم تبدیلیاں آئی ہیں اس کا مجموعی تاثر آپ کو حفیظ شاہد کی اس عرصے میں کی ہوئی شاعری میں ضرور ملے گا۔ کہیں کہیں واضح اشارے بھی موجود ہیں۔

(۶) دہشت گردی کی مذمت:

حفیظ شاہد نے ہر طرح کے دہشت گردی کی مذمت کی ہے۔ ان کے مطابق قتل و غارت، ملتہم مزاجی، جنگ جوئی، لڑائی جھگڑے، مخالفت یہ سب انسانی معاشرے کے قاتل ہیں۔ ان کے یہاں ان سب پہ کڑی تنقید اور ان سے نجات پانے کے لیے واضح لائن آف ایکشن موجود ہے۔ وہ ان سب عناصر کا کڑا احتساب کرنے کی

خواہش رکھتے ہیں۔ وہ ان سب مذموم روّیوں کے مقابلے میں ایک ایسے انسان کا رول ماڈل پیش کرتے ہیں جو کسی کی گالی پہ بھی چُپ رہے، اور منہ سے کوئی بُرا لفظ تک نہ نکالے۔ وہ ایک ایسے انسان کی بات کرتے ہیں جو انسانیت کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے دشمنوں سے بھی نفرت نہ کر سکے۔ جسے اس دنیا کے سب انسانوں سے پیار ہو۔

☆☆☆

مستقبل کا صُورت گر... حفیظ شاہد

اُس کی قربت بہار دیدہ و دل.... اُس کی دُوری خزاں کا موسم ہے... (حفیظ شاہد)

آج ہم اُس عظیم ہستی کا تذکرہ کرنے جا رہے ہیں۔ جن کے جانے سے پیدا ہونے والا خلا تو صدیوں پُر نہیں ہو سکتا۔ مگر جو سرمایہ ہمارے لیے شعر کی شکل میں چھوڑ گئے ہیں، وہ نعم البدل اور بے مثال ہے۔ حفیظ شاہد نے اپنے ہم عصر شعراء اور ناقدین سے بجا طور پر داد و تحسین پائی۔ جن میں عبادت بریلوی، عارف عبدالمتین محسن نقوی، ڈاکٹر وحید قریشی، آغا سہیل، شبنم رومانی اور سہیل اختر وغیرہ شامل ہیں۔ حفیظ شاہد نے ہمیشہ بہار، خوشی اور نعمتوں کی بات کی۔ وہ ہمیشہ تابناک مستقبل کی صورت گری میں مشغول رہے۔ حفیظ شاہد عمر کے آخری حصے تک شعر کہتے رہے۔ گوہر ملسیانی حفیظ شاہد کے کلیات ”ختم سفر سے پہلے“ میں رقم طراز ہیں ’جدید غزل کو زندہ اُسلوب دے کر بامِ عروج تک پہنچانے میں جن شعرائے کرام نے گلستان جذبہ و خیال سجایا ہے اور اِظہار و بیان میں رنگا رنگ پھول کھلا کر انفرادیت کا روپ دکھایا ہے، حفیظ شاہد ان میں سر و قد ہیں‘۔

حفیظ شاہد نے 2007ء سے خان پور سے جاری ہونے والا علمی و ادبی رسالہ ”بچے من کے سچے“ کے چیف ایڈیٹر کی ذمہ داری ادا کرتے رہے۔ ”بچے من کے سچے“ کی ٹیم کے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ ”بچے من کے سچے“ اور ادبی و ثقافتی تنظیم ”الوحید ادبی اکیڈمی“ خان پور کی سرپرستی فرمائی۔ ہمیشہ اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔

☆☆☆

تحقیق و ترتیب: سعدیہ وحید

حفیظ شاہد کا فکری و فنی سفر

حفیظ شاہد کے فن و شخصیت پر چھ شعری مجموعوں میں شامل اہلِ نقد و نظر کی آراء

سفر روشنی کا

حفیظ شاہد کا پہلا شعری مجموعہ... ''سفر روشنی کا'' (بہ ترمیم و اضافہ)

مطبوعہ: اوّلین ایڈیشن: ۱۹۸۳ء اور ترمیم و اضافہ کے ساتھ ایڈیشن ۱۹۹۹ء

کے فلیپ اور بیک سرورق پر شامل مختصر آراء

رئیس امروہوی:

☆... حفیظ شاہد کی غزلیات اُن کے خاص رنگِ سخن کی حامل ہیں۔اُن کی بعض غزلیات منفرد ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی:

☆... حفیظ شاہد کی شاعری میں رُوحِ عصر لُطف دیتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا:

☆... آپ کی غزل میں بڑی کھلی کھلی کیفیت ہوتی ہے۔آپ کا اُسلوب بھی تازہ اور دلکش ہے۔جب یہ دو باتیں غزل میں پیدا ہو جائیں تو امکانات کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ان شاء اللہ آپ اس میدان میں بہت آگے جائیں گے۔

شفیق الرحمن:

☆... حفیظ شاہد کے کلام میں ایک کھرے غزل گو کا انداز ہے۔صفائی اور برجستگی کے علاوہ تخیل میں جدّت اور فکر میں ندرت ہے۔

فاطمہ حسن:

☆... وہ اپنے نئے اُسلوب کے ساتھ اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کے لیے کوشاں ہیں۔یوں اُن کے جذبوں میں تازگی در آئی ہے۔اُن کی بیشتر غزلیں شہری زندگی کے مسائل سے متعلق ہیں۔ایسے مسائل جنھوں نے فطرت کی سچی دلکشی اور حقیقی محبت سے انسانی رابطوں کو توڑ دیا ہے۔

جیلانی کامران:

☆... حفیظ شاہد کی غزل ایک منفرد لہجے کی خبر دیتی اور ایسے منفرد لہجے کے ساتھ ہمیں ایک ایسا انسان گزرتا اور سفر طے کرتا دکھائی دیتا ہے جو ناسازگار زمانے کے نشیب و فراز میں ادراک زاد کی طلب کرتا ہے اور نایافت کے دُکھ کی بجائے یافت کی اُمید کو زادِ راہ کے طور پر قبول کرتا ہے۔حفیظ شاہد کی غزل میں ہمیں ناسازگار ماحول کی دل
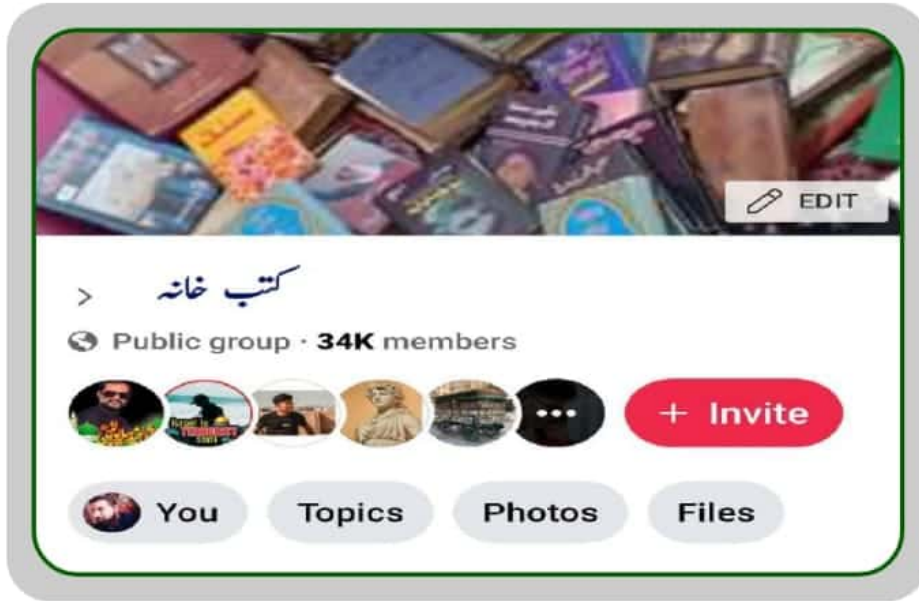
شکن صورت بھی دکھائی دیتی ہے مگر غزل کا سفر ناساز گار ماحول سے ہٹ کر گزرتا ہے اور ناساز گار ماحول کی گرفت قاری کے اعصاب کو مجروح نہیں کرتی۔ قاری ہر مقام پر روشنی کی آرزو میں ایک تجربے سے آشنا ہوتا ہے جو زندگی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا سکھاتا ہے۔ حفیظ شاہد کی غزل میں زبان اور تجربے کی ایک نئی صورت گری موجود ہے۔ حفیظ شاہد نے اس غزل کے ذریعے اپنے عہد اور اپنے ماحول کا گیت تحریر کیا ہے اور یہ گیت ایسے سفر کرنے والے انسانوں کا ہے جو سفر طے کرنے کے آرزو مند ہیں اور سفر کی تھکان جن کے ارادوں کو متزلزل نہیں کرتی ہمارے عہد کو ایسی غزل کی بہت ضرورت ہے۔ ہمارا انسان صورتِ حال کے دُکھ سے رہائی پائے اور آئندہ کے سفر میں اس روشنی کی دریافت کر سکے جس کی گہرائیوں میں اُس کا جسم اور روح کار فرما ہے۔

مظہر امام:

☆... حفیظ شاہد کی غزلیں پڑھ کر مجھے ایسا لگا کہ شاعر ایک ایسے اَن دیکھے سفر پر نکلا ہے جن کا نشانِ منزل روشنی کی وہ لکیر ہے جو جلتی بجھتی رہتی ہے۔ مجموعے کے نام پر توجہ کی تو اپنی رائے پر شاعر کی مہرِ تصدیق ثبت دیکھی۔ یہاں یہ عرض کر دوں کہ حفیظ شاہد کا سفر اپنی جگہ اہم سہی لیکن اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ اس سفر میں الفاظ کو کس طرح ہمقدم بناتے ہیں۔

وہ پیکر نگاری یا تصویر سازی کے اتنے رَسیا نہیں ہیں ان کی علامتوں کا رشتہ بھی خارجی دنیا سے پیوست ہے۔ حفیظ شاہد کی غزلوں کی ڈھلی ڈھلی ہوائیں داخل کے نہاں خانوں سے بھی گزرتی ہیں اور خارج کے کشادہ میدانوں میں بھی سفر کرتی ہیں۔

محسن نقوی:

☆... خان پور ایسے بے آب و گیاہ ادبی جزیرہ سے اِس قسم کے اَشعار کا طلوع سنگلاخ زمین کو "زم زم" کی بشارت ہے۔ حفیظ شاہد عصری تقاضوں سے آگاہ ہی نہیں اُن کا مرتب بھی ہے۔ اِس مجموعہ کی غزلیں فکر کی سبیل ہیں، وَجدان و آگہی کے نطقِ رواں کی مفتر اور جذبات و محسوسات کا آئینہ ہیں۔

بیک سرورق پر موجود نامور ادیب حفیظ الرحمٰن اَحسن کی رائے

☆... حفیظ شاہد اُن مخلصینِ غزل میں سے ہیں جو رُبع صدی سے زائد عرصے سے کشتِ سُخن کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کر رہے ہیں۔ غزل سے حفیظ شاہد کی وابستگی اور انہماک لائقِ رشک ہے' اور غزل کے ساتھ اُن کی اِس غیر متزلزل اور وفادارانہ وابستگی نے اُن کو یہ مقام بخشا ہے کہ اب اُن کو پورے اعتماد کے ساتھ اقلیمِ غزل کا اوّل درجے کا شہری قرار دیا جا سکتا ہے۔

غزل ایک ایسی زندہ اور توانا صنفِ سُخن ہے جس کی توانائی، رنگارنگی اور سحر آفرینی کو کوئی دُوسری صنفِ سُخن کم ہی پہنچتی ہے۔ اِس دَور میں عصری شعور اور جدید حسیّت کا بہت چرچا ہوا۔ لیکن اس کا حقیقی اظہار کم ہی لوگوں کے ہاں دیکھنے میں آیا۔ حفیظ شاہد اِس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ اُن کے ہاں یہ عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس طرح ان کی غزل زندگی آمیز بھی ہے اور زندگی آموز بھی۔ ماضی سے اُن کی وابستگی، حال پہ اُن کا اعتماد اور مستقبل سے اُن کی روشن توقعات اُن کو ایک ایسا حقیقت آشنا اور رَجائیت پسند شاعر بناتی ہیں جس سے ہم مستقبل کی بہت

سی توقعات وابستہ کر سکتے ہیں اور اسے اُدبی دُنیا کا ایک قیمتی اثاثہ قرار دے سکتے ہیں۔

☆

چراغِ حرف

حفیظ شاہد کا دوسرا شعری مجموعہ.... ''چراغِ حرف''

مطبوعہ: ۱۹۸۹ء کے بیک سرورق پر شامل یزدانی جالندھری کی مختصر رائے

☆... ادبی فضا سے دُور افتادہ خان پور سے ایسے شہر میں جن دو چار ہستیوں نے شعر و ادب کا پرچم بلند کیا ہے اُن میں ایک نمایاں بلکہ نمائندہ نام حفیظ شاہد کا ہے۔ ''سفر روشنی کا'' سے ''چراغِ حرف'' تک اُس نے فکر و فن کی نُو رپاش قندیلیں روشن کی ہیں۔ اس کی فکر میں تازگی اور ابلاغ میں بالیدگی۔ حفیظ شاہد کی غزل میں روایت کی پابندی اور اظہار کی جدت پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ اُنہوں نے غزل کے فنی ڈھانچے کے اندر خیالات کی رنگارنگی کو بڑی چابکدستی سے بیان کر کے غزل کو اپنے عہد کی نمائندہ غزل بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ حفیظ شاہد نے دُور از کار تشبیہات کی مُرصع کاری نہیں کی بلکہ اُس کی غزلوں میں جذبہ وخیال کی سچائی اور سادگی ہے جس نے اُس کے اشعار میں ایک رَبودگی اور گیرائی پیدا کر دی ہے اور یہی اُس کی معراجِ فن ہے۔

☆

مہتاب غزل

حفیظ شاہد کا تیسرا شعری مجموعہ.... ''مہتابِ غزل''

مطبوعہ: ۱۹۹۴ء کے فلیپ پر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (صدر شعبہ اُردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور)

کی رائے .... جدید غزل کے منفرد شاعر

☆... حفیظ شاہد خان پور ضلع رحیم یار خان میں آباد ہیں۔ بظاہر تو یہ ایک مختصر سا جملہ ہے مگر اس سے اُردو ادب کے سچے قاری کو یہ خدشہ ہو سکتا ہے کہ حفیظ سینکڑوں مضافاتی شعراء میں محض ایک اور نام کا اضافہ ہیں' لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی آسکتا ہے کہ وہ ان معدودے چند شعراء میں بھی ہو سکتے ہیں جو منفرد ہوتے ہیں مگر ذرائع ابلاغ سے دُور ہونے کے سبب زیادہ شہرت حاصل نہیں کر پاتے میں اِس قسم کے قاری کو یقین دِلاتا ہوں کہ حفیظ شاہد واقعی ایک منفرد اور خوشگو شاعر ہیں اور پذیرائی کے بجا طور پر مستحق ہیں جو اُن کا حق ہے مگر ابھی تک اپنے حق سے محروم چلے آتے ہیں۔

ان کی غزلیات کے دو مجموعے ''سفر روشنی کا'' اور ''چراغِ حرف'' شائع ہو چکے ہیں۔ اب ان کا تیسرا مجموعۂ غزلیات ''مہتابِ غزل'' منظرِ عام پر آ رہا ہے جو فکری بالیدگی اور فنی پختگی میں پہلے دونوں مجموعوں سے کسی طرح کم نہیں بلکہ بہتر ہے۔ اس لئے میں یہ چند تعارفی سطور لکھ رہا ہوں تاکہ روشنی بانٹنے والے اِس باہُنر شاعر کے کلام کی طرف قارئین متوجہ ہو سکیں اور اسے اپنے شعری مجاہدے کا صِلہ تحسین کی صورت میں حاصل ہو سکے۔ حفیظ شاہد ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی اُنگلیاں ماضی، حال اور مستقبل کی نبضوں پر رکھی ہوئی ہیں۔ وہ ماضی کی یادوں کے شاعر ہیں اور ماضی کے خوشگوار لمحوں کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ وہ حال کے شاعر ہیں۔ عہدِ حاضر میں ہم

پر بحیثیت فرد جو کچھ بیت رہا ہے، بحیثیت قوم ہم جن افسوسناک عادت سے گزر رہے ہیں اور روایات و اقدار کو ترک کر کے جس انداز میں اجتماعی خود کشی کی جانب بڑھ رہے ہیں ان سب سے واقف ہیں۔ متعدد دیگر شعراء کے ساتھ ساتھ حفیظ شاہد نے بھی ان تجربات کو اپنی شاعری میں منعکس کر کے ہر حساس شخص تک پہنچا دیا ہے۔ مگر وہ مستقبل کے بھی شاعر ہیں۔ ہر طرح کے بدترین حالات میں بھی وہ اَقدار پر غیر متزلزل یقین رکھتے ہیں۔ انہیں ملت سے والہانہ لگاؤ اور ملک سے پائیدار عشق ہے اس لئے وہ مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ حفیظ شاہد خیر کی اَقدار کے علمبردار ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ جو خصوصیت ان کی غزل کو ہمعصروں میں ممتاز کرتی ہے وہ ہے کائنات کے حُسنِ پُر اسرار کا مسلسل مشاہدہ اور اس سے لطف اندوزی... یہ اُن کی غزل کا ایک خاص رنگ ہے۔ جدید غزل نگاروں میں شاید ہی کوئی دُوسرا اِن موضوعات میں ان کا حریف ہو سکے۔

اِس قسم کے اشعار مجھے تو جدید غزل میں کم ہی دکھائی دیے ہیں ؎

اِس کتابِ وقت کے اَوراق سب اچھے لگے
باب سب اچھے لگے ، اسباق سب اچھے لگے

دیکھا جو آنکھ کھول کے منظر حیات کا
اچھا لگا کچھ اور بھی پیکر حیات کا

حفیظ شاہد غزل کے فن سے گہری آشنائی رکھتے ہیں۔ وہ تجربات کرنے سے خوفزدہ نہیں مگر اُن کے تجربات میں بے راہروی نہیں۔ وہ لفظوں کے انتخاب اور مصرعوں کی ساخت کے مزاج داں ہیں۔ اس لئے اُن کے اُسلوب میں جدّت کے باوجود ہمواری ہے اور وہ کلاسیکی اور جدید دونوں ذہنوں کے قارئین کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

☆

یہ دریا پار کرنا ہے

حفیظ شاہد کا چوتھا شعری مجموعہ ..... ''یہ دریا پار کرنا ہے''۔

مطبوعہ: ۱۹۹۹ء کے فلیپ اور بیک سرورق پر شامل مختصر آراء

☆... حفیظ شاہد کا چوتھا شعری مجموعہ ''یہ دریا پار کرنا ہے'' کا فلیپ سرورق دستیاب نہیں ہو سکا۔ لہٰذا اس حوالے سے ہمیں کوئی مواد نہیں مل سکا۔ البتہ کتاب میں شامل شبنم رومانی کی لکھی ہوئی تقریظ شامل ہے۔ جس میں تفصیل سے اُنہوں نے اس مجموعہ کا جائزہ پیش کیا ہے۔

فاصلہ درمیاں وھی ھے ابھی

حفیظ شاہد کا پانچواں شعری مجموعہ ... ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی''

مطبوعہ: ۲۰۰۴ء کے فلیپ اور بیک سرورق پر شامل مختصر آراء

پروفیسر سہیل اختر:

☆... گزشتہ چار شعری مجموعوں کی تخلیق و اشاعت سے حفیظ شاہد کے فن کو بڑی جلا ملی ہے اور نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اوّل، کے مصداق اُن کی ہر دوسری تصنیف پہلی سے مہارت و مقانت، دلبستگی اور دل گدازی کے باعث نمایاں طور پر بہتر ہوتی ہے اور اب اُنہیں شعر گوئی میں اتنا ملکہ حاصل ہو گیا ہے کہ وہ قلم برداشتہ نہایت کمال کی غزل تخلیق کر سکتے ہیں۔ غزل اور خاص طور پر خوبصورت اور دلکش غزل کہنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن شاہد اپنی مرضی کی ریاضت، عمر بھر کے مشاہدے اور مطالعے کے طفیل ایک ہی نشست میں مشکل سے مشکل زمین میں بڑی آسانی کے ساتھ آٹھ دس شعر کی غزل کہنے پر قادر ہیں۔ اور قدرت دیارِ شعر میں اتنی عام نہیں۔ جن معدودے چند شاعروں نے رومانویت اور کلاسیکیت کے ساتھ ساتھ جدّت کو اپنایا ہے اور اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ ان میں بڑے اعتماد سے حفیظ شاہد کا نام لیا جا سکتا ہے۔ الفاظ کا جدید انداز میں استعمال ہو کہ منفرد و مرکب تراکیب (مثلاً نصیبوں کی سیپیاں، شکارِ لشکرِ آفاتِ روزگار، مصدرِ نور و ضیا، پیامِ موسمِ گل، سرِ شہرِ ملامت، چراغِ وجودِ انساں وغیرہ) تشبیہیں ہوں کہ رُموز و علائم حفیظ شاہد کے اشعار میں ان سب کی قدم قدم پر جلوہ نمائی نگاہوں کو خیرہ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ لفظوں کے بہت بڑے پارکھ ہیں اور ان کے استعمال کا خوبصورت قرینہ اور سلیقہ اُن کے اظہار و بیان کا جزوِ لاینفک بن گیا ہے۔

ڈاکٹر شفیق احمد (صدر شعبہ اُردو و اقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور)

☆... میں نے حفیظ شاہد کا جس قدر کلام دیکھا ہے اور اُن کے جتنے مجموعے میری نظر سے گزرے ہیں' ان کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ہاں نہ اُسلوب کے حوالے سے کوئی مشکل پسندی ہے اور نہ ہی خیالات کے حوالے سے اُلجھن پیدا کرنے والی کوئی ایسی بات جو قاری کے لئے لاینحل ہو۔ حفیظ شاہد مختصر اور لمبی دونوں طرح کی بحروں میں کامیابی سے غزلیں کہتے ہیں بلکہ مشکل اور طویل ردیف بھی اُن کی مہارت کے سامنے پانی ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل غزلیں ملاحظہ فرمائیں:

بارِ غم و اَلم سے کہیں چھت نہ گر پڑے
ڈرتا ہوں یہ بدن کی عمارت نہ گر پڑے

ہمیں نصیب کرے گھر کہ راہ میں رکھے
وہ جس مقام پہ رکھے' نگاہ میں رکھے

ہر رنگِ خوب وزشت ہے میری نگاہ میں
انسان کی سرِشت ہے میری نگاہ میں

جہاں تک فن کی بات ہے تو حفیظ شاہد بہت اچھے فنکار کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کا کلام' روزمرہ اور محاورہ' تشبیہ و استعارہ، مجاز مرسل و کنایہ اور جملہ صنائع شعری و معنوی سے مزّین ہوتا ہے۔ ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' میں تاریخی قطعات بھی شامل ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس فن کے حوالے سے اس وقت بہاول پور ڈویژن میں حفیظ شاہد کے علاوہ اور کوئی شاعر نظر نہیں آتا۔ اللہ ان کا سایہ اُردو شاعری پر تادیر قائم رکھے۔

سورج بدل رہا ہے

حفیظ شاہد کا چھٹا شعری مجموعہ... "سورج بدل رہا ہے"
مطبوعہ: ۲۰۰۸ء کے فلیپ پر شامل مختصر آراء

اظہر جاوید:

☆... شعر کہہ لینا یا قافیہ پیمائی کر لینا کوئی کمال نہیں۔ ذرا سی موزوں طبیعت ہو تو مصرے اور شعر اُبل ہی آتے ہیں۔ سوچ اور فکر میں گندھے ہوئے اور احساس اور کرب میں رچے ہوئے شعر کہنا اور انہیں سلیقے سے پیش کرنا، اصل خوبی ہے اور شعر اور شاعر دونوں کی محبوبی ہے۔ حفیظ شاہد پختہ گو اور سلجھے ہوئے شاعر ہیں۔ اُن کے ہاں جذبے کی فراوانی ہے مگر شعور کی جولانی کے ساتھ۔ وہ اردگرد کے حالات کو، معاشرے کے معاملات کو اور دل پہ گزرنے والی واردات کو مشاہدے کی بھٹی میں تپا کر غزل کا رُوپ دیتے ہیں۔ تغزل کی چاشنی اور اظہار کی رسیلی کیفیت کے ساتھ۔ اُن کا شاعری میں کیا مقام اور مرتبہ بنتا ہے، یہ تو کوئی نقاد ہی میزان پر رکھے اور فیصلہ رکھے گا ۔ مگر مجھے یقین ہے اصل فیصلہ وقت کا ہوتا ہے۔ وہی چاہتا اور سراہتا ہے اور جس درجے پر رکھتا ہے، وہی اعلیٰ اور ارفع ہوتا ہے۔ حفیظ شاہد اُسی رفعت اور بلندی کو چھو کر شعر و ادب کی سربلندی تک پہنچ چکے ہیں۔ وہ یاد کیے جانے والے اور یاد رہ جانے والے شاعر ہیں۔

☆

ختم سفر سے پہلے

حفیظ شاہد کا کلیات... "ختمِ سفر سے پہلے"
مطبوعہ: ۲۰۱۰ء کے بیک سرورق پر شامل مختصر رائے

ڈاکٹر محمد علی صدیقی:

☆... حفیظ شاہد اپنے تازہ ترین شعری مجموعے میں اپنی منفرد انداز کی شاعری کے نقطۂ عروج پر ہے۔ ان کی غزل گوئی جدید عہد کی تازگی اور ڈرامائی کیفیتوں کے ساتھ کلاسیکی شاعری کے محاسن سے مزین ہے اور اپنے قارئین کے ذہنوں پر خوشگوار تحیر کے احساسات مرتب کرتی ہے۔ حفیظ شاہد اپنے دَور کے بیشتر ناقدین سے بجا طور پر داد و تحسین پا چکے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ وہ اپنے عصروں کی پذیرائی کے حقدار ہیں۔ میرے خیال میں حفیظ شاہد کی شاعری کا وصفِ خاص یہ ہے کہ اُنہوں نے لشکرِ آلام سے کبھی شکست نہیں کھائی اور وہ بڑی استقامت کے ساتھ موسمِ گل کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

شاعری خواب دیکھنے اور دکھانے ہی کا نام ہے اور حفیظ شاہد کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ وہ دِگرگوں حال میں بھی سنہرے مستقبل کی صورت گری میں مشغول ہیں اور انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ناگفتہ بہ حالات میں بھی شاعری اور فنون اپنا وظیفہ ادا کرتے رہتے ہیں۔

☆☆☆

*مظہر عباس (خیر پور ٹامے والی)

حفیظ شاہد... فن و شخصیت

محاکمہ مقالہ ایم فل اُردو، سال ۲۰۰۵ء

حالؔی سے پہلے کلاسیکی اُردو شاعری کی روایت کا مجموعی مزاج حسن و عشق، زلف و رُخسار اور عشوہ غمزہ کا اُسیر تھا۔ اگر چہ دردؔ نے تصوف اور زندگی کی بے ثباتی جیسے موضوعات، میرؔ نے دل اور دل کا نوحہ اور غالبؔ نے فکری عنصر سے اس روایت کا دامن وسیع کیا لیکن مجموعی حوالے سے اُردو شاعری حسن و عشق کے موضوعات کے گرد گھومتی رہی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد اُردو شاعری اور خصوصاً غزل کوچۂ جاناں سے نکل کر آہستہ آہستہ زندگی کے تلخ حقائق کا اظہار بنی۔ سائنس، فلسفہ اور نفسیات جیسے علوم کی ترویج نے غزل کے موضوعات کو بہت حد تک بدل دیا۔ عورتوں سے گفتگو اور عورتوں کی گفتگو تک محدود غزل نے زندگی کے تلخ حقائق سے مکالمہ کرنا سیکھا۔ غزل گو شاعروں نے انسان کے جذبات اور داخلی پیچیدگیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال کو اشعار میں پیش کیا۔ حفیظ شاہد کا شمار بھی ان غزل گو شاعروں میں ہوتا ہے جنہوں نے فرد کے داخل اور خارج کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔

حفیظ شاہد کا شمار اُن لوگوں میں نہیں ہوتا جو منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے زندہ رہنے اور معاشرے میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے لیے بہت جدوجہد کی اس لیے زندگی اور اس کی تمام تر سچائیاں خود بخود ان کی شاعری میں جگہ بناتی گئیں۔ نچلے اور متوسط طبقے کے افراد کی مشکلات اور تکالیف طبقاتی نظام اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم، مفاد پرست سیاست دان اور مقتدر طبقہ کی من مانیاں یہ وہ موضوعات ہیں جو اُن کی شاعری میں عصری صورتحال کی عکاسی کا باعث بنتے ہیں۔ اُنہوں نے کسی تعصب یا جانبداری سے ہٹ کر جذباتیت کا شکار ہوئے بغیر عہدِ حاضر کی تصاویر پیش کی ہیں اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حفیظ شاہد کی شاعری جدید عصری حسیت کی حامل ہے۔

محبت ایسا موضوع ہے جسے اُردو غزل سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ غزل اور محبت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ہر دَور میں اُردو شعراء نے محبت اور اس کی کیفیات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ حفیظ شاہد کی شاعری میں محبت دھیمی لَے کی طرح تال دیتی نظر آتی ہے۔ حفیظ شاہد مزاجاً دھیمے اور وضع دار انسان ہیں اس لیے اُن کی شاعری سے عاشق کا جو کردار اُبھر کر سامنے آتا ہے وہ بھی محبت میں وضع داری کا قائل ہے۔ اسے کسی صورت میں بھی محبوب کی رسوائی گوارا نہیں۔ حفیظ شاہد کے ہاں محبت تجربے کے بجائے کیفیت کا نام ہے۔ ان کے ہاں لمس کا احساس نہیں ہے بلکہ محبت جذبے اور Inspiration کا کام دیتی ہے۔ وہ اس جذبے سے تخلیقی توانائی حاصل کر کے زندگی کی مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ حاصل کرتے ہیں۔

حفیظ شاہد کی شاعری میں وطن سے محبت کا گہرا رنگ موجود ہے۔ عموماً شعرا بڑے سرکاری اداروں کی مالی معاونت اور ایوارڈ حاصل کرنے کی غرض سے ملی نغمے، یومِ تکبیر کے گیت، قائدِ اعظم اور علامہ اقبالؒ جیسے قومی شخصیات پر شاعری کے مجموعے شائع کراتے ہیں۔ حفیظ شاہد کی شاعری میں وطن سے محبت کا گہرا نقش موجود ہے۔ یہ نقش کسی فیشن یا مفاد پرستی کی عطا کردہ نہیں۔ وہ ایک سچے محبِ وطن پاکستانی کی حیثیت سے اس سرزمین وطن کے چپے چپے سے محبت کرتے ہیں۔

حفیظ شاہد نے اپنے خیالات، تجربات اور مشاہدات کو بے کم و کاست، نیز کسی مصلحت یا ریاکاری کے بغیر بیان کر دیا ہے۔ انہوں نے دقیق فلسفیانہ خیالات کو شاعری میں بیان نہیں کیا۔ ان کے خیالات بہت واضح ہیں اس لیے اُن کی شاعری میں ابہام کی کیفیت نظر نہیں آتی۔ ہر خیال زندگی سے جڑا ہے اور کسی سماجی صورتِ حال کی عکاسی کر رہا ہے اس لیے قاری کے لیے خیال اور طرزِ اَدا میں پیچیدگی نہیں۔ مولانا حالی شاعری کے لیے سادگی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ حفیظ شاہد کی شاعری مولانا حالی کے اس تصور پر پوری اُترتی ہے۔ مولانا حالی شاعری کو سماج کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اچھی شاعری کے لیے ضروری ہے کہ وہ سماج کے لیے بہتری کا باعث ہو۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو حفیظ شاہد کی شاعری میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو سماج کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے جدید سماج میں شکست و ریخت کا شکار روایات اور مفاد پرست حکمرانوں کے رویّوں پر طنز کیا ہے۔

حفیظ شاہد وضع دار اور دھیمے مزاج کے انسان ہیں۔ وہ معاشرے میں بہتری کے خواہش مند ہیں لیکن ان کی شاعری میں کہیں بھی انقلاب کا ذکر نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ خون آشام انقلاب کے ذریعے آنے والی اچانک تبدیلی دیرپا ثابت نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ داخلی انقلاب کے خواہاں ہیں جو انسانی رویّوں کی تبدیلی سے ہی ممکن ہے اس لیے وہ اپنی شاعری کے ذریعے اعلیٰ اخلاقی اقدار کی ترویج کر رہے ہیں۔

شاعر جو کرنا، دیکھنا اور سننا چاہتا ہے اُس کا شعوری یا غیر شعوری طور پر اظہار کر جاتا ہے۔ حفیظ شاہد روایتی طرز کے پابند شرع مسلمان نہ سہی لیکن مذہب اور خدا پر اُن کا یقین کامل ہے۔ اُن کے خیال میں انسان کو چاہیے کہ اچھا سوچے، اچھا کرے اور اچھے نتائج کے لیے خدا کے حضور دُعا گو ہو۔ اس لیے شب بیداری اور دُعائے نیم شبی جیسے موضوعات اُن کی غزل میں نظر آتے ہیں جو کہ اُردو غزل کی روایت میں نہ ہوتے کے برابر ہیں۔ رندی اور سرمستی جو اُردو غزل کا لازمی جزو سمجھی جاتی ہے اُن کی غزل میں نظر نہیں آتی۔ یہ ایسا رویّہ ہے جو اُردو غزل کی عمومی روایت سے ہٹا ہوا ہے۔

چار برس کی عمر میں والد کی وفات کے بعد حفیظ شاہد کو والدہ کے ہمراہ اپنے ماموں کے ہاں چک نمبر ۲۴۷ گ ب جانا پڑا۔ بڑے بھائی میاں عبدالعزیز کی ملازمت تک حفیظ شاہد کو کئی مرتبہ والدہ کے ہمراہ لاہور اور فیصل آباد کا سفر کرنا پڑا۔ اس طرح ''سفر'' ان کے لاشعور میں رچ بس گیا۔ پھر ۱۹۷۶ء میں انہیں معاش کے سلسلے میں لاہور سے ہجرت کر کے خان پور آنا پڑا۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ سفر اُن کی شاعری میں بڑا تخلیقی تجربہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ''سفر'' کا استعارہ زندگی کی تگ و دو اور معاشی بھاگ دوڑ کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ مجموعی

حوالے سے زندگی میں انسانی ارتقاء کی عکاسی کر رہا ہے۔ ذات سے شروع ہونے والا سفر ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' تک آتے آتے انسان، کائنات اور وقت کی داستان رقم کرتا ہے۔ چوتھے مجموعے ''یہ دریا پار کرنا ہے'' تک آتے آتے شاعر کے ہاں صیغہ واحد متکلم کا استعمال زیادہ ہوا ہے۔ یہاں ''میں'' سے مراد شاعر نہیں بلکہ ایسا کردار ہے جو زندگی کے حوالے سے اپنے تجربات اور مشاہدات سے اخذ شدہ نتائج بیان کر رہا ہے۔ جدید شاعری میں ہمیں کردار سازی کا عمل نظر آتا ہے۔ یہی کردار زندگی کی بوقلمونیوں کو بیان کرتے ہیں۔ حفیظ شاہد کی شاعری میں بھی واحد متکلم ایسا ہی کردار ہے جو زندگی کا شاہد بھی ہے اور راوی بھی۔

اُردو شاعری کی تاریخ شاہد ہے کہ ہر دَور میں کچھ شاعر ایسے ہوتے ہیں جو شاعری کو نئے تناظرات سے آشنا کرتے ہیں۔ وہ نئے موضوعات سے شاعری کا دامن وسیع کرتے ہیں اور ان موضوعات کو بیان کرنے کے لیے بیان کے نئے اسالیب وضع کرتے ہیں اس سلسلے میں ولی، میر، درد، غالب، مومن، اقبال، فیض، ناصر کاظمی اور مجید امجد جیسے شاعروں کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے ہزاروں شعراء ہیں جنہوں نے ان رُجحان ساز شاعروں کی تخلیق کردہ روایت شعر کو استحکام عطا کیا۔ حفیظ شاہد کا نام بھی اُنہی شعرا میں شامل ہے جنہوں نے اُردو شاعری کے فنی اور فکری اسالیب کو استحکام عطا کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُن کی شاعری کی کوئی اہمیت نہیں۔ اُن کی شاعری کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ عہدِ حاضر میں حفیظ شاہد کی آواز اپنی پہچان رکھتی ہے۔ وہ ایک صاحبِ اُسلوب اور زندہ شاعر ہیں جو اپنے ہم عصر شعرا میں الگ اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ حفیظ شاہد کا شعری مقام و مرتبہ متعین کرنے میں اُن کا ایک شعر بہت اہمیت کا حامل ہے:

گر مری تقریر میں جدت نہیں تو کیا ہوا
میرے لفظوں پر نہ جا تو معنی و مفہوم دیکھ

☆☆☆

(تحقیقی مقالہ ''حفیظ شاہد... فن و شخصیت'' برائے ایم فل اُردو،
مظہر عباس، لیکچرر گورنمنٹ ڈگری کالج
خیر پور ٹامے والی نے سال ۲۰۰۵ء میں مکمل کیا)

☆☆☆

ڈاکٹر ارشد ملتانی

حفیظ شاہد اور "سفر روشنی کا"

جدید اُردو غزل کا آغاز بالعموم بڑے شہروں اور بڑے ادبی مراکز سے ہوا لیکن طرزِ احساس کی یہ جدت اور اُسلوب کا یہ نیا پن جلد ہی اپنی دلکشی کی بدولت دُور دُور تک پھیل گیا۔ اور اب کیفیت یہ ہے کہ بڑے ادبی مرکز شاید پہلے کی طرح سرگرم نہ ہوں لیکن ان مراکز سے وہ جو غزل پنپ رہی ہے وہ حقیقی معنوں میں جدید بھی ہے اور ندرت آفرین بھی۔

یہ درست ہے کہ غزل کا نیا شعور خام یافتہ میں ذہنوں کی دسترس میں نہیں آتا۔ اس نایاب جوہر کو گرفت میں لانے کے لیے مسلسل ذہنی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وقت اور حالات کی تیز رفتاری نے جس طرح صدیوں کے فاصلے لمحوں میں طے کرنے کے وسیلے پیدا کر دیے ہیں اسی طرح فطری عروج اور ذہنی ارتقاع کے حصول کے پہلے سے بھی اب نسبتاً آسان ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب شہروں کی بجائے دیہات میں رہنے والا انسان بھی اگر کوشش کرے تو آسانی سے ذہنی ریاضت کے مراحل طے کر لیتا ہے۔

غزل ویسے بھی ایک دلکش اور دل آویز صنفِ سخن ہے اس کی لطافتیں نسبتاً زیادہ تیزی سے فکر اور خیال میں گھر کر لیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ آج کا باشعور شاعر اس صنف سخن سے زیادہ سے زیادہ اپنی وجدانی صلاحیتوں کا اظہار کر رہا ہے۔ غزل کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جو بات کسی ذریعہ اظہار سے ممکن نہ ہو غزل کی رمزیت اور اشاریت آسانی سے اور زیادہ خوبصورتی سے اس کا بیان کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے جدید غزل کا یہ نمایاں پہلو غالباً سب سے زیادہ اس کے توانا اور مطلوب ہونے کا بنیادی سبب ہے۔ ضمناً آج کا شاعر اپنے اختیاری سانچوں میں اسے اوّلیت دینے پر مجبور ہے۔ جدید غزل کی ایک نمایاں مثال ہمارے سامنے حفیظ شاہد کے مجموعہ کلام "سفر روشنی کا" کے روپ میں ہمارے سامنے ہے اس خوبصورت مجموعہ کلام سے حظ اُٹھانے کے بعد سب سے پہلے جو سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ آخر نئی غزل کا وہ کون سا سانچہ ہے جس کو سامنے رکھ کر اسے پرکھا جا سکتا ہے۔ یہ سوال نئی غزل کے لیے بحیثیت مجموعی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیا چند الفاظ ٹانک دینے سے غزل جدید ہو جاتی ہے؟ میرا خیال ہے نہیں۔ غزل کو جو شے جدید بناتی ہے وہ بات کا وہ انداز ہے جو لفظوں، علامتوں اور استعاروں کو جدید طرزِ احساس اور نئے تناظر میں نئی مقصدیت عطا کرتا ہے۔ بے شک یہ جدید اُسلوبِ نگارش حفیظ شاہد کے فنی تجربوں میں ایک نئی انفرادیت کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ سفر روشنی کا میں ہمیں زندگی کے انوکھے فلسفے اور بے معنی لفظ گری کا گورکھ دھندا نظر نہیں آتا اس کے برعکس صاف ستھرے اور سادہ انداز میں شاعر اپنی ذہنی کیفیتوں کو شعر کے لباس میں لے آیا ہے۔ حفیظ شاہد مشکل ترکیبوں، ثقیل الفاظ کا دلدادہ نہیں ہے اس کے اُسلوبِ سخن کی بنیادی صفت ہی یہی ہے کہ وہ آسان مصرعوں اور سادہ شعروں میں اپنے دل کی بات

کہہ دیتا ہے۔

''سفر روشنی کا'' کی اکثر غزلیں شاعر کے جس کرب کو شدت سے بیان کرتی ہیں وہ سفر کی پیاس اور شہر میں رہتے ہوئے اپنے گاؤں کی یاد، سفر کا استعارہ کئی جہتوں اور مفعولیتوں کے ساتھ اُبھرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سفر کسی خاص تجربے کی شکل میں شاعر کی ذات کا حصہ بن گیا ہے سفر سے شاعر کی ذہنی وابستگی اتنی زیادہ ہے کہ گھر سے بھی اس کا تعلق بے نام سا رہ گیا ہے جو کہ زندگی کا سب سے بڑا محور ہے ۔

رغبت مجھے رہی ہے ہمیشہ سفر کے ساتھ
مجھ کو ہے اک تعلق بے نام گھر کے ساتھ

اس طرح شاعر کا شہری تجربہ بھی گونا گوں شکلوں میں سامنے آتا ہے وہ رہتا شہر میں ہے لیکن گاؤں کی معصوم یادیں اس کو ہر وقت کھینچتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ اگر شاعر کو شہر اچھا لگتا ہے تو اس وجہ سے کہ گاؤں کے لوگ اسے یہاں مل جاتے ہیں ۔

شہر سے یونہی مجھے پیار نہیں ہے شاہدؔ
شہر میں لوگ بھی رہتے ہیں مرے گاؤں کے

(بشکریہ: سات ادیب (ایک گوشہ حفیظ شاہد کیلئے) مجلسِ مشاورت: حیدر قریشی، فرحت نواز، مرتب: سعید شباب، جدید ادب پبلی کیشنز خان پور، اشاعت: ۱۹۸۶ء۔ ص: ۱۷۶)

☆☆☆

کلام حفیظ شاہدؔ

یہ روشنی جو ابھی کم دکھائی دیتی ہے
یہی حریفِ شبِ غم دکھائی دیتی ہے

یہ تیری یاد کی لَو ہے کہ ہے کرن کوئی
سرِ خیال جو پیہم دکھائی دیتی ہے

دکھائی دیتا ہے نظمِ جہانِ دل برہم
تری نگاہ جو برہم دکھائی دیتی ہے

یہ کس کی ذات، جمالِ حیات میں ڈھل کر
شریکِ محفلِ عالم دکھائی دیتی ہے

کلی یہ کس مقام پہ لے آئے ہیں تجھے
شہیدِ تشنگیِ موسم دکھائی دیتی ہے

حالات کلی مری امید کے گلستاں کی
کہ تیری آنکھ بھی پُرنم دکھائی دیتی ہے

بہشت اُس کے لئے ہو تو ہو، ہمیں شاہدؔ
حیات ، ایک جہنم دکھائی دیتی ہے

☆☆☆

حسن اکبر کمال (کراچی)

تازہ دم اور تازہ کار شاعر.... حفیظ شاہدؔ

آج کی اُردو شاعری عصر جدید کی تیزی سے بدلتی ہوئی اور لحہ بہ لحہ نئی صورت میں ڈھلتی ہوئی کیفیات اور مناظر کا اظہار وانکشاف سے آشنا کرنے کا فریضہ پہلے سے کہیں زیادہ پہلو دار اور مؤثر پیرائے میں ادا کر رہی ہے۔ خاص طور پر غزل نے جس کے (Diction) اور امن کو روایتی طور پر محدود کیا جاتا رہا ہے۔ حیرت انگیز وسعت اور دسترس کا مظاہرہ کیا ہے۔ غزل نے زندگی کی معنویت انسان کی نفسی اور وجدانی تہہ داریاں، جدید سائنس اور معاشرت اقتصادیات اور سیاسات کے نازک ترین مسائل اپنے اندر سمو کر اپنی فراخ دامانی کا ثبوت فراہم کر دیا ہے اس سلسلے میں ہمارے عہد کے جدید غزل گو شعراء کا (Contribution) قابل توجہ ہے اور لائق ہزار ستائش بھی!

حفیظ شاہد تازہ دم، تازہ خیال اور تازہ کار شعراء کے اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام ''سفر روشنی کا'' خود ان کی خلاقانہ صلاحیتوں کا اشاریہ ہونے کے ساتھ ساتھ غزل کے ہمہ جہت امکانات کا اشاریہ بھی ہے۔ حفیظ شاہد کا لہجہ انفرادیت کی جھلک رکھنے کے باوجود ابھی اپنے عہد کے دیگر جواں سال شعراء سے بہت زیادہ الگ نہیں ہے یہ ان کے لیے تشویش کی بات نہیں ہونی چاہیے اس لیے کہ لہجہ اور اسلوب تراشنے کی ریاض ایک عمر چاہتی ہے۔ ویسے رسمِ دنیا تو یہی ہے کہ ہر شعر لکھنے والے کو منفرد اُصول اور لہجے کا سخنور کہہ دیا جائے حالانکہ صاحب اُسلوب ہونا کچھ ایسا سہل نہیں ہے۔ ذرا پلٹ کر اردو کی کلاسیکی شاعری پر نگاہ ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ صفِ اوّل کے انگلیوں پر گنے جانے والے سخنوروں میں صاحب طرز کم ہی ہوئے۔ مثلاً میر، مصحفیؔ اور نظیر یا پھر اقبال، یگانہ، فیض، ظفر اقبال وغیرہ۔ آپ ممکن ہے چند اور نام بھی شامل کریں مگر آپ کو خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ لوگ اس لیے صاحبانِ طرز ہیں کہ آپ ان میں سے کسی کا بھی شعر ان کے نام کے بغیر پہچان سکتے ہیں۔ ظفر اقبال کے بعد کی نسل جس میں حفیظ شاہد بھی شامل ہیں، ابھی اپنا اُسلوب اور لہجہ تراشنے کے عمل سے گزر رہی ہے۔ حفیظ شاہد پیکر تراشی کی فطری صلاحیت اور جمالیات کے نکھرے ہوئے ذوق کے مالک ہیں ان کے کلام اسے جا بجا اس کا اظہار ہوتا ہے اس شاعری میں زندگی کے فکری مسائل کی ایسی فلسفیانہ تشریح و توضیح نہیں ملتی جو شعر کی لطافت اور احساس کی نزاکت بوجھ بن جائے۔ حفیظ شاہد ان مسائل سے بے خبر ہیں نہ لاتعلق مگر وہ شاعر ہونے کے منصب پہچانتے ہیں اسی لیے فکری مسائل ان کے یہاں احساس میں رچ بس کر یا اظہار پاتے ہیں کہ ذہن سے دل کی گہرائی تک روشنی کی ایک لکیر سی کھینچتے چلے جاتے ہیں۔ حفیظ شاہد کی غزل ہماری جدید غزل کے سرمائے میں خوشگوار اضافہ شاعری کے نئے امکانات سے معمور صلاحیتوں کی عکاس ہے۔

(بشکریہ: سات ادیب (ایک گوشہ حفیظ شاہد کیلیے) مجلسِ مشاورت: حیدر قریشی، فرحت نواز، مرتب: سعید شباب، جدید ادب پبلی کیشنز خان پور، اشاعت: ۱۹۸۶ء۔ ص: ۱۷۴)

مظہر عباس

حفیظ شاہد کی کتب کا مختصر تعارف

''سفر روشنی کا'' کا تعارف

حفیظ شاہد کے پہلے شعری مجموعے کا نام ''سفر روشنی کا'' ہے۔ اس مجموعے کو ادارہ مطبوعاتِ اَدوار خان پور نے جولائی ۱۹۸۳ء میں فنون پریس لاہور سے شائع کیا ہے۔ اس مجموعے کا سرورق بشیر موجد نے تیار کیا ہے۔ فلیپ پر جیلانی کامران، ایوب رومانی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کی آراء بھی ہیں۔ حفیظ شاہد نے اس مجموعے کا انتساب اپنے عزیز بھائی ''غلام قادر آزاد'' کے نام کیا ہے۔ ''سفر روشنی کا'' کا مقدمہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے تحریر کیا ہے جو چار صفحات پر پھیلا ہے۔ عارف عبدالمتین کا مضمون بعنوان ''جدید اساسی عناصر پر استوار، ہمہ جہت غزل نگاری کا پرمایہ صحیفہ'' بھی اس شعری مجموعہ میں شامل ہے۔ یہ مضمون صفحہ نمبر ۸ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ نمبر ۱۴ پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں شامل غزلوں کی تعداد ۱۷، صفحات کی تعداد ۱۵۲ اور کل قیمت ۲۰ روپیہ سکہ رائج الوقت ہے۔

''سفر روشنی کا'' روایت اور جدت کا حسین امتزاج ہے۔ اس شعری مجموعے میں حفیظ شاہد زندگی کو کُل کی حیثیت میں دیکھتے ہیں۔ وہ نہ تو ماضی پرستی کا شکار ہیں اور نہ ہی جدیدیت کے نام پر روایت شکنی کو پسند کرتے ہیں۔ وہ ماضی اور حال کو ایک کڑی میں جوڑ کر شاندار مستقبل کا خواب دیکھتے ہیں۔ اس لیے سفر کا استعارا حفیظ شاہد کی غزل میں اَساسی معنویت کا حامل ہے۔ حفیظ شاہد کا شعر جذبہ اور شعور کے امتزاج سے تخلیق پاتا ہے۔ اس مجموعے کے اشعار جہاں جذبات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں وہاں عصری حسیت شاعر کے سیاسی، سماجی اور معاشی شعور کی دلیل ہے۔ عہدِ جدید میں صنعتی ترقی کے ساتھ ہی دیہات سے شہر کی طرف انسانی ہجرت، اس بے ہنگم ہجرت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل اور اخلاقی شکست و ریخت کی داستان اس شعری مجموعے میں موجود ہے۔ اعلیٰ شاعری کی تخلیق میں مشاہدہ اور مجاہدہ دو اہم محرک ہوتے ہیں۔ یہ مجموعہ مشاہدے اور مجاہدے کا تخلیقی امتزاج ہے۔ اس لیے اس شعری مجموعے میں شاخ، شجر، گھروں کی دیواریں، پرندوں کی اڑانیں اور ان کی بولیاں، سڑکوں کی روشنی اور اس کے اشارے، شہروں، دیہاتوں، قصبوں، گھروں، تناور درختوں، میدانوں اور سبزہ زاروں کی تصاویر نئی معنویت اور نئی جمالیات کا اظہاریہ بنتی ہیں۔ عام انسان زندگی کے مصائب کے ہاتھوں ہراساں ہے۔ ایسے میں تخلیق کار اور خصوصاً شاعر کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اُمید کی ایک کرن ضرور روشن رکھے۔ حفیظ شاہد کے اس غزلیہ مجموعے میں رجائیت کے حامل اشعار مل کر روشنی کے اس سفر کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

مجھ کو ہے اک تعلقِ بے نام گھر کے ساتھ — رغبت مجھے رہی ہے ہمیشہ سفر کے ساتھ

لوگ اپنے آپ سے برہم ملیں گے شہر میں — زندگی سے مطمئن تو کم ملیں گے شہر میں

اپنی تنہائی کے زنداں میں پڑا ہوں کب سے — خواب آنکھوں میں لیے تیری تمناؤں کے

کس نے ڈالی ہے نفرتوں کی طرح — دل ہوئے سخت پتھروں کی طرح

عمر بھر مشکلوں کا ساتھ رہا — عمر بھر مشکلات سے کھیلے

جو نکلے تھے تلاشِ روشنی میں — اندھیروں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں

یوں ہے اُمید و یاس کا عالم — موت جیسے حیات سے کھیلے

''سفر روشنی کا'' بار دوم، مئی ۱۹۹۹ء میں شرکت پریس لاہور سے شائع کی گئی ہے۔ خوبصورت سرورق اور عمدہ اشاعت کے حامل اس مجموعے کی قیمت ۱۵۰ روپے رکھی گئی ہے اور صفحات کی تعداد ۱۵۲ سے بڑھا کر ۲۲۴ کر دی گئی ہے۔ بار اوّل میں شائع ہونے والی اے غزلوں میں سے ۱۱ غزلیں حذف کر دی گئی ہیں اور ۴۱ غزلیں مزید شامل کر دی گئی ہیں۔ اس طرح حمد اور نعت سمیت غزلوں کی کل تعداد ۱۰۱ ہو گئی ہے۔ ''ریاظ'' کے بنائے ہوئے سرورق نے ''سفر روشنی کا'' بار دوم کو دیدہ زیب بنا دیا ہے۔ فلیپ پر رئیس امروہوی، ڈاکٹر جمیل جالبی، شفیق الرحمٰن، مظہر امام، محسن نقوی اور حفیظ الرحمٰن احسن کی مختصر آرا شامل ہیں۔ مقدمہ کے طور پر بار اوّل کی طرح ڈاکٹر عبادت بریلوی اور عارف عبدالمتین کے مضامین شائع کیے گئے ہیں۔

''سفر روشنی کا'' بار دوم کی غزلیات میں حفیظ شاہد کا مشاہدہ زیرک اور موضوعات میں زیادہ وسعت نظر آتی ہے۔ سفر، گاؤں سے شہروں کی نقل مکانی، اس نقل مکانی کے نتیجے میں پھیلنے والی ابتری، رشتوں کی بدلتی ترجیحات اور انسانی نفسی کیفیات کو حفیظ شاہد نے بیان کیا ہے۔ زندگی کے ہر لحہ بدلتے منظر نامے نے انسان کی زندگی کو بہت پیچیدہ بنا دیا ہے۔ ہر رشتہ، تعلق اور خواہشات یہاں تک خواب تک اُلجھے اُلجھے ہیں۔

اُلجھے اُلجھے خواب سفر کے لگتے ہیں — اُجڑے اُجڑے زیست کے رستے لگتے ہیں

خزاں نے مجھ کو دیے ہیں چرکے، بہار نے بھی عذاب بخشے
میں زخم خوردہ ہوں موسموں کا، نئی رُتوں کی تلاش میں ہوں

آج بھی ہے زندگی دامِ مشیت کی اسیر — آج بھی ہیں ذہن میں اوہام پہلے کی طرح

مجھ کو تو اب بھی اپنی روایات ہیں عزیز — مانا کہ آج دَور نئی روشنی کا ہے

صرف جینا ہی نہیں ہے زندگی — زندگی کا مدعا کچھ اور ہے

رُخصت ہوئے تھے جب وہ نظر تھی دھواں دھواں — چھایا ہوا ہے دل پہ ابھی تک سحاب سا

لوگ منزل آشنا بھی ہو گئے — اور ہم زادِ سفر میں کھو گئے

یوں نظر آتا ہے ہم بھی زندگی کی دوڑ میں — ہاتھ کچھ آئے نہ آئے دَوڑتے رہ جائیں گے

رات دن کی کشمکش ہے اور جانِ ناتواں! — زندگی کو ہے فشارِ زندگی گھیرے ہوئے

سن نہیں سکتا مگر محسوس کر سکتا ہوں میں — وقت کی آواز بھی ہے دل کی دھڑکن کی طرح

حفیظ الرحمٰن احسن نے اس مجموعے کے حوالے سے بڑی صائب رائے دی ہے کہ حفیظ شاہد کی غزل ''زندگی آمیز بھی ہے اور زندگی آموز بھی۔'' انہوں نے زندگی کو اس کی تلخیوں اور رعنائیوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔

رجائیت حفیظ شاہد کے اس غزلیہ مجموعے میں روح کی طرح سرایت کیے ہوئے ہے اور یہی رجائیت روشنی کی علامت بن کر زندگی کی تلخیوں اور تاریکیوں کو کم کر رہی ہے۔

میں انتظار میں بیٹھا ہوں ایک مدت سے　　نئے چراغ جلا کر نئی شبوں کے لیے

مرے خیالوں میں چاندنی ہے، مری نگاہوں میں ہے اُجالا
میں روشنی کا سفیر بن کر، نئے دنوں کی تلاش میں ہوں

''چراغِ حرف'' کا تعارف

حفیظ شاہد کا دوسرا مجموعۂ کلام ''چراغِ حرف'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ اس مجموعے کو ''نیاز احمد'' نے زاہد بشیر پرنٹرز لاہور سے چھپوایا اور سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۱۹۸۹ء میں شائع کیا۔ خوبصورت سرورق سے آراستہ ''چراغِ حرف'' کے صفحات کی کل تعداد ۲۰۸ اور قیمت ایک صد روپیہ رکھی گئی ہے۔ اس مجموعۂ کلام کا انتساب حفیظ شاہد نے اپنے بڑے بھائی میاں عبدالعزیز کے نام کیا ہے۔ ''چراغِ حرف'' کا مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی اور فلیپ یزدانی جالندھری نے تحریر کیا ہے۔ حمد اور نعت سے شروع ہونے والے اس غزلیہ مجموعے میں ۹۴ غزلیں شامل ہیں۔ ''چراغِ حرف'' میں موضوعات کا تنوع اور اُسلوب کی رنگینی یکساں طور پر نظر آتی ہے۔ ایک باشعور ناظر کی طرح حفیظ شاہد حالات و واقعات کو نہ صرف دیکھتے ہیں بلکہ تخلیق کار کی نظر سے اُن کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ چراغِ حرف میں عصری صورتِ حال کی عکاسی کی گئی ہے اور ایک دردمند دل کی فریاد جگہ جگہ اشعار کے روپ میں صفحۂ قرطاس پر بکھری نظر آتی ہے۔ ''چراغِ حرف'' میں روایت اور جدت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ روایت کے ساتھ جڑنے کا ثبوت غزل سے محبت کی صورت میں عیاں ہے اور جدت موضوعات میں موجود ہے۔ ''چراغِ حرف'' میں سفر کا استعارہ زیادہ بھرپور اور وسیع تناظر میں نظر آتا ہے۔ حسن، عشق اور غزل کا آپس میں نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہے۔ غزل ہو اور اس میں محبت کے نغمے، حسن کی مدح سرائی اور مصائبِ عشق نہ ہو، یہ ماننے والی بات نہیں ہے۔ چراغِ حرف کی غزلیات بھی ان موضوعات کے ساتھ سجی نظر آتی ہیں۔ عہدِ حاضر میں اسلامی ممالک عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ نامعلوم خوف اور ان دیکھا خطرہ انہیں گھیرے رہتا ہے۔ مسلم قوم کے زوال کا نوحہ بھی ''چراغِ حرف'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ''چراغِ حرف'' میں دیہی اور شہری زندگی کا نہ صرف تقابل کیا گیا ہے بلکہ دیہات کے سادہ تمدن اور پُرخلوص زندگی کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ شہری زندگی کا خوف و ہراس، افراتفری، لالچ و ہوس، اعلیٰ اخلاقی اقدار کا زوال اور بدلتی معاشرتی اقدار پر طنز بھی ''چراغِ حرف'' کے اَشعار میں ملتا ہے۔

کہیں غموں کا تذکرہ کہیں دُکھوں کی داستاں　　میں رو دیا حیات کی کتاب دیکھتے ہوئے

اس قوم پر زوال کے آثار دیکھ کر　　دل رو دیا نوشتۂ دیوار دیکھ کر

شاہد شہر میں آ کر میں　　اپنے آپ سے بچھڑا ہوں

روشن چراغِ اشک کرو اپنی آنکھ میں　　ظلمت کی وادیوں میں ضیا پاؤ گے کہاں

منور ہو گیا ہے قریۂ دل　　نہ جانے کس کا اعجازِ نظر ہے

نیا سفر مجھے آواز دینے لگتا ہے　　ذرا سی دیر جو گھر میں قیام کرتا ہوں

''مہتابِ غزل'' کا تعارف

حفیظ شاہد کا تیسرا غزلیہ مجموعہ کلام ''مہتاب غزل'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ اس مجموعے کو نیاز احمد نے آر۔ آر پرنٹرز لاہور سے چھپوایا اور سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۱۹۹۴ء میں شائع کیا۔ ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ''مہتابِ غزل'' میں ۹۰ غزلیں شامل ہیں اور اس کی کل قیمت ۱۲۰ روپے ہے۔ اس مجموعۂ کلام کا انتساب حفیظ شاہد نے اپنی زوجہ اور بچوں کے نام کیا ہے۔ مہتاب غزل کا فلیپ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور پیش لفظ آغا سہیل نے تحریر کیا ہے جو ۱۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ ''مہتابِ غزل'' میں حفیظ شاہد کا فن نکھر کر سامنے آیا ہے۔ ان کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔ روایت اور جدت کا امتزاج جو حفیظ شاہد کے پہلے مجموعہ کلام سے شروع ہوا تھا زیادہ پختگی اور شعور کے ساتھ اس مجموعۂ کلام میں دیکھا جا سکتا ہے۔ حفیظ شاہد نے فرسودہ اور از کار رفتہ روایات اور اقدار کو بعینہٖ قبول کرنے کے بجائے ان اقدار و روایات کا باشعور تخلیق کار کی نظر سے مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے۔ اس لیے ''مہتاب غزل'' میں حفیظ شاہد سیاسی، سماجی اور معاشی اداروں پر غور و فکر کرتے نظر آتے ہیں۔ اس مجموعے میں حفیظ شاہد ایک ''ترقی پسند'' شاعر کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں لیکن یہ ترقی پسندی کسی نظریے یا فیشن کی عطا نہیں بلکہ زندگی کرنے اور زندگی برتنے کے نتیجے میں حقیقی تجربے کا حاصل ہے۔ مہتاب غزل کی ''روح'' عصری حسیت ہے۔ اسے ہم روحِ عصر بھی کہہ سکتے ہیں۔ معاشرے میں موجود استحصالی نظام اور طبقاتی کشمکش نے جس طرح انسانوں کے مابین دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ یہ مکمل داستان اس مجموعے میں اشعار کے روپ میں بیان کی گئی ہے۔ مہتاب غزل میں انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ گاؤں سے شہروں کی طرف انسانی آبادی کا انخلاء اور اس کے پیدا کردہ مسائل، سفر کی داستان، محبت کے نغمات اور حقائق حیات جیسے موضوعات جو کہ پہلے دو مجموعوں میں بھی موجود ہیں، ''مہتابِ غزل'' میں بھی موجود ہیں۔ مہتابِ غزل تک آتے آتے شاعر کے ہاں تسلیم و رضا کے عناصر پیدا ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ اس لیے اس مجموعے کی غزلیات میں ہمیں تصوف کا رنگ نظر آتا ہے۔

لے جائے ہوا مجھ کو جدھر چاہے اُڑا کر　　اک برگ ہوں اور ٹوٹ کے ٹہنی سے گرا ہوں

اسی طرح بانٹی ہے کس نے اس نگر میں روشنی　　میرے گھر میں ہے اندھیرا تیرے گھر میں روشنی

اہلِ سفر کو سائے سے محروم کر دیا　　اہلِ ہوس نے راہ کے اشجار بیچ کر

اب ہے اپنے گھر کا نقشہ بھی ہمیں بھولا ہوا　　ایک مدت سے گئے ہیں دشت پیمائی میں ہم

شاہد کسی کی اب یہاں پہچان ہی نہیں　　شہروں کی بھیڑ بھاڑ میں چہرے بدل گئے

خوش نما اور کوئی رنگ نگاہوں میں نہیں　　جب سے دیکھا ہے ترے عارض و رُخسار کا رنگ

نظر آتے نہیں ہیں عیب اپنے　　ہمارا دیکھنا کیا دیکھنا ہے

چمک چمک کے کرن آفتاب کی مجھ کو　　نئی سحر کی کہانی سناتی رہتی ہے

"یہ دریا پار کرنا ہے" کا تعارف

"یہ دریا پار کرنا ہے" حفیظ شاہد کے چوتھے مجموعۂ کلام کا نام ہے۔ اس غزلیہ مجموعے کو نیاز احمد نے سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور سے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا ہے۔ اس مجموعۂ کلام کا انتساب حفیظ شاہد نے خالق ارض وسما کے نام کیا ہے۔ "یہ دریا پار کرنا ہے" کے صفحات کی کل تعداد ۲۲۸ ہے اور اس کی قیمت ۳۰۰ روپے سکہ رائج الوقت رکھی گئی ہے۔ اس مجموعے میں شامل غزلیات کی تعداد ۱۰۳ ہے۔ اس مجموعے کی تقریظ شبنم رومانوی نے تحریر کی ہے اور فلیپ پر حفیظ شاہد کی عمدہ تصویر بھی ہے۔

"یہ دریا پار کرنا ہے" تک آتے آتے شاعر کی خود اعتمادی بڑھی ہے اور لفظ پر اعتبار قائم ہوا ہے۔ اس لیے کتاب کی اشاعت میں زیادہ آراء کو شامل کرنے کے بجائے صرف ایک مختصر مضمون شامل کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں حفیظ شاہد کا دھیما لہجہ فکری پختگی کے ساتھ مل کر حقائق حیات سے پردہ کشائی کرتا ہے۔

نہ جانے اس میں پوشیدہ ہیں اس کی حکمتیں کیا کیا
ہمیشہ گردشوں میں یہ زمین و آسماں رکھنا

اس مجموعے میں حفیظ شاہد نے زندگی کے تلخ حقائق، انتظامی اداروں کی بدانتظامی، بکاؤ دانش ور اور اُدباء اور بدعنوان سیاست دانوں پر طنز کیا ہے، جو شاعر کے فکری شعور کی عکاسی کرتا ہے۔

وہی ہے بھوک اہلِ زر کی، لیکن لوگ کہتے ہیں
بھرا ہوا پیٹ تو کوئی غذا اچھی نہیں لگتی

اُبھرا نہیں مہ تاب، ستارے نہیں نکلے
گھیرا ہے اندھیروں نے ابھی اپنے گھروں کو

حقائقِ حیات پر ہر دَور کے شعرا نے سوال اُٹھائے ہیں۔ سوال بنیادی طور پر فکر کے پھیلاؤ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ حفیظ شاہد کے اس شعری مجموعے میں بھی سوال موجود ہیں۔

مجھ کو کیا تھا قیدیٔ تقدیر کس لیے　　قدرت سے انتظارِ جواب و سوال ہے

کیا بتاؤں زندگی کا کھیل کیسا کھیل ہے　　آدمی محوِ تماشا ہے تماشا آدمی

رجائیت حفیظ شاہد کی شاعری کا مقیاس الحرارت ہے۔ اس مجموعے میں بھی رجائیت اور زندگی کی مثبت اقدار پر بھروسہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔

تھوڑی سی روشنی ہی سہی ، روشنی تو ہے　　اُمید کے چراغ بجھاتے ہو کس لیے

تو کس لیے ہے وقت کے تیور سے غم زدہ　　رنگِ رُخِ حیات بدلتا ہے ایک دن

عہدِ حاضر کے انسانی روّیوں پر طنز کا نشتر چلایا گیا ہے۔ خلا کی تسخیر کا عمل جاری ہے۔ اربوں ڈالر سالانہ اس پر خرچ کیے جا رہے ہیں جبکہ اس زمین پر بسنے والے لاکھوں لوگ روز بھوکے سوتے ہیں۔

قبروں پہ ہے چراغاں، بستی میں ہے اندھیرا　　مردوں سے ہے محبت، زندوں سے دشمنی ہے

اس زمین کی وسعتوں سے ہے ابھی ناآشنا　　آسمانوں پر مگر انسان کی پرواز ہے

زمین پہ جو کوئی بستی بسا نہیں سکتے　　فلک پہ خاک نئی بستیاں بسائیں گے

محبت اُردو غزل کا اہم ترین موضوع ہے۔ عمر کے ابتدائی دور میں جذبات کا زور زیادہ ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ تحمل میں تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ اس مجموعے تک آتے آتے حفیظ شاہد کے ہاں محبت میں تسلیم و رضا کا رنگ در آیا ہے۔

گلا انکار کا اس سے کروں کیا
کوئی تو صورتِ انکار ہوگی

درج بالا نئے موضوعات کے ساتھ ساتھ روحِ عصر، طبقاتی عدم توازن، وطن سے محبت، سفر کی داستان، شہر اور دیہات کا تمدن، محبت جیسا عالم گیر جذبہ اور روایت کے ساتھ وابستگی مل کر "یہ دریا پار کرنا ہے" تخلیق ہوتی ہے۔

"فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی" کا تعارف

حفیظ شاہد کے مجموعۂ کلام کا نام "فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی" ہے۔ حسبِ روایت اس مجموعۂ کلام میں بھی غزل کی ہیئت کو اظہار کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ خوبصورت طباعت اور عمدہ کاغذ کے حامل اس شعری مجموعے کا سرورق دیگر مجموعوں کے مقابلے میں زیادہ متاثر کرتا ہے۔ الحمد پبلی کیشنز لاہور نے اس مجموعۂ کلام کو ۲۰۰۴ء میں شائع کیا ہے۔ اس مجموعۂ کلام کا انتساب حفیظ شاہد نے اپنے بھائیوں کے نام کیا ہے۔ اس مجموعے میں ۸۵ غزلیات اور ۲۲ قطعاتِ تاریخ شامل ہیں۔ اس مجموعے صفحات کی کل تعداد ۲۴۴ اور اس کی کل قیمت ۱۶۰ روپے سکہ رائج الوقت ہے۔ مجموعۂ کلام کا فلیپ ڈاکٹر شفیق احمد نے تحریر کیا ہے اور ۲۰ صفحات پر مشتمل تفصیلی پیش لفظ سہیل اختر نے تحریر کیا ہے۔

"فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی" میں حفیظ شاہد کا فنی اور فکری سفر عروج پر ہے۔ نوجوانی اور جوانی کے جذبات اور جذباتیت کی جگہ فکری گہرائی نے لے لی ہے۔ سفر، شہروں کی زندگی اور اس کا انتشار، رُوحِ عصر، انسانی نفسیات، محبت کے نغمے اور رجائیت جو حفیظ شاہد کے پسندیدہ موضوعات زیادہ فنی پختگی اور فکری گہرائی کے ساتھ اس مجموعے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ عمرِ عزیز کے ساٹھ سال پورے کرنے کے بعد ہر شخص کے اندر کا ناصح اور مبلغ

اخلاق بیدار ہو جاتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے شاعری کے جس تعمیری منصب کی طرف ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں اشارہ کیا تھا۔ اس کا رنگ اور اثر ہر بڑے شاعر کے ہاں شعوری یا لاشعوری طور پر بشمول غالب دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ رنگ حفیظ شاہد کے اس تازہ غزلیہ مجموعے میں موجود ہے۔ تصوف، شب بیداری اور ریاضتِ نیم شبی جیسے مضامین بھی اس مجموعے کی زینت بنے ہیں۔ ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' میں صحرا کا استعارہ تمام تر تلازمات کے ساتھ وسیع تر علامتی نظام جنم دے رہا ہے جو عہدِ حاضر کے فکری بانجھ پن کے ساتھ جڑ کر روحِ عصر میں ڈھل جاتا ہے۔ اسی لیے طنز کا رنگ اس مجموعے کی غزلیات میں بہت گہرا ہے۔

سرِ بازار بیچا ہے قلم کو سخن سازوں، قلم کاروں نے اکثر
کلی کلی مری اُمید کے گلستاں کی شہیدِ تختی موسم دکھائی دیتی ہے
ترے عہدِ ستم میں زندگانی کڑی افتاد ہوتی جا رہی ہے
اپنے تو اپنے ہیں غیروں کو بھی چاہا کر
شاہد اکثر پچھلی رات اس کی یاد میں رویا کر
خود گرا کر یہ فصیلیں شہر کی قبضۂ اغیار کو روتے ہو کیوں
محفوظ ہی رہے یہ محبت کا آشیاں اس پر کسی کی برقِ عداوت نہ گر پڑے
ترے حسنِ نظامت کو سمجھ سکتا نہیں کوئی سحر، شب کو عنایت کی، سحر کو روشنی بخشی
بھٹکتی ہیں نہ جانے کیوں سرِ ہر رہگزر آنکھیں کبھی ہیں خاک پر آنکھیں کبھی افلاک پر آنکھیں

''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' کا ایک اہم پہلو قطعاتِ تاریخ ہیں جو حفیظ شاہد کی فنی مشاقی کا ثبوت ہیں۔ کل ۲۲ قطعاتِ تاریخ اس مجموعے میں شامل ہیں جن میں سے ۷ مختلف لوگوں کی وفات، ایک قطعہ تاریخ اپنے مکان کی تعمیر کے حوالے سے، دو قطعات تصانیف کی اشاعت کی تواریخ کو منظوم کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں اور ایک قطعہ شادی پر تحریر کیا گیا ہے۔ حفیظ شاہد نے ان قطعات میں درست تاریخ کے اظہار کے لیے مدخلہ یا تخرجہ کا سہارا لیا ہے۔

بروئے کسک دل نے مجھ سے کہا
بس اتنی ہی تھی زندگی فیض کی

۱۹۸۴=۲۰+۱۹۶۴

☆☆☆

تحقیقی وتنقیدی مقالہ برائے ایم فل اُردو، مظہر عباس، لیکچرر گورنمنٹ ڈگری کالج خیر پور ٹامے والی نے سال ۲۰۰۵ء میں مکمل کیا۔

ڈاکٹر ندیم احمد شمیم (خان پور)

شاندار روایات کا امین... حفیظ شاہدؔ

شاہدؔ کسی کی یاد کے خیمے میں رات کو | اک مشعلِ خیال جلائے ہوئے ہوں میں
رفتگاں کی یادوں میں ہم جو رونے لگے ہیں | آنسوؤں کے دروازے بند ہونے لگے ہیں

حفیظ شاہدؔ شہر خان پور کی علمی و ادبی محافل کا ایک بڑا نام تھے۔ مگر یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ حفیظ شاہدؔ اُردو غزل کے نمائندہ شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ اُن کی شاعری میں جذبہ وخیال کی فراوانی پائی جاتی ہے۔
اُن کا تمام تر شاعری میں اُن کی شخصیت کا وسیع مطالعہ بہ درجہ اُتم پایا جاتا ہے۔ انہوں نے انسانی نفسیات کے عمیق مطالعہ سے شعر و سخن کی وادی کو سنوارا ہے۔ کسی عظیم شخصیت کے نمائندہ کلام شاعر ہونے کی تمام تر خوبیوں کا مجموعہ حفیظ شاہد کا کلام ہے۔ یہی وجہ ہے جب بھی شہر خان پور کے نمائندہ شاعر ہونے کی بات ہوگی' حفیظ شاہد کا نام نامی صفِ اوّل کے شعراء کرام میں ہمیشہ اوّلین شمار ہوگا۔
حفیظ شاہد کی غزل جدید و قدیم روایات کا مرقع ہے۔ انہوں نے اپنی غزل کے دامن کو نئے اور پرانے خیالات نہ صرف سجایا ہے بلکہ غزل کے موضوعات کو مزید پھلنے، پھولنے کے لیے اُردو غزل کو نئے مفہوم و معانی عطا کیے ہیں۔ حفیظ شاہدؔ کے سات شعری مجموعے' جن میں اوّلین مجموعہ ''سفر روشنی کا'' ۱۹۸۳ء میں منظرِ عام پر آیا ۔ روشنی اُن کی شاعری کا ایک خوب صورت استعارہ ہے۔ انہوں نے ''روشنی'' کو بطور استعارہ استعمال کر کے اس کی اہمیت کو مزید اُجاگر کر دیا ہے۔ روشنی پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اب روشنی کا کوئی نشاں بھی نہیں رہا | یوں گُل ہوا چراغ دھواں بھی نہیں رہا
دل کے آنگن میں روشنی کے لئے | فکر کی تازگی ہی کافی ہے
شامل ہے بات بات میں لفظوں کی روشنی | مرے سخن میں کوئی اندھیرا نہیں رہا

حفیظ شاہدؔ کا دوسرا شعری مجموعہ ''چراغ حرف'' ۱۹۸۹ء میں جب کہ تیسرا شعری مجموعہ ''مہتابِ غزل ۱۹۹۴ء میں چوتھا مجموعہ ''یہ دریا پار کرنا ہے'' ۱۹۹۷ء میں، ''سفر روشنی کا'' کا ترمیم و اضافہ کے ساتھ دوبارہ اشاعت ۱۹۹۹ء میں اور پانچواں مجموعہ ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' ۲۰۰۴ء میں، چھٹا مجموعہ ''سورج بدل رہا ہے'' ۲۰۰۸ء میں جب کہ کلیات ''ختم سفر سے پہلے'' ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئے۔ چھ شعری مجموعوں پر مشتمل کلیات پروفیسر سہیل اختر نے مرتب کیا ہے۔ حفیظ شاہدؔ کے کلام میں زندگی کو زندہ دلی سے جینے کے ساتھ ساتھ انسان کے اعلیٰ اوصاف کی

نشاندہی کی گئی ہے۔

پریشانی میں بھی زندہ دلی سے کام لیتا ہوں — بنامِ زندگی میں زندگی سے کام لیتا ہوں

ہمیشہ آدمی سے رابطہ رکھا ہے یوں میں نے — کسی کے کام آتا ہوں کسی سے کام لیتا ہوں

حفیظ شاہد کی شاعری میں دوسرا نمایاں استعارہ ''سفر'' ہے۔ اُن کے بقول سفر زندگی ہے۔ سفر زندہ رہنے کا ایک ہنر ہے۔ انہوں نے ذاتی زندگی میں مجھے کئی بار بتلایا کہ مرے نزدیک سفر وسیلہ ظفر ہے۔ وہ اپر پنجاب سے ہجرت کر کے شہر خان پور کے باسی بنے اور پھر اسی شہر میں زندگی بسر کی۔ حفیظ شاہد کے ہاں ہر شعری تحریک سفر سے نمو پاتی ہے۔ ''چراغِ حرف'' میں سے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

اب تو یہ احساس ہی نہیں ہوتا — رُک گیا ہوں کہ میں سفر میں ہوں

کتنا اچھا ہے یہ سفر شاہد — چل کے دیکھو خدا کے رستے میں

اُستاد الشعراء حفیظ شاہد کے ہاں احساسِ دل اور احساسِ انسانیت سے بھرپور خیالات و احساسات کی فراوانی ملتی ہے جو کہ اُن کے ایک حساس دل کی ترجمانی کرتے ہوئے قاری کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیتی ہے۔ حفیظ شاہد کے ہاں لفظ و معانی سے بھرپور تراکیب پڑھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہیں۔

سمندر سے یہی سیکھا ہے ہم نے — کناروں سے کبھی باہر نہ ہونا

شہر والوں کو اندھیرے بیچ کر — سو گیا وہ شخص گھوڑے بیچ کر

حفیظ شاہد کے کلام میں ندرتِ خیال کی آمیزش پائی جاتی ہے جس سے اُن کی غزل کا موضوع متنوع ہو گیا ہے۔

دشمنوں سے بھی دوستی کر لی — دیکھ کر دوستوں کے رنگ

کچھ ایسا بدلا ہے رنگ زمانے کا — اب تو جھوٹے لوگ بھی سچے لگتے ہیں

ندرتِ خیال کا حامل یہ شعر ملاحظہ ہو

عجیب ہے یہ تلاش میری مرے کاندھوں پہ لاش میری — میں نفرتوں کا لباس پہنے، محبتوں کی تلاش میں ہوں

انہیں بھی کاٹ کر دنیا نے بیچ ڈالا — شجر اُگائے گئے تھے جو راستوں میں چھاؤں کے لیے

حفیظ شاہد کے کلام میں شہری اور دیہاتی زندگی کی عکاسی خوب ملتی ہے۔ دو شعر:

گم کہیں نہ ہو جانا شہر کے جھمیلوں میں — میں کہاں بھیڑ میں تم کو صدا دوں گا

شہر سے یونہی مجھے پیار نہیں شاہد — شہر میں لوگ بھی رہتے ہیں مرے قصبوں کے

حفیظ شاہد نے شعر و سخن کی وادی میں رُبع صدی گزاری۔ حفیظ شاہد کا شعری سفر اُن کے طویل شعری ذوق کی عکاسی کرتا ہے۔ حفیظ شاہد نے فلمی گیت نگاری بھی کی۔ پنجابی فلم ''چھڈ نُمرے دی یاری'' اور ''دو بلبل پنجرے دی'' کے گیت لکھے۔ ایک گیت کا شعر ملاحظہ فرمائیں:

اپنے ای پیاریاں دا پیار لُٹ لیندے نیں... کدی کدی یاراں توں وی یار لُٹ لیندے نیں

حفیظ شاہدؔ ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ اُن کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری بھی لائقِ صد تحسین ہے۔ نعتیہ شاعری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ اطہر، معجزات، فضائل و کردار اور فیوض و برکات کا اظہار نمایاں طور پر ملتا ہے۔ حفیظ شاہد کا غیر مطبوعہ کلام بھی منظرِ عام پر آرہا ہے۔ یہ بھی نہایت خوش آئند بات ہے کہ ادب میں ایک خوبصورت کتاب کا اضافہ ہوگا۔ حفیظ شاہد کے کلام کی خاص بات "تاریخ گوئی" کا عنصر ہے۔ بلاشبہ اشعار میں تاریخ گوئی اُردو ادب کے استاد شعرا کا خاصہ ہے۔ یہ کام ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوا کرتی۔ اس علم کے لئے وسیع گہرا مطالعہ، شعرا کرام سے دلی لگاؤ اور ادب کی سچی لگن کا ہونا اشد ضروری ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں نامور شعرا کی تاریخِ وفات، شادی بیاہ اور دیگر مواقعوں پر "تاریخ گوئی" پر مشتمل اشعار کہہ کر سلاستِ زباں کے ساتھ ساتھ ایک منجھے ہوئے شاعر ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

اُردو کے نامور شاعر فیض احمد فیض کی وفات ۱۹۸۲ء میں کہا گیا تاریخ گوئی کا عمدہ نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

ہوئی آج تاریک بزمِ سخن وہ شمع غزل بجھ گئی فیض کی

بروئے کسک دل نے مجھ سے کہا ہوگیا رُخصت وہ میرِ انجمن

کرکے ویراں محفلِ شعر و سخن دل ہے شاہدؔ یہ کہو

سال وفات ہوگیا رخصت شہرِ اقلیمِ سخن

۱۹۸۲ء۔ ۳۴+۱۹۴۸ء

اُردو قطعہ نگاری جو کہ رئیس امروہوی کی وفات ۱۹۸۶ء کے موقع پر کیا گیا ملاحظہ ہو:

کل تک جو نغمہ ریز میری انجمن میں تھے افسوس آج شہرِ خموشاں میں جا بسے

تاریخ میں نے از سرِ روز "الم" کہی کیا شاعرِ عظیم گیا بزمِ دہر سے

۱۹۸۸ء۔ ۷+۱۹۸۱ء

طفیل ہوشیار پوری کے لیے لکھا گیا قطعہ تاریخ وفات تاریخ گوئی کا عمدہ نمونہ ہے۔

سب کے لیے تھی وقفِ محبت طفیل کی محکم تھی اہلِ علم سے نسبت طفیل کی

شاہد کہو یہ از سرِ افسوس سالِ وفات اک صدمہ عظیم ہے رحلتِ طفیل کی

۱۹۹۳ء۔ ۱+۱۹۹۲ء

اس کے علاوہ انہوں نے مولانا صلاح الدین مدیر "ہفت روزہ تکبیر" کراچی، معروف گلوکار سلیم گردیزی، سعید انور قریشی (بہاول پور)، عارف عبدالمتین، والدہ اظہر ادیب، صبا اکبر آبادی، محمد خاں کلیم، سیّد یزدانی جالندھری، میاں فیض احمد اور شرقی بن شائق جیسی مایہ ناز شخصیات کے بھی قطعات تاریخ وفات کے بڑے عمدہ قطعات کہے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف قطعات جس میں شامل "قطعہ تاریخ مکان تعمیرِ نو"، قطعہ اشاعت وحید

قریشی نمبر ماہنامہ محفل لاہور، قطعہ تاریخ نقشِ دوام ''شادی نواسی ندرت'' لکھ کر فنِ تاریخ گوئی کو بامِ عروج بخشا ہے۔ حفیظ شاہد کے تاریخ گوئی پر مشتمل قطعات ندرتِ خیال کے ساتھ ساتھ فنِ تاریخ گوئی پر اُن کی گرفت کو اُجاگر کرتے ہیں۔

مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے حفیظ شاہد ایک ایسا قادرالکلام شاعر ہے جو کہ غزل کے ساتھ ساتھ فنِ تاریخ گوئی میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ انہوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے اُردو ادب کی اس مٹتی ہوئی روایت کو اپنی شاعری میں دوبارہ زندہ کر کے ''یادِ رفتگاں'' کا حق ادا کیا ہے اور اس سلسلہ میں اپنا بھرپور ادبی کردار ادا کیا ہے۔ شعر و ادب کی وادی میں اُن کے چاہنے والے اور سرزمینِ خان پور کے علمی و ادبی حلقوں میں اُن کے چھ سے زائد شعری مجموعہ جات ہمیں حفیظ شاہد کی شعری عظمت کا احساس دلاتے رہیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ شہری سطح اور بالخصوص میونسپل کمیٹی کی حدود میں واقع کسی شاہراہ کو یا کسی تعلیمی درس گاہ کے بلاک کو اُن کے نام سے منسوب کر کے نئی نسل اور آنے والے لوگوں کو اُن کی خوش گوار شعری عظمت کو یادوں سے مزین کیا جائے۔

جو لوگ خود پسند ہوں شاہد ہم اُن کے ساتھ
رشتہ رفاقتوں کا کبھی جوڑتے نہیں

مدیر محمد یوسف وحید روحِ رواں الوحید ادبی اکیڈمی کی فرمائش پر حفیظ شاہد کو اِن اشعار کے ساتھ خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔

بوئے گُل من کی فضاؤں میں بسائے رکھنا
اپنے احساس کو ہر آن جگائے رکھنا
حفیظ شاہد تو نظروں سے ہوگئے اوجھل
ان کی تصویر ، تصور میں سجائے رکھنا
ہے یہی اک علاج غمِ ہجرِ جاناں
داستانِ وصل کی ہر آن سنائے رکھنا
قرض یہ ہم پہ یقیناً ہے ابد تک شمیم
اک دیا روز دُعاؤں کا جلائے رکھنا

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حفیظ شاہد کی مغفرت فرمائے اور کروٹ کروٹ راحت نصیب فرمائے۔ آمین

☆☆☆

مجاہد جتوئی (خان پور)

حفیظ شاہد کی وطن سے محبت

اُستاد حفیظ شاہد کے جن دو شعروں پر میں بات کرنا چاہتا ہوں وہ اُن کی کتاب ''یہ دریا پار کرنا ہے'' کی ایک غزل سے ہیں۔ ایسا نہیں کہ اُن کے یہی دو شعر مجھے پسند ہیں اُن کی شاعری میں جا بجا ایسے شعر ملتے ہیں جو پڑھنے والے کو دوبارہ پڑھنے اور سوچنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ میں نے استاد حفیظ شاہد کی چھ میں سے دو تین کتابیں پڑھ رکھی ہیں اور اُن کی زبانی بہت سا کلام سنا بھی ہے۔ وہ ہمارے اسی شہر خان پور میں رہتے تھے۔ ان سے ہمارا تیس سال پرانا تعلق تھا۔ وہ بہت ہی شفیق انسان تھے۔ وہ بڑے شاعر تو تھے ہی لیکن انسان اس سے بھی بڑے تھے۔

وہ گہری فکر اور سوچ و بچار کے بعد شعر کہتے۔ اُن کے لہجے میں کبھی تلخی نہ دیکھی، دھیمے لہجے میں بات کرتے اور عمدہ شعر کہتے تھے۔ وفات سے چند روز قبل ایک محفل میں حفیظ شاہد نے بہت سی غزلیں سنائیں، اسی دوران انہوں نے اپنی کتاب ''یہ دریا پار کرنا ہے'' کی ایک غزل سنائی جس کے دو شعر مجھے بہت اچھے لگے، باقی اشعار بھی اچھے تھے لیکن یہ دو شعر ایسے ہیں جس میں انہوں نے کچھ لوگوں سے سوالات کیے ہیں۔ ان سوالات کو ہم خود اُن کے شعروں کے ذریعے سامنے لاتے ہیں:

رہتے ہو اس زمیں پہ مگر اس زمین کو
میدانِ کارزار بناتے ہو کس لیے؟

اُن کا سوال اُن لوگوں سے ہے، جو کسی نہ کسی حوالے سے زمین پر فتنہ و فساد پھیلانا چاہتے ہیں۔ شاعر کہنا چاہتا ہے کہ اس طرح فساد سے کچھ حاصل نہیں ہونا، آخر اس کا حل مذاکرات ہی ہیں۔ اس طرح کے سوالات ویسے تو ہر انسان کے دل و دماغ میں ہوتے ہیں لیکن ایسے سوالات کو نہایت سلیقے سے شعروں میں بیان کر کے اُن کی تاثیر میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اس شعر میں، میں شاعر کے ذہن کو بھی پڑھ سکتے ہیں کہ وہ اس پوری دھرتی، پوری کائنات، پورے ملک کو اپنا گھر سمجھتا ہے۔ وہ اس گھر کی سلامتی، تعمیر و خوشحالی اور بہتری کا متلاشی ہے۔

اس غزل کا دوسرا شعر اگر ہم اپنے وطن عزیز کے حوالے سے دیکھیں تو بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ شعر ملاحظہ کریں:

بنیاد جس مکان کی رکھی تھی پیار سے
شاہد اب اُس مکان کو ڈھاتے ہو کس لیے؟

یہ شعر ہمارے وطن کی تاریخ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ ملک کتنی قربانیوں سے وجود میں آیا۔ ان قربانیوں اور آپس کی محبت کی وجہ سے یہ وطن عزیز وجود میں آیا تو اب ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ جس مکان کی تعمیر ہم نے محبت

سے کی۔اب خود اسی مکان کو، اپنے اسی گھر کو اپنے ہاتھوں سے نقصان پہنچا رہے ہیں۔

حفیظ شاہد نے ان دو شعروں میں بہت بڑے سوالات ہمارے بلکہ پوری دنیا کے سامنے رکھے ہیں۔ان کا انداز نہایت سادہ لیکن بہت ہی مؤثر ہے۔وہ ہمیں سوچنے، سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں۔نفرت کو ترک کر کے محبت کا راستہ اپنانے کے لیے۔آخر میں دونوں شعر ایک بار پھر پڑھتے ہیں اور سوچتے ہیں۔

رہتے ہو اس زمیں پہ مگر اس زمین کو
میدانِ کارزار بناتے ہو کس لیے؟
بنیاد جس مکان کی رکھی تھی پیار سے
شاہد اب اس مکان کو ڈھاتے ہو کس لیے ؟

☆☆☆

پروفیسر سہیل اختر لکھتے ہیں:

مشاہیر کے تاثرات اس امر کے شاہد ہیں کہ حفیظ شاہد کی ہر ادبی کاوش خواہ وہ ان کی غزلیہ شاعری، بدیہہ گوئی اور فلمی شاعری ہو یا تاریخ گوئی، اُن کی ٹھوس مہارت اور عظمتِ فن کی دلیل ہے۔حفیظ شاہد نے صرف اور صرف میرٹ پر اپنی خاموشی، شرافت، سنجیدگی، شائستگی، آہستگی اور خوش خرامی سے شاعری کی گلرنگ منزلیں طے کی ہیں اور آج اُن کا شمار اُردو کے معروف اور نامور غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔

گزشتہ چار شعری مجموعوں کی تخلیق و اشاعت سے حفیظ شاہد کے فن کو بڑی جلا ملی ہے۔اور ''نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اوّل'' کے مصداق ان کی ہر دوسری تصنیف پہلی سے مہارت و متانت، دلبستگی و دلگدازی کے باعث نمایاں طور پر بہتر ہوتی ہے۔اور اب انہیں شعر گوئی میں اتنا ملکہ حاصل ہو گیا ہے کہ وہ قلم برداشتہ نہایت کمال کی غزل تخلیق کر سکتے ہیں۔غزل اور خاص طور پر خوبصورت اور دلکش غزل کہنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔لیکن شاہد اپنی ماضی کی ریاضت، عمر بھر کے مشاہدے اور مطالعے کے طفیل ایک ہی نشست میں مشکل زمین میں بڑی آسانی کے ساتھ آٹھ دس شعر کی غزل کہنے پر قادر ہیں۔اور یہ قدرت دیارِ شعر میں اتنی عام نہیں۔جن معدودے چند شاعروں نے رومانیت اور کلاسیکیت کے ساتھ ساتھ جدت کو اپنایا ہے اور اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ان میں بڑے اعتماد سے حفیظ شاہد کا نام لیا جا سکتا ہے۔

(از کتاب: ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' از حفیظ شاہد)

☆☆☆

نذیر احمد بزمی (خان پور)

حفیظ شاہد اور فنِ تاریخ گوئی

تاریخ گوئی ایک مستقل فن ہے اور عربی و فارسی زبانوں کے توسط سے یہ اُردو میں وارد ہوا۔ اُنیسویں صدی اور بیسویں صدی کے نصف اوّل تک یہ روایت اُردو ادب لازمی جزو رہی، مگر مشکل فن ہونے کی وجہ سے یہ معدوم ہوگئی اور بیسویں صدی کے آخر اور اکیس ویں صدی میں سوائے چند بزرگ شعراء کے کسی نے اس روایت کو آگے نہیں بڑھایا۔

فنِ تاریخ گوئی سے مراد کسی شعر، مصرع یا نثر کے حروفِ ابجد کے ذریعے کسی واقعہ کی تاریخ برآمد کرنا ہے۔ جو شعر برآمد ہوا سے "مادہ" یا "مادۂ تاریخ" کہا جاتا ہے۔ تاریخ گوئی کو مشکل ترین فن کہا جاتا ہے کیونکہ شاعری میں اوزان و ردیف کی پابندی، پھر حروف کے مقررہ اعداد کی پابندی کرتے ہوئے تاریخی قطعہ کہنا جو واقعے کی درست ترجمانی کرے اور اس میں شعری خصوصیات بھی اعلیٰ درجے کی موجود ہوں، آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے اس فن کی طرف صرف وہی شاعر متوجہ ہوتے ہیں جو شاعری کے اسرار و رموز سے کُلی طور پر آگاہ ہوتے ہیں اور اُستاد شعراء کے مرتبے پر پہنچتے ہیں۔

خان پور سے تعلق رکھنے والے اردو غزل کے مشہور شاعر حفیظ شاہد کا شمار بھی اُستاد شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کی غزل گوئی کی صلاحیتوں کا اعتراف اردو کے بڑے بڑے نقادانِ فن نے کیا ہے۔ حفیظ شاہد کے سات شعری مجموعے اور کلیات "ختمِ سفر سے پہلے" ان کی شعری صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ غزل کے علاوہ حفیظ شاہد کی شاعری میں ہمیں تاریخ گوئی کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے شعری مجموعے "فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی" کے آخر میں ۱۸ قطعات تاریخ وفات اور پانچ قطعات مختلف موضوعات پر موجود ہیں۔ جس سے اُن کی فن تاریخ گوئی پر گرفت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ذیل میں حفیظ شاہد کے فنِ تاریخ گوئی کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ معروف شاعر فیض احمد فیض ۱۹۸۴ء میں فوت ہوئے تو حفیظ شاہد نے ان کی وفات پر دو قطعات کہے

ہوئی آج تاریک بزمِ سخن
وہ شمعِ غزل بجھ گئی فیض کی
بروئے کسک دل نے مجھ سے کہا
بس اتنی ہی تھی زندگی فیض کی

۱۹۶۴+۲۰=۱۹۸۴

ہوئے ہیں اس جہاں سے فیض رُخصت
کہ لطفِ زندگی رخصت ہوا ہے

جہانِ ادب لاکھ آباد ہو
ہمیشہ رہے گی کمی فیض کی
کہا دل نے جو روئے درد دیکھا
امامِ شاعری رُخصت ہوا ہے

۱۹۸۰+۴=۱۹۸۴

آپ بیتی ''یادوں کی بارات'' کے مصنف جوش ملیح آبادی کی تاریخ وفات ۱۹۸۲ء کے موقع پر حفیظ شاہد نے ان کا قطعہ تاریخ وفات اس طرح لکھا

ہو گیا رُخصت وہ میرِ انجمن
کر کے ویرانِ محفلِ شعر و سخن
''دل'' سے شاہد یہ کہو سالِ وفات
ہو گیا رخصت شہِ اقلیمِ فن

۱۹۴۸+۳۴=۱۹۸۲

اُردو قطعہ نگاری کے حوالے سے معروف شخصیت رئیس امروہی کی وفات ۱۹۸۸ء کے موقع پر حفیظ شاہد نے ان کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا

کل تک جو نغمہ ریز میری انجمن میں تھے
افسوس آج شہرِ خموشاں میں جا بسے
تاریخ میں نے از سرِ زورِ ''الم'' کہی
کیا شاعرِ عظیم گیا بزمِ دہر سے

۱۹۸۱+۷=۱۹۸۸

ایک اور قطعہ میں رئیں امروہی کی تاریخ وفات ہجری کیلنڈر کے مطابق یوں پیش کی

بے وقت رحلت پر تری، تاریخ شاہد نے کہی ... ''ویراں ہے اب شہرِ ادب، سید رئیس امروہی''

۱۴۰۹ھ

اردو کے معروف شاعر صبا اکبر آبادی کی تاریخ وفات کو قطعہ میں اس طرح محفوظ کیا کہ اس میں ان کی کتاب کا نام بھی سمو دیا۔

شاہد، صبا کی رحلت پُر غم کا سال بھی .. اُس کی کتاب شعر ''چراغ بہار'' ہے (۱۴۱۲ھ)

''نقوش'' کے ایڈیٹر طفیل ہوشیارپوری کا قطعہ تاریخ وفات حفیظ شاہد نے بڑی عمدگی سے اس طرح لکھا

سب کے لیے تھی وقف محبت طفیل کی .... محکم تھی اہلِ علم سے نسبت طفیل کی
شاہد کہو یہ از سرِ افسوس سالِ فوت .... اک صدمۂ عظیم ہے رحلت طفیل کی

۱۹۹۲+۱=۱۹۹۳

مولانا صلاح الدین احمد، مدیر ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی کو حفیظ شاہد نے قطعہ وفات لکھ کر اس طرح خراج عقیدت پیش کیا

خدا کے ''امر'' سے ہے سالِ رحلت
امیر صدق، سلطانِ صحافت
۱۴۱۵=۲۴۱+۱۱۷۴ھ

معروف گلوکار سلیم گردیزی کی وفات پر قطعہ تاریخ وفات اس طرح پیش کیا

یہ سنی تاریخ بامِ چرخ سے
شاہِ بزمِ مطربان رخصت ہوا

ان قطعات کے علاوہ حفیظ شاہد نے سعید انور قریشی (بہاول پور)، عارف عبدالمتین، والدہ محترمہ نصر اللہ ناصر اور اظہر ادیب، محمد خاں کلیم، راسخ عرفانی، سید یزدانی جالندھری، میاں فیض احمد اور شرقی بن شائق جیسی شخصیات کے بھی تاریخ وفات کے قطعات بڑے عمدہ انداز میں لکھے۔

قطعات تاریخ وفات کے علاوہ حفیظ شاہد نے ''قطعہ تاریخ تعمیر مکان خود''، ''قطعہ تاریخ اشاعت وحید قریشی نمبر ماہنامہ محفل لاہور''، ''قطعہ تاریخ اشاعت نقش دوام، مجموعہ کلام شوذب کاظمی'' اور ''قطعہ تاریخ بسلسلہ شادی نواسی ندرت'' بھی لکھے جن میں ان کا فن عروج پر دکھائی دیتا ہے۔

اپنی نواسی ندرت کی ناصر سے شادی کے موقع پر حفیظ شاہد نے اس طرح ان کا قطعہ تاریخ شادی لکھا جس میں دولہا اور دلہن کے نام بھی عمدگی سے شامل کئے گئے ہیں۔

کہا ہے مصرعہ تاریخ میں نے ازسرِ شاہد
یہ روزِ عید ہے یا ناصر و ندرت کی شادی ہے
۱۶۹۹+۳۰۰=۱۹۹۹

اپنے نئے گھر کی تعمیر کی تاریخ کو حفیظ شاہد نے ''قطعہ تاریخ تعمیر مکانِ خود'' کے ذریعے اس طرح امر کر دیا

میں تھا محوِ فکر جب تعمیر کی تاریخ میں
کان میں آئی ندا ''اک خانۂ شاہد حفیظ''
(۱۹۸۵ء)

حفیظ شاہد کے قطعاتِ تاریخ کے اس مختصر جائزے سے حفیظ شاہد کی تاریخ گوئی کے فن پر گرفت کا اظہار ہوتا ہے۔ اُن کے بعض قطعات میں پندرہ سے زائد اشعار ہیں جو متوفیان کے بہترین مرثیے کہے جا سکتے ہیں۔ حفیظ شاہد کے قطعات بے ساختگی، قافیہ ردیف کی پابندی اور جذبات کے اظہار کا بہترین نمونہ ہیں اور فوت شدہ شخصیات سے محبت کا اظہار اور ان کی خوبیوں کا مرقع ہیں۔ الغرض حفیظ شاہد نہ صرف غزل بلکہ فن تاریخ گوئی کے بھی بہترین شاعر ہیں اور انہوں نے مٹتی ہوئی اس روایت کو دوبارہ زندہ کرنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔

☆☆☆

معظمہ شمس تبریز (رحیم یار خان)

محسن ادب و سفیر محبت... حفیظ شاہد

دیکھیے ساغر کی آشفتہ نگاہی کا کمال
مستیاں چھلکا رہا ہے ایک دیوانے کا نام

اس شعر کے مصرعہ اولیٰ میں ساغر کی جگہ شاہد رکھ لیں تو حسب حال ہو جائے گا اور ہمارے ممدوح محترم کی ادبی فتوحات کا عکاس بھی ہو جائے گا۔ حفیظ شاہد ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک دبستان ادب کا نام ہے، جس کے دائرہ فیض رسا میں کربلِ ادب میں العطش پکارتے متعدد ادیبوں، شاعروں اور قلم کاروں کو نہ صرف جام جاں فزا نصیب ہو جاتا ہے بلکہ ھل من مزیدی کو بھی رخت قرار دان ہو جاتا ہے اور علمی، ادبی اور شعری تڑپ کو یہ مژدہ جانفزا بھی میسر آتا ہے کہ

"آج ہیں وہ مائل بعطا اور بھی کچھ مانگ"

قرآن مجید فرقان حمید کی آیات کے شان نزول اور احادیث مبارکہ کے مقامی پس منظر پر غور کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اقوال اور افعال کی اہمیت ان کے وقوع کے حالات حاضرہ کے مطابق اہمیت کے گراف میں بلندی پاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح محمد یوسف وحید کی پے درپے ادبی فتوحات کے بیک پر جو خلوص اور خود وفتگی کا جو جذبہ کارفرما ہے اس کو بھی کرونا ایسی قدرتی آفت کے ہوتے ہوئے سورج کی اجلی تمازت اور عوام کی سرد مہری کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ صرف ایک کام نہیں بلکہ "مہا کار" ہے۔ صرف ادب کی دھن نہیں، "ادب سے عشق" کی معجزہ نمائی ہے۔

ہم ابھی شعور و ادراک کی کتاب نمبر 5 میں محقق العصر آبروئے قلم فخر سادات طبیب روحانی اور عالمی سطح کے مصلح حضرت علامہ پیر سید محمد فاروق القادری کی ادبی فتوحات کو خراج تحسین پر مبنی خصوصی گوشے کی اشاعت پر محمد یوسف وحید کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرنے کی نیت سے الفاظ جنار ہے تھے کہ خبر ملی کہ کام کے اس جویانے آسمان ادب کے نہایت تخی سورج حفیظ شاہد کے فنی سفر کے بارے میں مخصوص گوشے پر کام کا آغاز کر دیا ہے۔ آج 28 جولائی 2021ء ہے اور 30 جولائی کو ہمارے فائنل ایئر کے پیپرز شروع ہیں لیکن ہم نے بابا جانی کے تکیہ کلام

مصرع "ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں"

کے زیر اثر حفیظ شاہد کے قلمی کارناموں اور محمد یوسف وحید کی ادبی خدمات کے لیے وقت نکال لینے کا فیصلہ کیا اور کامیاب رہے۔ بات چانس کی ہے اور صنف نازک کو ہانڈی چولہے تک محدود رکھنے کی دقیانوسی رسم اور صدیوں پرانے رواج کے ہوتے ہوئے محمد یوسف وحید جیسے افراد نے جس طرح راہیں نکالنے کی داغ بیل ڈالی

ہے اور گوشہ نشیں ٹیلنٹ کو پروان کے مواقع فراہم کرنے کا عمل خیر دامیں درمیں تخمیں جاری رکھنے کا قصد کیا ہے تو ہم نے بھی پیغام امن اور آشا کی برقراری کے اس قاصد کی آواز پر لبیک کہنے میں فخر محسوس کیا ہے کہ جس نے حفیظ شاہد ایسے کہنہ مشق استاد الشعراء اور وسیب کا درد رکھنے والے قلب بے دار اور دیدہ وا کے حامل فرد درویش کے پیغام کی تفہیم و تبلیغ کا بیڑا اٹھایا ہے، لازم ہے کہ اتنے بڑے انسان کے تذکرے کی کاوش ہماری جستجو کے کشکول میں بھی جواہرات وردانیہ کا اضافہ کرے گی اور ہم بھی چانس ملنے اور اس کو Avail کرنے کے فرض سے سبکدوش قرار پائیں گے ورنہ ہم نے دیکھا ہے کہ عوامی اذہان میں سمایا جہالت کا لٹو کبھی بھی گھوم سکتا ہے اور لڑکیوں کی آزادی کے سارے نعرے کھوکھلے لگنے لگتے ہیں۔ یاد رہے کہ آزادی سے ہماری مراد ٹیلنٹ کے اظہار اور نکھار کے مواقع کی فراہمی کی آزادی ہے۔ صد شکر کہ ہم اس عظیم بابا جانی کی بیٹی ہیں جن کی حیات اعتبار سے عبارت ہے اور ان کا یہ قول جو ہمیں پانچویں جماعت میں بالکل سمجھ نہ آیا تھا آج بخوبی ہم دوسروں کے سامنے رکھ سکتے ہیں۔ بابا جانی کا قول ہے۔

''جس کو اپنی بیٹی پر اعتبار ہو وہ کتے نہیں پالا کرتا۔''

''ہاتھی دانت'' کی طب میں بڑی اہمیت ہے مگر ''ہاتھی دانت'' صرف محاورہ ہی نہیں جو کھانے کے اور دکھانے کے اور ہوا کرتے ہیں۔

ہم نے فروغ تعلیم کا ناٹک کرنے والے ایسے نامہرباں بھی دیکھے ہیں، مسابقت کے خیال سے اپنی بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے بعد ان کی مزید تعلیم کے بھی خلاف حتیٰ کہ حاصل کردہ تعلیم کے لیے مدرس کے کردار کے بھی خلاف الغرض وہ بیٹیاں محفل میں شہزادیاں اور تنہائی میں پتھر کے دور کی مورتیاں ہیں جن کی سانسوں کو بھی مجبوراً برداشت کیا جاتا ہے۔ ہماری چند عزیزائیں زندگی کے اس کربناک سچ کا سامنا کر رہی ہیں اور ہم اپنے امتحان سے فراغت پاتے ہی ان کے حوالے سے ''سسکتی سانسیں'' کے عنوان سے ایک افسانہ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس میں بھی اسی چانس، حوصلہ افزائی اور جستجو کا کردار ہو گا جو محمد یوسف وحید کی ادب شناسی اور حق نگاری ہم ایسے کئی گم نام والے قلم کاروں، ادیبوں اور ٹیلنٹڈ پرسنز کے دم قدم سے حاصل ہوئی ہے۔ وقت کے دامن میں وسعت ہوتی تو ہم اس کار خیر میں اپنے حصے کا کردار نبھاتے کیونکہ ادبی خدمت کی وجہ سے ہمارے اندر کے انسان نے ایک جرأت کا احساس اجاگر کر لیا ہے اور جب کبھی ہم ادبی بے ادیبوں اور اسی قبیل کی زبوں حالیوں کے گواہ ہوتے ہیں تو پھر محمد یوسف وحید جیسے کرداروں کا خیال اس شعر میں ڈھل کر قرطاس ذہن پر نمایاں ہو جاتا ہے۔

کہہ رہے ہیں چند بچھڑے رہبروں کے نقش پا
ہم کریں گے انقلاب جستجو کا اہتمام

حفیظ شاہد کی شاعری شعری حوالے سے مقامِ پیغمبری کے تمام تر تقاضے بطریق احسن نبھاتے ہوئے ملتی ہے۔ فنی پختہ کاری سے تبلیغ کے تمام تر پہلو جمع کر کے اصلاح احوال کی بہترین سبیل کر لی گئی ہے اور معنویت کے لحاظ سے ہر شعر ایک الگ ملک کی سیر او تخلیق کار کے قلمی عروج کا بالکل اسی طرح بین ثبوت فراہم کرتا ہے۔ جس طرح حضرت پیر علامہ سیّد محمد فاروق القادری کی شہرہ آفاق تصنیف ''اصل مسئلہ معاشی ہے'' پڑھنے کے بعد اس

عظیم محقق اور رمز شناس انشا پرداز کے عالم علوم میں بس ہر فن مولا ہونے کا بین ثبوت فراہم ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے مؤقف کی تائید کے لیے یہ اشعار آپ کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں اور آپ کو فیصل قرار دیتے ہیں۔ آپ دیکھیے کہ ان کی قوت مشاہدہ، فکری پرواز مطالعہ کی کرشمہ سازی اور قلم کا جادو کس طرح سر چڑھ کر بولنے پر ہر آن آمادہ ملتا ہے۔

کچھ نہیں رکھتے ہیں اپنے آپ کی پہچان بھی　　ہیں ابھی تک مبتلا ایک فخر آبائی میں ہم

ہماری فکر تم چھوڑو ہمیں یہ کام آتا ہے　　اندھیروں میں بسر کرنا نظر میں کہکشاں رکھنا

گلوں کی بات اگر باغبان نہیں کرتا　　تو پھر کہاں میں کوئی ترجمان تلاش کروں

ان تین اشعار کے احاطے میں شاعر نے دشت عشق میں خود فراموشی اور پدرم سلطان بود کے سماجی ہتھکنڈے کا خوب بیان کیا ہے۔ پھر دوسرے منظر میں کسی بھی حال میں زندگی کر کے مثبت روی کو رواج دینے کا درس دیا جا رہا ہے اور پھر احباب اختیار اور عائلی زندگی میں ذمہ داری سے انکار پر احتجاج خوبصورت اور مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ الغرض حفیظ شاہد کی شاعری میں عام فہم الفاظ کے جادو سے اثر پذیری کے عمل کو معراج کرنے کا پورا پورا انتظام موجود ہے۔ تسلسل اور سلاست کے حسن کو گویا کوئی ان سے سیکھے۔ شعور انسان کی وہ دولت ہے جو وردان خداوندی ہے اور اسی کی وجہ سے وہ مسجودِ ملائیکہ بھی قرار پایا ہے لیکن ادراک نہایت ضروری ہے ورنہ امرت سرہانے ہوتے ہوئے بھی زہر کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔

شعور وادراک کا کتابی سلسلہ جتنا تعریف وتوصیف کا متقاضی ہے امتحانات کی وجہ سے ہم وقت کے دامن میں تنگی محسوس کرتے ہوئے ایک اعتراف آپ کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں جو بعد میں حاضر کے منکرین اور معترضین کے زباں ودل پر بھی ضرور ظاہر ہوگا کہ شعور وادراک کا مزید سفر کر کے محمد یوسف وحید مشقت اور ولولے کے بل بوتے گوہر شناس بھی ہو چکا ہے اور سلیقے سے مالا پرونے کا ہنر بھی سیکھ چکا ہے۔ جس کا ثبوت شعور وادراک کا فنی ارتقاء اور لحہ لحہ بڑھتی ہوئی ہردلعزیزی ہے۔

مزید خوشی یہ ہے کہ محمد یوسف وحید نے صنفِ نازک سے جڑے ادب کو تلاش کر کے ادب کو نزاکت آفریں کر دیا ہے۔ نئے لکھاریوں کی جستجو بھی بدستور جاری ہے ورنہ ادب اور ادیب یوں نوحہ کناں پائے جاتے تھے کہ

کسی کو بھی کچھ حسب آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا

صنفِ نازک کی حوصلہ افزائی دراصل حوا کی بیٹی کے لیے آکسیجن فراہمی کا درجہ رکھتی ہے جس کے لیے شعور و ادراک کے مدیر مبارک باد کے مستحق قرار پاتے ہیں ورنہ حال تو یوں تھا

دفنا دیا گیا مجھے چاندی کی قبر میں
میں جس کو چاہتی تھی وہ لڑکا غریب تھا

☆☆☆

خصوصی مطالعہ

سیّد عامر سہیل (ایبٹ آباد)

زندہ حقیقتوں کا شاعر... حفیظ شاہد

کسی بھی موضوع پر لکھنے سے پہلے ایک سوال ہمیشہ مجھے پریشان کیے رکھتا ہے کہ کسی بھی فن پارے پر تنقیدی یا نیم تنقیدی مضمون لکھنے کا کیا جواز بنتا ہے؟ کیونکہ تخلیق اپنے ہونے کا جواز اور معیار خود پیش کرتی ہے۔ میں جب بھی کسی کو لطیف یا خوب صورت تخلیق پر نہایت خشک اور غیر شاعرانہ لکھنے کے پسِ پردہ عوامل پر غور کرتا ہوں تو اس میں تخلیق کی تفہیم اور تفسیر کے مقاصد کم جبکہ اپنے تنقیدی اور ادبی قد کاٹھ کو بڑھانے کے محرکات زیادہ نمایاں ہوتے ہیں اور شاید تخلیق کے عمل میں ایک تخلیق کار بھی کم و بیش اسی صورتِ حال سے گزرتا ہے خواہ اس تخلیق کار کی ذات فردکی ہو یا کسی کائناتی اکائی کی مگر یہاں فرق ناقد کے نیم مریضانہ اور تخلیق کار کے انانیت پسند رویے کا ہوتا ہے۔

حفیظ شاہد کی شاعری پر لکھتے ہوئے اسی انداز کے سوالات ذہن میں اُبھرتے ہیں اور ذہن فوراً مضمون لکھنے کے جواز کو تلاش کرتا ہے مگر شاید کائنات اور اس کے خالق کی طرح تخلیق کو بھی کسی نہ کسی سطح پر تسلیم کرنے اور اس کی تفسیر کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔

حفیظ شاہد کے بنیادی تخلیقی تجربات، موضوعات کی جہتوں، اظہار کے پیرائیوں کلام میں شاعرانہ حیثیت کے حوالوں اور کرافٹ کی جکڑ بندیوں کا جائزہ لینے سے پہلے ان پسِ پردہ عوامل کو سامنے لانا بھی بہت ضروری ہے جو تشکیل اور تدوین کے مراحل سے گزر کر شاعر کی عمومی نفسیات اور پھر اس کی شاعری کو متاثر کرتے ہیں۔

اِن عوامل میں سب سے اہم آج کے عہد کی صورتِ حال ہے۔ آج کا عہد اور اس کے رویے ہر فرد کے مزاج اور عمومی نفسیات پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں اور خصوصاً ایک شاعر اسے ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ آج کے عہد میں کہ جہاں نئے اقتصادی اور سماجی نظام کی بدولت زندگی کی قدریں تیزی سے بدل رہی ہیں؛ جہاں سرمایہ دار اور ملٹی نیشنل کمپنیاں نہایت معمولی اشیاء کو رنگین اشتہارات اور دلکش ماڈلز کے ذریعے زندگی کا لازمی جزو قرار دینے پر تلی ہوئی ہوں، جہاں مستقبل سے بے خبر خوں ریز دھماکوں پر لڈی ڈالنے اور مٹھائی تقسیم کرنے والوں نے زندگی کو ایسی ڈگر پر لا کھڑا کیا ہو جہاں علم، دانش، شعور، امن، محبت اور اخلاقی اقدار کی حیثیت کرم خوردہ کتابی ملفوظات سے زیادہ نہ ہو اور جہاں لاحاصلی، بے چینی، بے سمتی، انسانیت کی تذلیل اور بے قدری حال کا منظر نامہ بتا رہی ہو اس صورتِ حال میں اگر سو گرام کے کاغذ پر بیس گرام کی شاعری پسندیدگی اور قبولِ عام کا معیار ٹھہرے تو حیرانی کی بات نہیں ہے۔

ایک اور حوالہ عہدِ حاضر میں شاعری کی صورتِ حال کا ہے۔ بیسویں صدی میں اقبالؒ کے بعد چار بڑے نام دکھائی دیتے ہیں۔ فیضؔ، ن۔ م۔ راشدؔ، میرا جی اور مجید امجد اور اتفاق سے یہ تمام شاعر نظم کو وسیلۂ اظہار بناتے ہیں مگر ان کے ساتھ ساتھ ناصر کاظمی، فراق گورکھپوری، شکیب جلالی، ظہیر کاشمیری، سیف الدین سیف، ثروت

حسین، اظہار الحق اور ظفر اقبال وغیرہ کی شکل میں غزل کی مضبوط روایت بھی ہمارے سامنے ہے۔ان شعراء کے یہاں موضوعات اور ہیئت کے حوالے سے نئے تجربات بھی واضح نظر آتے ہیں۔آج کے شعری منظر نامے میں کہ جہاں روایتیں بتیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں اور لفظ کے ہاتھ سے معنی پھسلتے جارہے ہیں اس صورتِ حال میں غزل کہنے والے پر ایک بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک اہم عنصر جو اُن کی شاعری کو متاثر کرتا ہے وہ ان کا ماحول ہے اور جہاں فیوڈل سماج فرد کی سوچ پر اثر انداز ہوتا ہے اس سماج میں وہ انسان کی عظمت، سربلندی، انصاف اور مزاحمت کی بات کرتے ہیں۔یہاں کے لوگوں کی تمام تر محرومیوں کے باوجود سچے اور کھرے فن کار بڑی چابک دستی سے مزاحمتی روّیوں اور موضوعات کو پروان چڑھا رہے ہیں۔

یہ ہیں وہ پسِ پردہ خارجی عوامل جو حفیظ شاہد کی شاعری کو متاثر کرتے ہیں۔حفیظ شاہد کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد جو بات واضح طور پر سامنے آتی ہیں وہ ایک نیا عہد اور ایک نئے انسان کی تلاش کا عمل۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان گم ہی کب ہوا تھا کہ اُسے تلاش کیا جائے؟اس حوالے سے یہ عرض کرنا ہے کہ انسان ان کے یہاں ایک بلیغ علامت کے طور پر آیا ہے۔جہاں تک اس کے ہونے یا نہ ہونے کا تعلق ہے تو موجود اور ناموجود کی بحث خالصتاً فلسفیانہ ہے جبکہ شاعری کی اپنی منطق اور اپنا فلسفہ ہوتا ہے۔حفیظ شاہد فلسفیانہ بحث میں پڑنے کی بجائے زندگی کو زندہ حقیقت کے طور پر لیتے ہیں اور اسی حوالے سے انسان، انسانی روّیوں، اس کی سوچ فکر، سچ جھوٹ، نیکی بدی غرض ہر حوالے کو پیش کرتے ہیں۔یوں انسان ان کے یہاں ایک تہذیبی اکائی کی شکل اختیار کر جاتا ہے اور جہاں کہیں بھی اس تہذیبی اکائی کو توڑنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں حفیظ شاہد کا مزاحمتی روّیہ اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔اس طرح ایک خاص تہذیبی، ثقافتی اور علاقائی تناظر میں حالات و واقعات اور انسان کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔چند شعر دیکھیں:

گزرنے والی ہے رات غم کی سحر کی منزل قریب تر ہے
اب آندھیوں سے چراغ اپنا بچا بھی لیں گے تو کیا کریں گے
ہمارے ہاتھوں پہ ہیں مقدر کی جو لکیریں وہی رہیں گی
ہم اپنے چہرے پہ اُس کا چہرہ سجا بھی لیں گے تو کیا کریں گے

بربادیٔ گلشن کی خبر سب کو ہے لیکن
غافل ہے میرے شہر کا سلطان ابھی تک
تو واقفِ اسرارِ محبت ہی نہیں ہے لیکن
لگتا ہے تجھے عشق جو آسان ابھی تک

جو کہتا ہوں غزل حالات کی عکاس ہوتی ہے
میرے ہر لفظ میں اک نزہتِ احساس ہوتی ہے

جدا ہو کس طرح انسان اپنی اصل سے شاہد
رگِ گل میں تنِ اشجار کی بُو باس ہوتی ہے

حفیظ شاہد کھلی آنکھوں کا شاعر ہے۔ وہ زندگی کا مشاہدہ براہِ راست کرتے ہیں اور پھر اس مشاہدے کو اپنے تجربات کا حصہ بناتے ہیں۔ ان کے یہاں معروضی حقیقت (OBJECTIVE REALITY) کو مختلف جہتوں سے دیکھنے اور اسے اپنا تجربہ بنانے کا ہنر واضح نظر آتا ہے۔ ہمارے اردگرد بے شمار موضوعات سانس لے رہے ہیں، بے شمار افراد اپنے افعال سرانجام دے رہے ہیں اور زندگی یوں رواں دواں ہے مگر کیا اس معروضی واقعیت سے کوئی تجربہ جنم لے سکتا ہے؟ یہ بہت اہم سوال ہے جو ایک شاعر اور اس کی شاعری کے حوالے سے کیا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک شاعر اور ایک عام فرد میں یہی ایک فرق ہے کہ دونوں زندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں دونوں معروضیت سے متاثر ہوتے ہیں مگر خارج کو داخلی تجربہ بنانے کا عمل ایک شاعر ہی کے یہاں نظر آئے گا۔ یعنی قوتِ مشاہدہ اور تخلیقی عمل دوسروں کے تجربے کو شاعر کا تجربہ بنا دیتے ہیں مگر یہاں میرا ذاتی خیال ہے کہ شاعر کی انفرادیت اس کے موضوعات سے زیادہ اس کے اُسلوب، اندازِ بیان اور اس کی TREATMENT سے وابستہ ہے۔ حفیظ شاہد زندگی کی زندہ حقیقتوں کے شاعر ہیں لہٰذا وہ شعوری سطح پر زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر نہایت کامیابی سے اُسے شعر میں ڈھالتے ہیں یوں کسی حد تک ان کے یہاں ایک خاص زاویہ نظر سے دیکھنے پر آورد کا پہلو نظر آتا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی آمد کے نظریے کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتا بلکہ شعر کو شعوری کاوش ہی خیال کرتا ہوں۔ اس حوالے سے اگر کوئی صاحب علم آمد کے نظریے کی حمایت کرتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں البتہ ان کے سامنے میں مجید امجد اور راشد کی شاعری ضرور رکھوں گا جو آورد کی بہترین مثالیں ہیں۔ خیر یہاں بات حفیظ شاہد کے شعوری پیکر تراشی کی ہو رہی ہے تو ان کے یہاں اظہار کا گداز اور بات کرنے کا قرینہ اُنہیں دوسرے شاعروں سے مختلف کرتا ہے مثلاً:

مجھے کچھ بھی نہیں حاصل ہوا اونچی اڑانوں سے
قدم اپنی زمیں پہ اب جما کر دیکھ لیتا ہوں

کریں تبصرہ خشک سالی پہ کیسے
زمیں ہے کسی کی، گھٹائیں کسی کی

تبدیلیوں کی راہ پہ چلنے تو دے مجھے
خود کو بدل رہا ہوں بدلنے تو دے مجھے
بارِ غمِ حیات اُٹھا لوں گا اور بھی
اے انقلابِ دہر سنبھلنے تو دے مجھے

حفیظ شاہد کی شاعری عہدِ حاضر کے حساس شاعر کے ذہنی اور فکری معیارات کی ترجمان ہے جو جدید عہد کے

تقاضوں اور اس کے روّیوں کو سمجھتا ہے مگر ہمارے یہاں جدیدیت اور جدیدیت جیسے لایعنی اصلاحات کے ذریعے ایسی شاعری کو دخل دیا گیا ہے جو نہ صرف فکری سطح پر بھی بانجھ پن کا شکار ہے۔ ایسی ہی ایک مثال آزاد غزل کی ہے اور نجانے کیوں لوگ اسے تجربہ کہنے پر تلے ہوئے ہیں جبکہ انہیں معلوم نہیں کہ فکری اور فنی سطح پر کیا جانے والا تجربہ محض الفاظ کا اُلٹ پھیر نہیں ہوتا بلکہ اس کے پس منظر میں روایت کا گہرا شعور اور ایک پورے معاشرے کا ذہنی وتہذیبی ارتقاء ہوتا ہے اور پھر کہیں مدتوں کی ریاضت کے بعد کوئی روّیہ ایک تجربے میں ڈھلتا ہے۔ حفیظ شاہد کے یہاں موضوعات کا تنوع ملے گا مگر وہ فنی سطح پر ہیئت کا تجربہ نہیں کرتے بلکہ اس معاملے میں وہ روایت پسند واقع ہوئے ہیں اور یہ بات قابلِ تحسین ہے کہ نظم نگاری کے عہد میں ایک شاعر غزل کو کامیابی سے ذریعہ اظہار بناتا ہے۔ چند مثالیں دیکھیں:

نئے طرزِ سخن کو تم نے مانا ہے نہ مانو گے
ہمارے فکر و فن کو تم نے مانا ہے نہ مانو گے
تمہاری انجمن میں ہے نئے افکار کا چرچا
روایاتِ کہن کو تم نے مانا ہے نہ مانو گے

شاعر کے تخلیقی عمل کے حوالے سے ایک قابلِ غور نکتہ یہ بھی ہے کہ ایک شاعر کا ذہن ہر لحہ نئے منظر بناتا رہتا ہے اس کے یہاں اگرچہ خیال کا تسلسل ملے گا مگر اس کا ہر لفظ نئے منظر کا آئینہ دار ہوتا ہے اور یہی لفظیات اس کے فکری اور نفسیاتی تجربے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ حفیظ شاہد شاعرانہ روّیوں کے حوالے سے نہایت محتاط شاعر ہیں ان کے یہاں محبت کا تجربہ روایت کے تناظر میں نظر آتا ہے مگر اس تجربے کا اظہار میں وہ بہت محتاط دکھائی دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں محبت جسمانی لذت سے زیادہ ایک مکمل تخلیقی واردات نظر آتی ہے۔ آج کے عہد کو ناقدین تمثالیت (IMAGEPLPGY) کا عہد قرار دے رہے ہیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی اسی انداز کو اختیار کیا گیا ہے۔ خصوصاً ناول میں اس تکنیک سے کام لیا ہے۔ حفیظ شاہد کے یہاں بہت سے اشعار میں اسی وظیفے سے کام لیا گیا ہے مثلاً:

چراغِ چشمِ تر کب تک جلے گا
یہ خوابوں کا نگر کب تک چلے گا
مسلسل آتشِ جورِ خزاں میں
میرے دل کا شجر کب تک جلے گا

ہوا خاموش پتے سو رہے ہیں
ابھی شاخوں پہ غنچے سو رہے ہیں
سرِ دیوار سورج تپ رہا ہے
پسِ دیوار سائے سو رہے ہیں

میرا عقیدہ ہے کہ ہر عہد اپنے روّیوں اور فکری انقلابات کے ساتھ سانس لیتا ہے نیز ہر سچائی اضافی

(RALITIVE) ہوتی ہے جو زماں اور مکاں (TIME & SPACE) کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے اسی طرح ہر عہد کا اپنا سچ ہوتا ہے۔ اور انسان اس سچائی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ حفیظ شاہد کے یہاں اس سچائی کو پانے کی خواہش کا اظہار ملتا ہے ان کی غزل ایک رجائیت پسند شاعر کی غزل ہے۔ جو زمانے سے مایوس نظر نہیں آتا ہاں البتہ راہِ شوق میں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کرتے ہیں اور بعض اشعار میں تو اس میکانکی عہد کے نتیجے میں اُبھرنے والے تہذیبی لاشعور کے جمود کا نوحہ بھی لکھتے نظر آتے ہیں۔ مروّت، خلوص، سچائی، محبت کی عدم دستیابی اور فرد کی شکستگی اُن کے موضوعات ہیں:

آج بھی مشکلات کم تو نہیں
بارشِ حادثات کم تو نہیں
ایک سورج غروب ہونے سے
رونقِ کائنات کم تو نہیں

خدا جانے ہمارے شہرِ ارماں میں ابھی تک
اندھیروں نے طوافِ کوچہ و بازار کرنا ہے

آپس میں ہیں مربوط مگر دُور ہیں کتنے
ہم لوگ بھی دریا کے کناروں کی طرح ہیں

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ حفیظ شاہد کی غزل روایت کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی نئی جہتوں کو ہمارے سامنے لاتی ہے ان کے یہاں موضوعات سے دیکھیں تو ان کے یہاں رواں بحروں کا انتخاب نظر آئے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ردیف اور قافیہ اور نئی زمینوں کی تلاش میں شوق میں انہوں نے نام نہاد قادر الکلامی نہیں دکھائی بلکہ سیدھے مگر سچے لفظوں میں زندگی کی کہانی بیان کر دی ہے۔ مثلاً:

کوئی نشانی عہدِ وصال دے جائے
وہ میری عمر میرے ماہ و سال دے جائے
تمام عمر کی خوشیاں سمیٹ کر میری
تمام عمر کے اپنے ملال دے جائے

مختصر یہ کہ حفیظ شاہد کی شاعری اپنے عہد کی آئینہ دار ہے۔ ان کے یہاں شعر اپنی نازک لطافتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے وہ شعر کو فلسفہ یا تصوف کے نگیں نہیں ہونے دیتے اور نہ ہی بے ربط جدیدیت کے علمبردار ہیں بلکہ انہوں نے شعر کو شعری کے انداز میں کہا ہے۔ وہ زندگی کو حقیقت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور شاید شاعری کی بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر انسان کی ترتیب کرتی ہے اور اس اعتبار سے حفیظ شاہد نے اپنے عہد کی کامیاب غزل کہی ہے۔

☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر نواز کاوش (بہاول پور)

توانا لب و لہجے کا شاعر... حفیظ شاہدؔ

ستر کی دہائی کے آخری حصے میں خان پور شہر سے میرا تعلق استوار ہوا۔ وہاں میرے بھائی پولیس میں ملازمت کرتے تھے، اس لیے اِس شہر کے لوگوں سے رَسم وراہ ہوئی۔ شعر وادب سے تعلق کے سبب حیدر قریشی سے اچانک ملاقات ہوئی۔ اس وقت شہر میں داخل ہوتے ہی سول ہسپتال کے سامنے اُن کا گھر تھا لہٰذا خان پور میں میرا پہلا پڑاؤ اُن کی بیٹھک ہوا کرتی تھی۔ ان کی پر خلوص اور محبت کرنے والی شخصیت میں سحر انگیزی تھی اس لیے تعلق بڑھتا چلا گیا۔ میرا تعلق ریڈیو پاکستان سے بھی تھا۔ ادبی پروگرام کے میزبان ہونے کے ناتے حیدر قریشی، صفدر صدیق رضیؔ، صفدر نزدوش ترابیؔ، فرحت نوازؔ، آسیؔ خان پوری اور حفیظ شاہدؔ سے تعلق رہتا تھا۔ اسی دوران میں پروفیسر منظور شادؔ گورنمنٹ کالج خان پور تعینات ہوئے تو ادبی تقریبات کا سلسلہ بھی جاری ہوا۔ آسیؔ خان پوری وکالت کے ساتھ ساتھ خوبصورت شعر بھی کہتے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاں مشاعروں اور شعری نشستوں کا اہتمام کیا جن میں ہم بہاول پور سے تعلق رکھنے والے شعراء اُن کے ہاں حاضری دیا کرتے تھے۔ انھی دنوں حیدر قریشی نے جدید ادب کا اجراء کیا جس سے ملک کے ممتاز دانشوروں اور لکھاریوں کو ایک پلیٹ فارم مل گیا۔ وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی الگ الگ ادبی پرچے نکالتے تھے۔ حیدر قریشی نے وزیر کے ہمنواؤں کو اکٹھا کیا۔ بہت سی ادبی مباحث کا اہتمام کیا جو کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ "جدید ادب" کے ابتدائی پرچوں میں بہاول پور سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کو بھی چھپنے کا موقع ملا۔ یوں اس خطۂ ریگزار میں شعر وادب کے کارواں نے تیزی سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔

آسیؔ خان پوری کے ہاں ایک شعری نشست ہوئی جس میں شہر کے نمائندہ شاعروں نے شرکت کی۔ مہمان شعرا میں ہمیں بھی شریک ہونے کا موقع ملا۔ اس نشست میں صفدر نزدوش ترابی کی گرج دار آواز اور جملے بازی نے متاثر کیا۔ وہیں ایک کونے میں ایک ایسی شخصیت بھی نظر آئی جو نہایت خاموشی اور سنجیدگی سے اچھے شعروں پر دل کھول کر داد دے رہی تھی۔ عینک کے پیچھے شرارتی آنکھوں میں مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھی اس شخصیت کا ہنر اُس وقت کھلا جب انھوں نے اپنے اشعار سنانا شروع کیے۔ محفل دم بخود اور انہماک کے ساتھ اُن کی شاعری سے محظوظ ہو رہی تھی۔ ان کا لب ولہجہ، آہنگ اور اُسلوب یکسر مختلف تھا جو اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ یہ شاعر فکری انفرادیت کا حامل ہے۔ وہ ایک فیکٹری میں ملازمت کرتے اور بہت جلد اپنی دل آویز شخصیت کے باوصف دل میں گھر کر لیتے تھے۔ ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوا تو ان کی فنی جہتوں کے دَر وا ہوتے گئے۔ یوں اس سرزمینِ محبت اور شعر وسخن کی دنیا سے ایک ایسا قد آور شاعر دریافت ہوا جس میں اُردو ادبی شعری روایت میں نئی اُمنگوں کے چراغ روشن کیے۔ جس نے مرکز سے دور دراز بیٹھ کر ستائشِ باہمی اور گروپ بندی کے ماحول میں بڑے ادیبوں

اور شاعروں کو تعریف وستائش کے لیے مجبور کر دیا۔ بڑوں کا یہ اعتراف اُنھیں اعتبار دیتا چلا گیا اور اُنھوں نے غزل کی زمین میں فکر واحساس کے وہ رنگ جمائے کہ شاعری کو زندگی وتوانائی عطا کر دی۔

خان پور ادب اور ادبی سرگرمیوں میں ہمیشہ فعال رہا ہے۔ خواجہ فریدؒ کی کافیوں سے معطر یہ سرزمین شعر وادب میں نمایاں رہی ہے۔ محسن خان پوری اُردو شاعری کے ارتقائی عہد میں ایک حوالہ رکھتے ہیں۔ اسی شہر میں حفیظ شاہد نے غزل میں نام ہی نہیں کمایا بلکہ جدید فکری تہذیبی اور سماجی زندگی کو اپنے ہاں جگہ دی ہے۔ انہوں نے غزل کے کینوس میں خیالوں کی جلترنگ سے دھیمی آنچ میں تجربوں اور مشاہدوں سے چونکا دیا۔ یوں مضافات میں بیٹھا یہ تخلیق کار شاعری کے سحر سے ادبی دنیا میں ہل چل مچانے لگا۔

حفیظ شاہد ۲۵ رجون ۱۹۴۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام عبدالحفیظ تھا۔ ان کے آباء واجداد کا تعلق گڑھا ہنداں ضلع جالندھر مشرقی پنجاب سے تھا۔ ان کے والد میاں خیر الدین ملٹری میں مکینیکل فٹر تھے۔ انہوں نے غزل کے آٹھ مجموعے شائع کیے جن میں ''مہتاب غزل'' ۱۹۸۱ء، ''سفر روشنی کا'' ۱۹۸۳ء، ''چراغ حرف'' ۱۹۸۹ء، ''یہ دریا پار کرنا ہے'' ۱۹۹۹ء، ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' ۲۰۰۴ء، ''سورج بدل رہا ہے'' ۲۰۰۸ء اور کلیات ''ختم سفر سے پہلے'' ۲۰۱۰ء شامل ہیں۔ ان شعری مجموعوں میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، عارف عبدالمتین، رئیس امروہوی، ڈاکٹر جمیل جالبی، شفیق الرحمٰن، مظہر امام، محسن نقوی، ڈاکٹر خواجہ زکریا، شبنم رومانی، اظہر جاوید اور سہیل اختر جیسے نابغۂ روزگار ہستیوں نے ان کے شعری محاسن کی تعریف کی۔ صرف تعریف ہی نہیں بلکہ انہوں نے حفیظ شاہد کو غزل کے میدان کا شہسوار قرار دیا ہے اور ان کی بحور، تشبیہات، استعاروں اور علامتوں کو نئے پیرہن میں دیکھا ہے اور انہیں جدید غزل کے مستقبل کے امکانات کا شاعر قرار دیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے اشعار میں دلوں کی ترجمانی کی اور جذبوں کو دھڑکنوں سے ہم آہنگ کر دیا۔ فطرت اور خوبصورتیوں کو انہوں نے جمالیاتی اُسلوب میں یوں سمویا ہے کہ شعر ذہن وروح میں جگہ بنانے لگتے ہیں۔ اسی معنویت کے طلسم کو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے محسوس کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ان کا کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے نئی معنویت کو نئے جمالیاتی اظہار کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ کیا ہے اور یہی غزل کے فن کا کمال ہے۔ اس کی مثالیں غزل کی تاریخ کے ہر دَور میں ایسے شاعروں کے ہاں ملتی ہیں جن کا احساس نیا ہے، جو بدلتی ہوئی زندگی کو سمجھنے اور اس کو دوسروں تک پہنچانے کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔''

دیہی زندگی کے رنگ وروپ، مہکتے لہکتے کھیت، اشجار کی ٹہنیوں پر مدھر گیت گاتے پرندے، نہروں پگڈنڈیوں کے خاموش مناظر اور کھلے دریچے آنکھوں سے دل میں مصور ہو جاتے ہیں۔ انہی منظروں کو انہوں نے کچھ اس طرح اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔

گاؤں میں جا کر جو دیکھا اپنا آبائی مکان
وہ دریچے، بام و در، وہ طاق سب اچھے لگے

☆

پرانے شہر کے منظر نئے لگنے لگے مجھ کو
ترے آنے سے کچھ ایسی فضائے شہر بدلی ہے

☆

نئی شاخیں ، نئے پتے ہی پیوستہ نہیں ہوتے
نیا موسم بھی ہوتا ہے شجر کے ساتھ وابستہ

حفیظ شاہد نے چھوٹی بحور میں بھرپور اظہار سے متوجہ کرنے کی سعی کی اور اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ چھوٹی بحر میں بات کرنا اور مکمل بات کرنا بہت کٹھن ہے اگر اس میں احساسات کی لطافت اور نغمگی بھی شامل ہو جائے تو غزل گیت کے قریب ہو جاتی ہے۔ ناصر کاظمی نرم و نازک دھیمی آنچ میں جذبوں کو مہکاتے ہیں اور امر ہو جاتے ہیں۔ یہ شعری لطافت ہمیں حفیظ شاہد کے ہاں بھی ملتی ہے۔ مثال دیکھئے:

بارِ غم وائم سے کہیں چھت نہ گر پڑے
ڈرتا ہوں یہ بدن کی عمارت نہ گر پڑے

☆

لے گیا رونقیں وہ ساتھ اپنے
شہر برباد کر گیا دل کا

☆

شاہد اکثر پچھلی رات
اس کی یاد میں رویا کر

اساطیری مناظر ہوں، ماضی سے جڑا ؤیا روایت کی پاسداری حفیظ کی غزل میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لفظی تشکیلات کے ساتھ ساتھ کلاسیکی تقلید کی خوشبو اُن کے ہاں ملتی ہے۔ کلاسیکی طرزِ احساس کے بارے میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے لکھا ہے: ''حفیظ شاہد کی شاعری جدید عہد کی تازگی، ڈرامائی کیفیتوں کے ساتھ کلاسیکی شاعری کے محاسن سے مزین ہے۔'' ڈرامائی کیفیت اور کلاسیکل شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو:

مجھے کچھ بھی نہیں حاصل ہوا اونچی اڑانوں سے
قدم اپنے زمیں پر اب جما کر دیکھ لیتا ہوں
اجل اور زندگی کی دوستی اِک حرفِ باطل ہے
بہت دشوار ہے پانی پہ بنیادِ مکاں رکھنا

☆

کبھی تو دشت میں ابرِ بہار بھی لائے
ہوا تو ریت کے بادل اڑاتی رہتی ہے

خواجہ غلام فریدؒ کی صوفیانہ شاعری، محسن خان پوری کی ایہام گوئی، گلزار احمد نادم صابری کی مرثیہ نگاری اور حیدر

قریشی کی ماہیا کی روایت کی حامل یہ دھرتی اپنا ایک الگ تشخص رکھتی ہے۔ علم وآ گہی اور شعر وادب کی سوندھی خوشبو سے معطر اس سرزمین کو نئے اُسلوب سے متعارف کرانے میں حفیظ شاہد کا بھر پور کردار ہے۔ شمالی پنجاب سے یہاں آ کر اُنہوں نے محنت مزدوری کی۔ پردیس کی مٹی سے اپنا تعلق جوڑا۔ محبتوں کا سائبان بن کر اُس کی چھاؤں میں نئے تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی اور مشکل حالات سے مردانہ وار مقابلہ کر کے خود کو منوایا۔ بہاول پور ڈویژن کا کوئی بھی مشاعرہ ہو، اُن کے بغیر ادھورا ہوا کرتا تھا۔ شعر پڑھنے کا انداز پرکشش اور خوب تھا۔ داد لینے کا ہنر جانتے تھے اور مشاعروں میں چھا جاتے تھے۔ اسی وجہ سے یزدانی جالندھری نے لکھا ہے:

''اَدبی فضا سے دور اُفتادہ خان پور جیسے شہر میں جن دو چار ہستیوں نے شعر و ادب کا پرچم بلند کیا، ان میں ایک نمایاں بلکہ نمائندہ نام حفیظ شاہد کا ہے۔''

معروف دانشور، محقق اور استاد ڈاکٹر خواجہ زکریا نے بھی ان کے فنی محاسن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''حفیظ شاہد خیر کی اقدار کے علم بردار ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ جو چیز ان کی غزل کو ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے، وہ کائنات کے حسن پر اسرار میں مسلسل مشاہدہ اور اس سے لطف اندوزی، یہ ان کی غزل کا ایک خاص رنگ ہے۔ جدید غزل نگاری میں شاید ہی کوئی دوسرا ان موضوعات میں ان کا حریف ہو سکے۔''

جدت طرازی، فکر تازہ اور موضوعات کا تنوع، محاکات، مصوری، مرصع کاری اور لفظوں کا برمحل انتخاب کے حوالے سے ان چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ضرورت ہے اگر جلتے دیے کی
ہوا کا سامنا کیوں کر رہے ہو

☆

میں اپنے آپ پر یوں ہنس رہا ہوں
کمی تو آئے کچھ افسردگی میں

☆

اندھیروں میں جہاں ملتا نہیں ہے راستہ کوئی
وہاں میں اپنے دل کی روشنی سے کام لیتا ہوں

☆

بدلے ہوئے حالات کے تیور بھی تو دیکھو
اچھا نہیں ہر وقت گراں خواب میں رہنا

☆

اجاڑ دی ہے عجب زلزلوں نے یہ بستی
مکیں تلاش کروں یا مکاں تلاش کروں

لاہور سے نکل کے بڑے دُکھ اُٹھائے ہیں
اب اور ہجرتوں کا ارادہ نہیں رہا

☆

مجھ کو اپنی تلاش رہتی ہے
میں بھی موجود ہوں کہیں نہ کہیں

☆

شاہدؔ نہ جانے وہ مرے دن رات کیا ہوئے
وہ شب نہیں رہی وہ سویرا نہیں رہا

☆

جب سے ہماری سوچ علاقائی ہوگئی
نا اتفاقیوں سے شناسائی ہوگئی

☆

کھو گئے تعصب کے بے کراں اندھیروں میں
شہر کی فضاؤں میں میرے گاؤں کے بچے

☆

زمیں پر ایک جنت مانگتی ہیں
نئی نسلیں محبت مانگتی ہیں

حفیظ شاہدؔ کے پسندیدہ استعاروں میں شاخ، شجر، دیواریں، گھر، تناور درخت، صحرا، سبزہ زار، پرندے، تصویریں، دیہات، قصبے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ زندگی کی بے ثباتی، منافقت، ریاکاری، دوغلا پن، بے قدری کا احساس بھی سانس لیتا ہے۔ ان کے امیجز، لفظیات اور اُسلوب سادگی کا حسن رکھتا ہے۔ اظہار کا سلیقہ اور ابلاغ ان کی شاعری کا نمایاں وصف ہے مگر ذرا سا غور کرنے پر معنویت کے دریچے وا ہونے لگتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھئے:

شاہدؔ وہ شاخ رہتی نہیں بے ثمر کبھی
پیوستگی ہو جس کی مکمل شجر کے ساتھ

☆

مرا وجود تھا دیباچۂ کتابِ حیات
میں داستاں بھی رہا، زیبِ داستاں بھی رہا
دشمنوں سے بھی دوستی کر لی
دیکھ کر ہم نے دوستوں کے رنگ

اہلِ سفر کو سائے سے محروم کر دیا
اہلِ ہوس نے راہ کے اشجار بیچ کر

☆

ترے عہدِ ستم میں زندگانی
کڑی اُفتاد ہوتی جا رہی ہے

نئے نئے موضوعات، خیالات کی گیرائی اور فکر کی رعنائی ان کے ہاں غزل کو نیا پیرہن عطا کر دیتی ہے۔ انہوں نے سماجی رویوں، تاریخی صداقتوں اور تہذیبی مٹتی اقدار پر نوحہ خوانی کی ہے۔ وہ قدم قدم پر کڑھتے اور اداس ہوتے ہیں لیکن اُمید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ کبھی قنوطیت کے احساس کو اوڑھنا بچھونا نہیں بناتے بلکہ اس اسلوب میں زندگی کی رمق اور مستقبل کی قندیلیں ہوتی ہوئی محسوس ہوتے ہیں۔ انہوں نے حالات سے سمجھوتہ کر کے آنکھ موند کر زندگی نہیں گزاری۔ مشکل حالات میں جینے کا ڈھنگ سکھایا اور آنے والے کل سے مایوسی کا اظہار نہیں کیا۔ یہ رجائی طرز انھیں مستقبل کا شاعر بناتا ہے اور ان کی غزل میں مستقبل کے امکانات جھلکتے ہیں۔ دور افتادہ مضافات میں فکری چراغ جلانے والا حفیظ شاہد شعری ادبی تاریخ میں درخشندہ ستارہ بن کر ہمیشہ چمکتا رہے۔

حفیظ شاہد ۲۲ نومبر ۲۰۱۴ء کو اس جہان سے رخصت ہوئے۔ انہوں نے پسماندگان میں دو بیٹے اور چار بیٹیاں چھوڑے جو آج کل پُر آسائش زندگی گزار رہے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے فکری اثاثے پر تحقیق ہونی چاہیے تاکہ اُردو شاعری میں حفیظ شاہد کے قد و قامت کی صحیح آگاہی اور ادراک ہو سکے۔

☆☆☆

کلام حفیظ شاہد

کیوں قتل کے ارمان میں آزار اُٹھائیں
گردن مری حاضر ہے وہ تلوار اُٹھائیں

روکے سے مری طبعِ رواں رُک نہ سکے گی
رستے میں مرے لاکھ وہ دیوار اُٹھائیں

جو دل میں تمہارے ہے بتا کیوں نہیں دیتے
صدمہ جو اُٹھانا ہے تو یکبار اُٹھائیں

کیوں لوگ ہیں خاموش زبوں حال پہ اپنے
آواز ، سرِ کوچہ و بازار اُٹھائیں

نیلام جو کرتے ہیں یہاں جنسِ وفا کو
ممکن ہی نہیں ناز خریدار اُٹھائیں

یہ جُرمِ محبت نہیں واعظ کا مقدر
یہ بارِ گنہ ہم سے گنہگار اُٹھائیں

شاہد یہی لکھا ہے مقدر میں ہمارے
صدمات زمانے میں لگاتار اُٹھائیں

☆☆☆

حیدر قریشی (جرمنی) "سفرِ روشنی کا" پر گفتگو

روشنی کا سفیر... حفیظ شاہد

آج سے چند سال پیشتر میں نے "شفق رنگ" میں حفیظ شاہد کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے موسیقیت سے اس کا تعلق دریافت کیا تھا۔اب حفیظ شاہد کے مجموعہ "سفرِ روشنی کا" پر رائے دیتے ہوئے جیلانی کامران نے لکھا:

"حفیظ شاہد نے اس غزل کے ذریعے اپنے عہد اور اپنے ماحول کا گیت تحریر کیا ہے اور یہ گیت ایسے سفر کرنے والے انسانوں کا ہے جو سفر طے کرنے کے آرزومند ہیں اور سفر کی تکان جن کے ارادوں کو متزلزل نہیں کرتی"۔

مجھے جیلانی کامران کے اس تجزیے کو پڑھ کر اس لیے خوشی ہوئی ہے کہ اس سے میرے تجزیے کی تصدیق ہوئی ہے۔حفیظ شاہد کے ہاں لفظوں کی داخلی سطح سے پھوٹنے والی موسیقی ان کی شاعری کو گیت میں ڈھال رہی ہے اور یقیناً یہ گیت اسی عہد اور اسی ماحول کا ہے جس میں درد کی لے بھی ہے اور آواز کا سوز بھی۔

حفیظ شاہد کی شاعری کے جو چند اہم پہلو فوری طور پر سامنے آتے ہیں ان میں موجودہ زندگی کی بے معنی دوڑ، نفرتوں کا نوحہ، منافقتوں کا المیہ، جبر واستبداد کا کرب اور گمشدہ کلچر کا دکھ زیادہ نمایاں ہیں ۔

یوں نظر آتا ہے ہم بھی زندگی کی دوڑ میں
ہاتھ کچھ آئے نہ آئے دوڑتے رہ جائیں گے

زندگی کی بے معنی دوڑ کا ادراک رکھنے کے باوجود حفیظ شاہد زندگی سے نباہ کرنے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں:

زندگی تلخ تھی پھر بھی شاہد
خواب دیکھا کئے زندگی کے

ہمارے اردگرد رنگ، نسل اور مذہب کے نام پر جو منافرتیں پھیلائی جا رہی ہیں، حفیظ شاہد اس پر شدید حیرت اور دکھ کا اظہار کرتے ہیں:۔

کس نے ڈالی ہے نفرتوں کی طرح
دل ہوئے سخت پتھروں کی طرح

....

کچھ ایسا بدلا ہے رنگ زمانے کا
اب تو جھوٹے لوگ بھی سچے لگتے ہیں
نارِ دوزخ سے شاید یہ کم تو نہیں
نفرتوں کی جو پھیلی ہوئی آگ ہے

اپنے ماحول اور اپنے عہد کی حریت کا احساس حفیظ شاہد کے ہاں عصری حسیت کے ادراک کی صورت میں اُبھرتا ہے

ہم وطن میں بھی رہتے ہوئے دوستو!
اجنبی ہوگئے ہیں وطن کے لیے

....

جی رہے ہیں اس زمانے میں حفیظؔ
اس سے بڑھ کر بھی سزا کچھ اور ہے

....

لب کشائی کی اجازت بھی نہیں ہم کو حفیظؔ
ہم گرفتارِ بلا ہیں کس کے دستِ قہر میں

حفیظ شاہد کی شاعری کے یہ چند اہم پہلو جو ایک لحاظ سے تاریکی کا منظر پیش کرتے ہیں دراصل اس گمشدہ کلچر کے دُکھ کا مختلف انداز میں اظہار ہے جو ایک کل کی طرح ان کی شاعری کے سارے رویوں پر محیط ہے۔ وہ گمشدہ کلچر جب زندگی معنویت سے لبریز تھی۔ جب محبتیں نفرتوں میں تبدیل نہیں ہوئی تھیں۔ جب دوستی اور منافقت کے درمیان واضح حدیں موجود تھیں۔ جب جبر و استبداد کی ایسی اذیتیں نہ تھیں، جب انسان انسانیت کی سطح سے نیچے نہیں اترا تھا۔

جدید ادب میں گمشدہ ادب کا نوحہ ایک صحت منداور توانا رویے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے دراصل یہ آج کے سائنسی اور مشینی عہدے سے انسانی روح کی مخاصمت کا اعلان ہے اور ادب کی جملہ اصناف میں اپنی سچائی کا اظہار کر رہا ہے۔

حفیظ شاہد کے ہاں گمشدہ کلچر اور موجودہ سائنسی تہذیب کے بارے میں شعری اظہار پرتوں میں ملتا ہے۔ نیلی پرت میں وہ شہر کو سائنسی تہذیب کی علامت سمجھ کر اس سے اپنی بے زاری کا اظہار کرتے ہیں

بچا کے دولتِ ایمان ہم کہاں جائیں
ہوائے حرص و ہوس چل رہی ہے شہروں میں

....

گم کہیں نہ ہو جانا شہر کے جھمیلوں میں
میں کہاں کہاں تم کو بھیڑ میں صدا دوں گا

....

دیکھنا کچھ اور تازہ زخم لے کر آؤ گے
تم سمجھتے ہو تمہیں مرہم ملیں گی شہر میں

....

گاؤں کی آب و ہوا کچھ اور ہے
اور شہروں کی فضا کچھ اور ہے!

دوسری پرت میں وہ گاؤں سے اپنی محبت اور وابستگی کا اظہار کرتے ہیں جو موجودہ سائنسی تہذیب کی یلغار سے ایک حد تک محفوظ ہے

بچپن کٹا تھا جس کے خنک سائے میں حفیظ
دل میں ہے موجزن اسی بوڑھے شجر کی یاد!

....

مجھ کو ہے آج بھی وہ شہر سے بڑھ کر پیارا
میں جو اک عمر تیرے چھوٹے سے قصبے میں رہا
لوٹ آئے ہیں اسی چھوٹی سی بستی میں حفیظ
ہم کہاں تک شہر میں بے جان پتھر دیکھتے

کھوئے ہوئے کلچر سے ان کے روحانی تعلق کی اہمیت اس وقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب وہ پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں ۔

ہیں دفن اس جگہ تری تاریخ کے نقوش
بستی کے ساتھ ساتھ کھنڈر کا خیال کر

لیکن اتنا پیچھے مڑ کر دیکھنے کے باوجود وہ وقت کی رفتار سے بھی باخبر ہیں اور اسی لیے اپنے عہد سے مفاہمت بھی کرتے ہیں لیکن اس مفاہمت میں بھی گاؤں سے محبت کا جواز ڈھونڈ نکالتے ہیں

شہر سے یونہی مجھے پیار نہیں ہے شاہد
شہر میں لوگ بھی رہتے ہیں مرے گاؤں کے

گمشدہ کلچر سے شاہد کی وابستگی پیش منظر کی تاریکی میں روشنی کا سفر بن کر سامنے آتی ہے۔ ایسا سفر جس کا ایک قدم ماضی کی طرف ہے اور ایک مستقبل کی طرف۔

حفیظ شاہد کی شاعری کے اس بنیادی رویے سے ہٹ کر ان کے ہاں اُردو غزل کے عمومی مزاج کے حامل اعلیٰ پائے کے اشعار بھی ملتے ہیں ان میں شاعرانہ نفاست بھی ہے اور موضوعاتی تنوع بھی ۔

رغبت مجھے رہی ہے ہمیشہ سفر کے ساتھ
مجھ ہے کو اک تعلق بے نام گھر کے ساتھ

....

رُسوا ہوا تو عشق بنا ایک اشتہار
افسانے میرے نامہ نگاروں تک آئے ہیں

....

اپنے اپنے خدا بنا کے حفیظؔ
ہم ہیں مشغول بت پرستی میں
پھولوں کی طرح وقت کے گلداں میں سجے ہیں
خوشبو کی طرح چاروں طرف پھیل گئے ہم

....

فکر و نظریہ چھائی تھی بے نام سی خلاء
منظر میں کچھ نہ تھا پسِ منظر میں کچھ نہ تھا
یوں تو دشمن ہی رہا سارا قبیلہ میرا
پھر بھی شامل میں حفیظؔ اپنے قبیلے میں رہا

....

میرے دُکھوں کا مداوا تو کر سکا نہ، مگر
اداس وہ بھی بہت تھا میرے دُکھوں کے لیے

حفیظ شاہد کے ہاں بعض اشعار ان کے عمومی رنگ سے قدرے مختلف اُسلوب میں ملتے ہیں اور قاری کو چونکاتے بھی ہیں۔ یہ اشعار دراصل حفیظ شاہد کے مزید امکانات کی طرف اشارہ ہیں۔

کس قدر دلنشیں کہانی ہے
میری نینوں کی ، تیرے خوابوں کی

....

صبح جب جاگے تھکاوٹ سے بدن تھا چُور چُور
رات بھر خوابوں کے جنگل میں سفر کرتے رہے

....

ملتا ہے آدمی کو یہاں ہر زیاں پہ سود
بازارِ آرزو کے خسارے عجیب ہیں

....

گھر بناتے ہی مجھے خدشات نے گھیرا حفیظؔ
مطمئن تھا کس قدر میں خانہ ویرانی کے ساتھ

....

بے مرحلہ در مرحلہ روودادِ مسافت
انجامِ سفر اصل میں آغازِ سفر ہے

....

مسافتیں ہی ازل سے میرا مقدر تھیں
میں کارواں بھی رہا گردِ کارواں بھی رہا

....

اس کی تقدیر ہی تیشۂ وہ سنگ تھی
قصرِ شیریں نہ تھا کوہکن کے لیے

حفیظ شاہد کی شاعری کے ان سارے رنگوں کی اہمیت اپنی جگہ۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بڑے پرگو شاعر ہیں اور فی البدیہہ اشعار کہنے میں بھی انہیں مہارت حاصل ہے۔ ان کے پرگو شاعر ہونے کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے زیرِ نظر مجموعہ کی پچیس تیس غزلیں ان کی پہلی شاعری سے انتخاب کردہ ہیں جبکہ باقی تمام غزلیں اُنہوں نے مجموعہ کی اشاعت سے پہلے 3 ماہ کے قلیل عرصہ میں کہی ہیں۔ میرے خیال میں عصرِ حاضر کے بڑے بڑے اساتذہ فن بھی اتنے پرگو شاعر نہیں ہوں گے یہ حفیظ شاہد کا اعزاز بھی ہے اور اعجاز بھی۔

حفیظ شاہد کی شاعری کی ان بہت ساری خوبیوں کے ساتھ مجھے ان کے مجموعۂ کلام "سفر روشنی کا" میں ایک چیز بری طرح کھٹکی ہے۔ عرفانِ ذات اور ذات کی تکمیل ایسے موضوعات میں ان کے اشعار دیکھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے تجربے میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے اس ایک خامی سے ہٹ کر دیکھیں تو حفیظ شاہد نہ صرف اپنے عہد کے بڑے اہم شاعر نظر آتے ہیں بلکہ اُردو غزل ان کے ان ممکنات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹنے کے لیے منتظر ہے جو یقیناً ان کے آئندہ مجموعے میں کھل کر سامنے آئیں گے اور اُردو غزل کا اس مجموعے سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہوں گے۔

(بشکریہ: سات ادیب (ایک گوشہ حفیظ شاہد کیلئے) مجلسِ مشاورت: حیدر قریشی، فرحت نواز، مرتب: سعید شباب، جدید ادب پبلی کیشنز خان پور، اشاعت: ۱۹۸۶ء۔ ص: ۱۷۸)

☆☆☆

کلام حفیظ شاہد

بِنا دیکھے تُجھے اپنا بنا کر دیکھ لیتا ہوں
میں تیرے آستاں پر سر جُھکا کر دیکھ لیتا ہوں

اندھیرے دل کی بستی کے بھی شاید دور ہو جائیں
میں تیرے نام کی مشعل جَلا کر دیکھ لیتا ہوں

مجھے کچھ بھی نہیں حاصل ہُوا اونچی اُڑانوں سے
قدم اپنی زمیں پر اب جما کر دیکھ لیتا ہوں

دُعا اپنے لئے میں نے کبھی مانگی نہیں کوئی
تری خاطر میں ہاتھ اپنے اُٹھا کر دیکھ لیتا ہوں

پروں میں اُن کے کتنی طاقتِ پرواز باقی ہے
پرندے اپنی سوچوں کے اُڑا کر دیکھ لیتا ہوں

کہاں پہنچے گا میرا کاروانِ شوق اے شاہد
میں اپنے آپ کو رہبر بنا کر دیکھ لیتا ہوں

☆☆☆

٭٭مظہر عباس

تاریخ گوئی کی روایت اور حفیظ شاہد کے قطعاتِ تاریخ کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ

تاریخ کسی واقعے کے وقوع پذیر ہونے کے وقت کو ظاہر کرنے کا نام ہے۔ شاعری میں کسی کی پیدائش، موت، کسی عمارت کا سنگِ بنیاد، کسی کتاب کی اشاعت اور شاعری جیسے مواقع کو شعری روپ میں اس طرح بیان کرنا کہ الفاظ کی عددی قدروں کو جوڑ کر دُرست تاریخ مرتب کی جا سکے، تاریخ گوئی کہلاتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اصطلاح میں کسی لفظ، لفظوں کے مجموعے، فقرے، عبارت، مصرع، شعر، عبارت کے کسی ٹکڑے یا اشعار یا شعر کے کسی جزو کی مدد سے، سنِ ہجری یا عیسوی میں کسی واقعہ کے ظہور میں آنے کی تاریخ نکالنے کو، تاریخ گوئی یا فنِ تاریخ گوئی کہتے ہیں۔''(۱)

تاریخ کسی بھی طرح کے واقعے کی نکالی جا سکتی ہے۔ اس لیے فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''واقعہ کے لیے کسی خاص موقع یا موضوع کی تخصیص نہیں ہے۔ ذاتی و غیر ذاتی، معاشرتی و تہذیبی، علمی و ادبی اور سیاسی و تاریخی، ہر قسم کے واقعات و موضوعات کی تاریخ نکالی جا سکتی ہے۔''(۲)

''تاریخگوئی'' کے ذریعے کسی واقعہ کے ظہور میں آنے کی تاریخ کو مستقلاً محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ''تاریخ گوئی'' تاریخ کے اس مروج علم میں بھی معاون ثابت ہو سکتی ہے جو درس گاہوں میں پڑھایا جا رہا ہے۔ کسریٰ منہاس لکھتے ہیں:

''حقیقتِ حال یہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی انسان مرنا نہیں چاہتا۔ جب تک کوئی شخص انسانوں کے ذہن میں موجود ہے، وہ شخص زندہ ہے۔ جب کوئی کارنامہ تاریخ کا حصہ قرار دیا جاتا ہے، وہ کارنامہ جاوداں ہے۔ اس لیے یہ تحریک پیدا ہوئی کہ انسانی کارناموں کو تاریخ گوئی کے ذریعے قائم و جاوداں بنایا جائے۔ اسلامی دَور کے مشہور تاریخی واقعات، فتوحات، سنین پیدائش و وفات، جلوس شاہانہ، تصانیف، کتب وغیرہ تاریخ گوئی کے ذریعے محفوظ ہیں۔''(۳)

''تاریخ گوئی'' کے فن کی بنیاد عربی کے حروفِ تہجی پر رکھی گئی ہے، جن کی تعداد اُنتیس (۲۹) ہے اور درج ذیل ترتیب سے لکھے جاتے ہیں۔

ا، ب، پ، ت، ٹ، ث، ج، چ، ح، خ، د، ذ، ر، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، ل، م، ن، و، ء، ہ، ی

درج بالا حروف میں ''ء'' کی قیمت شامل نہیں کی جاتی۔ کسی زمانے میں ان حروفِ تہجی کی ترتیب درج بالا

موجود ترتیب سے مختلف تھی۔ اس لیے فنِ تاریخ میں حروفِ تہجی کی تعداد کو اٹھائیس (۲۸) شمار کیا جاتا ہے۔ اس ترتیب کو ابجدی ترتیب کہا جاتا ہے۔ قدیم حروفِ تہجی کی ترتیب درج ذیل ہے۔

ا،ب،ج،د،ہ،و،ز،ح،ط،ی،ک،ل،م،ن،ع،ف،ص،ق،ر،ش،ت،ث،خ،ذ،ض،ظ،غ

درج بالا حروف کو آٹھ کلمات میں تقسیم کرلیا گیا ہے اور ہر حرف کے اعداد یا قیمت بحسابِ جمل مقرر کردی گئی ہے۔ ترتیب حروف اور ان کی قیمت درج ذیل ہے:

۱۔	ابجد:	ا	ب	ج	د
		۱	۲	۳	۴
۲۔	ہوز	ہ	و	ز	
		۵	۶	۷	
۳۔	حطی:	ح	ط	ی	
		۸	۹	۱۰	
۴۔	کلمن:	ک	ل	م	ن
		۲۰	۳۰	۴۰	۵۰
۵۔	سعفص:	س	ع	ف	ص
		۶۰	۷۰	۸۰	۹۰
۶۔	قرشت:	ق	ر	ش	ت
		۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰
۷۔	ثخذ:	ث	خ	ذ	
		۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	
۸۔	ضظغ:	ض	ظ	غ	
		۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰	

زبانیں ایک دوسرے سے اخذ و استفادہ کرتی رہتی ہیں۔ ان میں موجود مماثلت کے باوجود بہت سے اختلاف بھی ہوتے ہیں۔ خاص طور پر کچھ آوازیں ایسی ہوتی ہیں جو ہر زبان کی اپنی ہوتی ہیں۔ اس لیے فنِ تاریخ گوئی کا یہ نظام جب عربی سے فارسی اور فارسی سے اُردو میں آیا تو کچھ آوازوں کی نمائندگی کرنے والے حروف کے اَعداد کا مسئلہ پیدا ہوا مثلاً فارسی زبان کے حروف 'پ'، 'چ'، 'ژ'، 'گ'' اور اُردو حروف 'ٹ'، 'ڈ' اور 'ڑ' عربی حروفِ تہجی میں شامل نہیں۔ ان حروف کے اعداد کا مسئلہ اس طرح حل کیا گیا کہ ان سے پہلے موجود حروف کے اعداد ان حروف پر منطبق کردیے گئے۔

پ	=	ب	=	۰۲
ٹ	=	ت	=	۴۰۰

چ	=	ج	=	۰۳
ڈ	=	د	=	۰۴
ڑ	=	ر	=	۲۰۰
ژ	=	ز	=	۰۷
گ	=	ک	=	۲۰

اس طرح فنِ تاریخ گوئی کا باقاعدہ نظام وضع ہوا(۴)۔ ''فنِ تاریخ گوئی'' کی روایت پر نظر ڈالی جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ حروف کو باقاعدہ عددی نظام دینے والے عربوں میں قطعاتِ تاریخ کے نمونے کہیں نظر نہیں آتے۔ اس حوالے سے **یعقوب عمر** لکھتے ہیں:

> ''بہت تلاش و جستجو کے باوجود آج تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس کی ابتدا کس نے کی۔ تاریخ گوئی پر جتنی فنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں کسی نے کہیں بھی اس اَمر پر روشنی نہیں ڈالی کہ آخر اس کی ابتدا کیسے ہوئی۔ فارسی شعراء کے تذکرے بھی اس باب میں خاموش ہیں کہ سب سے پہلے اس فن کو کس نے برتا۔ بہر حال کافی تذکروں اور فنِ شعر کی کتابوں کو کھنگالنے کے بعد راقم الحروف اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ عربی شاعری کا دامن اس فن سے خالی ہے۔''(۵)

یعقوب عمر کے اس دعوے کی تائید کسریٰ منہاس کے درج ذیل الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ امر حیرت انگیز ہے کہ ہمارے پاس عرب شاعروں کی تاریخ گوئی کے قدیم ترین نمونے موجود نہیں ہیں۔ ہماری تاریخ گوئی کی ابتدا فارسی ساعری سے ہوتی ہے۔ سب سے قدیم نمونے تاریخ گوئی کے ایرانی شاعروں میں پائے جاتے ہیں اور اس کے بعد فارسی گویانِ ہند کی شاعرانہ کاوشوں میں ملتے ہیں۔''(۶)

اس فن کے آغاز کے حوالے سے **یعقوب عمر** لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا عہدِ سلجوق میں ہوئی مگر اس فن کو کمال تک پہنچنے کے لیے صدیاں لگ گئیں۔ آج یہ فن جس شکل میں موجود ہے یہ خدوخال اس نے کہیں عہدِ تیموری میں حاصل کیے۔''(۷)

آغاز میں تاریخ سیدھے سادھے الفاظ میں، عددی تحریر کی جاتی۔ اس طرح بے معنی الفاظ کے اعداد کو جمع کر کے مادہ تاریخ لیا جاتا تھا۔ عہدِ مغلیہ میں فنِ تاریخ گوئی عروج پر پہنچ گیا۔ بامعنی حروف کے ذریعے تاریخ مرتب کی جاتی۔ اس سلسلے میں ''تدخلے'' اور ''تخرجے'' کے اُصولوں سے بھی مدد حاصل کی جاتی۔ اُردو شاعری میں بھی بالکل فارسی کے اُصولوں کے مطابق قطعاتِ تاریخ کا آغاز ہوا۔ اُردو شعرا زیادہ تر فارسی میں تاریخ رقم کیا کرتے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ فارسی میں مادہ تاریخ رقم کرنا نسبتاً آسان ہے۔ اس سلسلے میں ناسخ کی مثال دی جا سکتی ہے۔ ناسخ کا اُردو دیوان، فارسی قطعات تاریخ سے بھرا ہوا ہے۔ اُردو میں قطعات تاریخ تین سے چار سے زیادہ نہیں۔(۸)

مفتی محمد احسن نے ولی گجراتی کی تاریخ وفات، مصحفی نے مرزا مظہر جان جاناں کی تاریخ، انشا نے اکبر شاہ ثانی کی تاریخ جلوس، بسنت سنگھ نشاط نے انشا کی تاریخ وفات کو منظوم کیا۔ یہ سب تاریخیں فارسی زبان میں ہیں۔ ناسخ کو تاریخ گوئی سے خاصی دلچسپی تھی۔ انہوں نے سن عیسوی میں تاریخ گوئی کو رواج دیا۔ ناسخ کے بعد مومن نے اس فن میں کمال حاصل کیا۔ غرض تاریخ گوئی کی روایت کو سامنے رکھیں تو حقیقت سامنے آتی ہے کہ اُردو میں تاریخ گوئی فارسی کے مقابل زیادہ مشکل ہے۔ زیادہ تر تدخلے اور تخرجے کی پناہ لے کر تاریخیں کہیں گئی ہیں جو کہ عجز شاعرانہ ہے۔

انہی مشکلات کے پیشِ نظر ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو شاعری کی روایت میں اس فن کو استعمال کرنے والے شعراء کی تعداد اتنی زیادہ نہیں۔ صرف چند شعرا نے اس فن میں شہرت حاصل کی۔ مثلاً ناسخ، غالب، مومن، داغ، شمیم متھراوی، رئیس امروہوی اور محشر بدایونی وغیرہ۔

بہاول پور میں فن تاریخ جاننے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ان میں قاضی محمد لیئق محوی عثمانی کا نام قابل ذکر ہے۔ قاضی صاحب اُردو اور فارسی کے صاحبِ طرز شاعر تھے اور تاریخ گوئی میں خاص ادراک رکھتے تھے۔ قاضی صاحب کے بعد محمد حسن خان میرانی نوشاہی کا نام قابل ذکر ہے۔ نوشاہی صاحب شاعر تو بڑے نہ تھے لیکن اس فن پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ ان دو شخصیات کے بعد حفیظ شاہد ہی واحد شاعر ہیں جو فنِ تاریخ گوئی پر نہ صرف مکمل دسترس رکھتے ہیں بلکہ خوبصورت اور بامعنی مصرعوں میں مادۂ تاریخ نکالتے ہیں۔

حفیظ شاہد نے اپنے پانچویں شعری مجموعے میں بائیس (۲۲) قطعاتِ تاریخ رقم کیے ہیں۔ ان میں سے ۱۸ تاریخ وفات، ایک قطعہ اپنے مکان کی تاریخ تعمیر، ایک قطعہ ماہنامہ ''محفل'' لاہور کے وحید قریشی نمبر کی تاریخ اشاعت، ایک قطعہ ڈاکٹر شوذب کاظمی کے شعری مجموعے ''نقش دوام'' کی تاریخ اشاعت اور ایک قطعہ اپنے عزیز غلام قادر آزاد کی صاحب زادی کی شادی کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ ان تمام قطعات میں حفیظ شاہد نے تدخلہ، تخرجہ اور یک مصرعی تاریخ کو منظوم کیا ہے لیکن زیادہ تر قطعات تدخلہ کے ذیل میں آتے ہیں اسی لیے سہیل اختر لکھتے ہیں:

> ''یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حفیظ کے کہے ہوئے مادہ ہائے تاریخ زیادہ تر تدخلہ یا تخرجہ کے ذیل میں آتے ہیں۔ یعنی تاریخ پوری کرنے کے لیے اعداد میں کوئی عدد جمع یا خارج کرنا پڑتا ہے یا کچھ کمی بیشی کرنی پڑتی ہے۔''(۹)

''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' بھی شامل بائیس قطعاتِ تاریخ میں تین قطعات ایسے ہیں جن میں تدخلہ یا تخرجہ کا سہارا لینے کے بجائے شاعر نے براہِ راست تاریخ مرتب کی ہے۔

۱۔ قطعۂ تاریخ تعمیر مکان خود ص:۲۱۲
۲۔ قطعۂ تاریخ وفات سید رئیس امروہوی ص:۲۱۶
۳۔ قطعۂ تاریخ وفات صبا اکبر آبادی ص:۲۱۸

درج بالا تینوں قطعات میں شاعر ''حفیظ شاہد'' نے بڑی مہارت اور فنی چابک دستی کے ساتھ مادۂ تاریخ کو

مرتب کیا ہے اور اس سلسلے میں کسی جمع یا تفریق کا سہارا نہیں لیا۔ مثلاً وہ اپنے مکان کی تاریخ تعمیر کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

اس چمن میں اے خدا غنچے مسرت کے کھلیں
گل بدا ماں ہی رہے کاشانۂ شاہد حفیظ
میں تھا محوِ فکر جب تعمیر کی تاریخ میں
کان میں آئی ندا "اک خانۂ شاہد حفیظ"

(۱۰)

"اک خانۂ حفیظ شاہد" کے حروف کے اعداد کو جمع کیا جائے تو حاصل جمع ۱۹۸۵ بنتا ہے جو کہ حفیظ شاہد کے مکان کا سال تعمیر ہے۔ دوسرا قطعہ سید رئیس امروہوی کے وفات کے سال کو پیش کرتا ہے۔ یہ قطعہ غزل کی ہیئت میں ہے۔ اس کا عنوان ہٹا دیا جائے تو اسے غزل مسلسل کہا جا سکتا ہے۔ جس کے آخری شعر میں شاعر نے تاریخ کو پیش کیا ہے۔

بے وقت رحلت پر تری، تاریخ شاہد نے کہی
"ویراں ہے اب شہرِ ادب، سید رئیس امروہوی"

(۱۱)

درج بالا شعر کے مصرع ثانی کا حاصل جمع ۱۴۰۹ سنہ ہجری میں ہے جو کہ سید رئیس امروہوی کی تاریخ وفات ہے۔ تیسرا قطعہ "صبا اکبر آبادی" کی تاریخ وفات پر کہا گیا ہے۔ یہ بھی سات اشعار پر مشتمل ہے اور آخری شعر میں تاریخ رقم کی گئی ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

شاہد، صبا کی رحلتِ پُر غم کا سال بھی
اس کی کتابِ شعر "چراغِ بہار" ہے

(۱۲)

"چراغ بہار" کے حروف کو ابجدی ترتیب سے جمع کیا جائے تو حاصل جمع ۱۴۱۲ بنتا ہے جو کہ "صبا اکبر آبادی" کا ہجری سال وفات ہے۔ ۱۶ قطعات تاریخ ایسے ہیں جن میں "تدخلہ" کا سہارا لے کر تاریخ کے اعداد پورے کیے گئے ہیں۔ یعنی تاریخ نکالنے کے لیے آخری مصرعے کے اعداد میں کچھ اعداد جمع کرنے پڑتے ہیں۔ ان ۱۶ قطعات میں سے ۱۳ قطعات تاریخ وفات ہیں۔ یہ قطعات تاریخ وفات شرقی بن شائق، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، میاں فیض احمد، رئیس امروہوی، راسخ عرفانی، طفیل ہوشیار پوری، مولانا صلاح الدین احمد، تاریخ وفات والدۂ محترمہ اظہر ادیب، محمد خان کلیم، عارف عبدالمتین، سلیم گردیزی (گائیک) اور سعید انور قریشی کے سال وفات کو محفوظ کرنے کے لیے تحریک کیے گئے ہیں۔ شرقی بن شائق کی تاریخ کو درج ذیل الفاظ میں منظوم کیا ہے:

"دل" سے شاہد یہ کہو سال وفات
ہو گیا رخصت شہِ اقلیمِ فن

(۱۴)

مصرع ثانی کے اعداد ۱۹۴۸ اور مصرعِ اولیٰ کے لفظ ''دل'' کے ۱۳۴ اعداد ملا کر جوشؔ کا سال وفات نکالا ہے۔ یعنی ۱۹۸۲ء۔

فیض احمد فیضؔ کے لیے حفیظ شاہدؔ نے دو قطعات تاریخ وفات تحریک کیے ہیں۔ یہ فیضؔ صاحب کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

بروئے ''کسک'' دل نے مجھ سے کہا
بس اتنی ہی تھی زندگی فیضؔ کی

(۱۵)

مصرع ثانی کے اعداد ۱۹۶۴ بنتے ہیں۔ مصرعہ اولیٰ میں موجود لفظ ''کسک'' کے رف ''ک'' کے اعداد ۲۰ کو ملا کر ۱۹۸۴ بنایا جو کہ فیضؔ صاحب کا سال وفات ہے۔ یہاں شاعر نے لفظ ''بروئے کسک'' کے ذریعے اشادہ دیا ہے کہ کسک کا پہلا حرف جمع کریں۔ دوسرے قطعہِ وفات کے اشعار درج ذیل ہیں۔

ہوئے ہیں اس جہاں سے فیضؔ رخصت
کہ لطفِ زندگی رُخصت ہوا ہے
کہا دل نے جو روئے درد دیکھا
امامِ شاعری رُخصت ہوا ہے

(۱۶)

تیسرے مصرع میں ''روئے درد'' سے مراد لفظ ''درد'' کا پہلا حرف اور آخری مصرع کے حروف کے اعداد کو جوڑا جائے تو ۱۹۸۰ میں ۴ جمع کرنے سے فیضؔ صاحب کا سال وفات نکلتا ہے۔ اگلا قطعہِ تاریخ وفات اپنے دوست میاں ریاض صاحب کے والد میاں فیض احمد کی وفات پر تحریر کیا ہے۔

حفیظ، مانگو دُعا اُن کی مغفرت کے لیے
ہو، اُن پر سایہِ فگن رحمتِ حضورؐ، کہو

حفیظ، عیسوی سالِ وفاتِ فیض احمد
''مقیمِ خلدِ بریں'' از سرِ ظہور کہو (۱۷)

مقیمِ خلدِ بریں = ۱۰۸۶
از سرِ ظہور یعنی ظ = ۹۰۰

اس طرح ملا کر ۱۹۸۶ء بنا جو کہ میاں فیضؔ کا سال وفات ہے۔ رئیس امروہوی کا قطعہ بھی اسی انداز میں ہے:

تاریخ میں نے از سرِ زور ''الم'' کہی
کیا شاعرِ عظیم گیا بزمِ دہر سے

(۱۸)

۱۹۸۱+۷ = ۱۹۸۸

قطعہِ تاریخِ وفات راسخ عرفانی میں سالِ وفات اس طرح منظوم کیا گیا ہے۔

از سرِ ماتم ہے یہ سالِ وفات
''شاعرِ جادو بیاں رخصت ہوا''

(۱۹)

از سرِ ماتم سے مراد ''م'' ہے جس کے اعداد ۴۰ بنتے ہیں اور اگلے مصرعے کے اعداد ۱۹۵۰ کو جمع کریں تو ۱۹۹۰ نکلتا ہے جو راسخ عرفانی کا سالِ وفات ہے۔ طفیل ہوشیار پوری کا سالِ وفات درج ذیل الفاظ میں مرتب کیا ہے:

شاہد کہو یہ از سرِ افسوس سالِ فوت
اک صدمۂ عظیم ہے رحلت طفیل کی

(۲۰)

۱۹۹۲ + ۱ = ۱۹۹۳

مولانا صلاح الدین احمد مدیر ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی کا سالِ وفات درج الفاظ میں مرتب کیا ہے۔

خدا کے ''امر'' سے ہے سالِ رحلت
امیرِ صدق ، سلطانِ صحافت

(۲۱)

۱۱۷۴ + ۲۴۱ = ۱۴۱۵ھ

قطعۂ تاریخ وفات والدۂ محترمہ اظہر ادیب میں سالِ وفات درج الفاظ میں مرتب کیا ہے۔

''لہو'' رونے سے یہ گوہر ملا ہے
مقیم باغِ جنت اب ہیں مادر

(۲۲)

۱۹۵۹ + ۴۱ = ۲۰۰۰

عارف عبدالمتین کا قطعۂ تاریخ وفات سادہ انداز میں تحریر کیا ہے۔

دی ''ندا'' ہاتف نے بہرِ سالِ فوت
عارفِ شیریں بیاں خاموش ہے

(۲۳)

۱۹۴۶ + ۵۵ = ۲۰۰۱

معروف گائیک سلیم گردیزی مرحوم کا سالِ وفات درج ذیل الفاظ میں مرتب کیا ہے۔

یہ سنی تاریخ بامِ چرخ سے
شاہِ بزمِ مطرباں رُخصت ہوا

(۲۴)

مصرع اولیٰ کا لفظ ''بام'' کے اعداد اور مصرع ثانی کے اعداد درج ذیل ہیں۔ دونوں کو ملا کر سال وفات مرتب کیا گیا ہے۔

۱۹۵۹ + ۳۴ = ۲۰۰۲

بہاول پور کی معروف شخصیت منور جمیل قریشی کے برادر خورد سعید انور قریشی کا قطعۂ تاریخ وفات درج ذیل الفاظ میں تحریر کیا ہے:

سالِ رحلت یہ ''لب'' پہ لکھا ہے
باغِ جنت میں ہے سعید انور

(۴۵)

۱۹۷۲ = ۳۳ = ۲۰۰۵

حفیظ شاہدؔ نے ایک قطعہ تاریخ ادبی جریدہ ماہنامہ ''محفل'' لاہور کے وحید قریشی نمبر کے سالِ اشاعت مرتب کرنے کے لیے تحریر کیا ہے۔ مطلوبہ اعداد حاصل کرنے کے لیے شاعر نے ''تدخلہ'' کا سہارا لیا ہے۔

''شانِ'' آمد سے مصرع تاریخ
خوبصورت وحید نمبر ہے

(۴۶)

۱۶۳۹ + ۳۵۱ = ۱۹۹۰

ارض ملتان کے معروف شاعر ڈاکٹر شوذب کاظمی کے شعری مجموعے ''نقش دوام'' کے سال اشاعت کو درج ذیل شعر میں مرتب کیا ہے۔

شاہد ہے ''موجِ علم'' سے تاریخ کی نمود
''نقشِ دوام'' نقشِ کتابِ حیات ہے''

(۴۷)

۱۹۰۸ + ۱۸۹ = ۱۹۹۷

حفیظ شاہدؔ نے اپنے عزیز غلام قادر آزاد کی بیٹی ندرت کی شادی کا سال درج ذیل شعر میں مرتب کیا ہے۔

کہا ہے مصرع تاریخ میں نے از سرِ شاہد
یہ روزِ عید ہے یا ناصر و ندرت کی شادی ہے

(۴۸)

''از سرِ شاہد'' سے مراد لفظ ''شاہد'' کا پہلا حرف، جس کے اعداد ۳۰۰ ہیں اور مصرع ثانی کے اعداد ۱۶۹۹ کو جمع کیا جائے تو ۱۹۹۹ء بنتا ہے جو کہ ندرت بیگم کی رُخصتی کا سال ہے۔

حفیظ شاہدؔ نے دو قطعاتِ تاریخ ایسے بھی تحریر کیے ہیں جن میں مطلوبہ تاریخ حاصل کرنے کے لیے تفریق کے عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ''تاریخ گوئی'' کی زبان میں اس عمل کو ''تخرجہ'' کہا جاتا ہے۔ ان دو قطعات

میں سے پہلا قطعہ، سید یزدانی جالندھری کے سال وفات کو محفوظ کرنے کے لیے تحریر کیا گیا ہے۔ حفیظ شاہد سال وفات کو درج ذیل الفاظ میں منظوم کیا گیا ہے۔

جب ہو گیا وہ رُخصت، نکلا یہ سالِ رحلت
"اک بے مثال شاعر دنیا سے چل بسا ہے"

(۲۹)

"جب ہو گیا وہ رُخصت" میں اشارہ دیا گیا ہے کہ مصرع ثانی کے اعداد سے لفظ "وہ" کے اعداد کو منہا کر لینے سے سال تاریخ نکلے گا۔

۱۴۲۱ ـ ۱۱ = ۱۴۱۰ھ

ریڈیو پاکستان بہاول پور کی معروف شخصیت ڈاکٹر نصر اللہ خان ناصر کی والدہ محترمہ کا سال وفات درج ذیل الفاظ میں منظوم کیا ہے۔

اُمِ مشفق کے نہ ہونے سے ملا یہ سالِ فوت
مادرِ ناصر ہے شاہد، قصرِ جنت میں مقیم

(۳۰)

مصرع ثانی کے حروف ۲۰۴۴ میں سے مصرع اولیٰ کا لفظ "اُم" کے اعداد ۴۱ منہا کرنے سے سال وفات ۲۰۰۳ء سامنے آتا ہے۔

حفیظ شاہد نے ایک قطعہ تاریخ ایسا بھی تحریر کیا ہے جس میں جمع اور تفریق کے عمل سے یکساں طور پر کام لیا گیا ہے۔ طفیل ہوشیار پوری کے برادرِ خورد محمد خان کلیم کا سال وفات درج ذیل الفاظ میں مرتب کیا ہے۔

"اذن" حق سے سال ہے یہ بے "کلیم"
چھوڑ کر عالم، محمد خاں گئے

(۳۱)

درج بالا قطعہ فنی حوالے سے قابل غور ہے کیونکہ اس میں جمع اور تفریق دونوں عمل کرنے سے گوہرِ مقصود یعنی محمد خان کلیم کا سال وفات سامنے آتا ہے۔ لفظ "اذن" کے اعداد ۷۵۱ کو مصرع ثانی کے اعداد ۱۳۴۹ میں جمع کریں اور پہلے مصرع میں اشارہ دیا گیا ہے۔ "بے کلیم" حاصل جمع سے لفظ "کلیم" یعنی ۱۰۰ کے اعداد تفریق کر لیں تو حاصل ہونے والے اعداد ۲۰۰۰ کلیم صاحب کا سال وفات بنتا ہے۔

حفیظ شاہد کے مرتب کردہ قطعات تاریخ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے زیادہ تر قطعات غزلیہ ہیئت میں تحریر کیے ہیں جن کے اشعار کی تعداد سات سے گیارہ تک ہے۔ اگر عنوان کو ہٹا دیا جائے تو انہیں مکمل غزل کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان میں ردیف اور قافیہ کا باقاعدہ التزام رکھا گیا ہے۔ ان قطعات کے اشعار میں شاعر نے مذکورہ اشخاص کے اوصاف گنوائے ہیں۔ کئی اشعار ایسے ہیں جو دل کو چھو لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر درج ذیل شعر فیض احمد فیض کے لیے تحریر کیے ہیں:

ہوئی آج تاریک بزمِ سخن
وہ شمعِ غزل بجھ گئی فیضؔ کی
نہ جانے وہ کیوں اتنی جلدی میں تھا
ضرورت تھی ہم کو ابھی فیضؔ کی
وہ شہرِ سخن کا تھا اک تاجور
کہ تھی منفرد شاعری فیضؔ کی

(۳۲)

جوشؔ ملیح آباد کے قطعہ تاریخ وفات کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

بانٹتا تھا جو اُجالے فکر کے
بجھ گیا ہے وہ چراغِ علم و فن

(۳۳)

اس نے کیا کیا گل کھلائے حرف کے
سینچ کر اپنے لہو سے یہ چمن

(۳۴)

حفیظ شاہدؔ نے ان قطعات میں مادۂ تاریخ مرتب کرتے ہوئے کہیں بھی بے معنی الفاظ استعمال نہیں کیے۔ تمام اشعار بامعنی ہیں اور اپنے اندر مطلوبہ تاریخ رکھنے کے باوجود بے معنی نہیں ہوئے۔

مذکورہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ حفیظ شاہدؔ کے قطعاتِ تاریخ میں کچھ نقائص بھی موجود ہیں۔ انہوں نے ہجری اور عیسوی دونوں کیلنڈر میں مطلوبہ تاریخ مرتب کی ہے۔ کوئی اشارہ بھی نہیں دیا گیا جس کی مدد سے طے کیا جا سکے یہ ہجری سال ہے یا عیسوی۔ عہدِ حاضر کے قاری تو اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مذکورہ تاریخ عیسوی ہے یا ہجری، لیکن مستقبل میں جب ادب کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو یہ قطعات اُلجھن کا باعث ہوں گے اور ان سے حتمی تاریخ مرتب کرنا دشوار ہوگا۔ حفیظ شاہدؔ کے تحریر کردہ ۲۲ قطعاتِ تاریخ میں سے صرف تین قطعات ایسے ہیں جن میں مذکورہ تاریخ نکالنے کے لیے جمع یا تفریق کے عمل سے مدد حاصل نہیں کی گئی باقی ۱۹ میں تدخلہ یا تخرجہ کے عمل سے تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ ایک قطعہ ایسا بھی ہے جس میں دونوں عمل کرنے سے مطلوبہ اعداد مرتب ہوئے ہیں۔ یہ فنی حوالے سے کمزوری ہے۔ خاص طور پر عہدِ حاضر میں جب اس فن سے آشنائی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ کتنے قاری ایسے ہوں گے جو اس پیچیدہ عمل سے گزر کر مرتب کردہ تاریخ تک رسائی حاصل کر سکیں گے۔ ☆

حوالہ جات:

ا تا ۳۴۔ فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی، حفیظ شاہد، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، سال: ۲۰۰۴ء

(تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم فل اُردو، مظہر عباس، لیکچرر گورنمنٹ ڈگری کالج خیر پور ٹامیوالی ۲۰۰۵)

☆☆☆

صادق جاوید (گڑھی اختیار خان)

معانی در معانی کا جہاں...... حفیظ شاہدؔ

حفیظ شاہد کا کلام اور نثری کام ''حرف حرف حکایت'' کا حقیقی پرتو ہے سرمایۂ ادب کے ان نادر قلمی شہکاروں کا جن میں افسانے کے روزن سے زندگی کی حقانیت طشت از بام کردی گئی ہے تو دوسری جانب امتحان گاہِ زیست کی کٹھنائیوں مسموم صداقتوں، محرومِ اقبال عمرانی کرداروں کی جاندار عکاسی کے اہل حقائق کو افسانوی پیرائے میں ڈھال کر سبق آموزی اور ترسیل پیغام ایسے مستحسن عمل کی راہیں نہ صرف متعین کردی گئی ہیں بلکہ آسان تر بھی کر دی گئی ہیں۔ ہم اپنے موقف کی تائید وتمثیل کے لیے حضرت حسان بن ثابتؓ کا مصرعہ ''واحسن منک لم تر کت عینی'' مثنوی مولانا روم کے عمرانی اشعار علامہ اقبال کی شکوہ، جواب شکوہ، خواجہ غلام فرید کی ''میڈا عشق دی توں''، حافظ و نظیری کے ظرافتی اشعار کے ساتھ ساتھ شاعرِ کیفیت امان اللہ ارشد کا شعری مجموعہ ''دھمال'' میں ان کے الفاظ:

ولھیت اپنے گناہیں ساریں دابار، موہڑ ھے تے چٹی وَدے ہیں

''ڈوجھا جنم'' بھی افسانوی حقیقت یا حقیقی افسانہ ہے۔

اور ماہرِ فریدیات مجاہد جتوئی کی

ڈس ڈیندا پے ہر اَنگ تیڈا او سوہنی مِدھ ماتی
تئیں وَتی دی پاک فضا وِچ اَکھ کھولی سُدھ پاتی

مندرجہ بالا حوالے قرآنِ شاعری کے حروفِ مقطعات کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان کے عمرانی رسوخ نے انہیں حرف حرف حکایت کا درجہ دے کر ہی دم لیا ہے۔

اسی افسانوی داستان کو تجمیل وتمثیل عطا کردی ہے کہ رانجھا رانجھا کرتے رانجھا کیسے ہوا جاتا ہے، ''میں ناہیں سب تو'' کا راگ کیسے اَلاپا جاتا ہے، رنج کے یار مناون کی لذت کیونکر میسر آتی ہے۔ ''جے یار و فرید قبول کرے'' کہہ کر صنم ذات کی داغ بیل کیسے ڈالی جاتی ہے۔

اس سب استفسار کا متن جملہ جواب تسلیم کے خوگر کو

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

کی مشق سے منفصل کرنے کی ضرورت ہے اور جب انسان اس سعی مطلوبہ میں کامیاب و کامران قرار ہو پاتا ہے تو اس کا فرمایا ہوا متذکرہ بالا تمام حوالوں کا سرنامہ ثابت ہوتا ہے اور حرف حرف حکایت، لفظ لفظ حقیقت کا روپ دھارن کر لیتی ہے اور حکایاتِ حقائق کا دانیالِ اعظم حفیظ شاہد کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے اور قرآن عمرانی کی سورتیں کچھ یوں ہمارے سامنے آجاتی ہیں:

ہر آن بدلتے ہیں زمانے کے مناظر
پابندِ تغیر مری دنیا بھی ہے میں بھی

☆

اے حسن گم شدہ مجھے تیری تلاش ہے
کچھ تو میری اداس نظر کا خیال کر

سماجی بدلاؤ سے پہلے روزنِ دل سے ابتلا کا علاج تلاشتی ان لائنوں پر ہم بعد میں کچھ عرض کریں گے۔ آیئے ایک طائرانہ نظر شاعری اور اس کے مقام پر ڈالتے چلیں۔ گو ہماری ذاتی رائے میں شاعری شعور کا عرق ہے اور شاعر ایک چنیدہ روح مگر کتابی حوالوں کے حوالے سے شاعری ایک فن ہے۔ یہ ماقبل تاریخ کے زمانہ سے موجود ہے۔ زمانہ قدیم میں روایتی تاریخی نسب نامہ اور مروجہ قوانین کو یاد کر لیا جاتا تھا یعنی انسان کا ذہن موجودہ تعریف کے مطابق دیوان العصر کی حیثیت رکھتا تھا۔ علاوہ ازیں نجومی اور کاہن بھی ایسے منتر اور دُعا شاعری کی صورت میں پڑھتے تھے۔ ایک خاص تعریف کے مطابق موسیقی روح کی غذا ہے اور شاعری ہمیشہ موسیقی کے قریب تر رہی ہے۔ ابتداء میں بھجن اور منتر کو بطورِ شعر پڑھا جاتا تھا۔ زیادہ شعری نمونے دُعا منتر، بھجن اور مذہبی کہانیوں کی صورت میں محفوظ ہیں۔ ساتھ ہی محبت سماج حاصل ولا حاصل مراد اور محرومی بھی شعر میں سموتے چلے گئے۔ یعنی اکابرین نے شعر کی سلطنت کو اتنا وسعت عطا کر دی ہے کہ اس کی منظر کشی کے لیے وسیع مطالعہ، مشاہدہ اور قوتِ ترتیب نہایت ضروری قرار پائی اور شعر گوئی شوق سے بڑھ کر شعوری ارتقا کا چیلنج بن کر رہ گئی اور ایک شعر میں تمام تر خوب و کسر ہائے زمانہ کو سمونا ہی شاعرانہ زندگی کی آکسیجن ثابت ہوا۔ نہایت خوشی سے ہم یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہمارے آج کے ممدوح محترم حفیظ شاہد نے تمام تر تقاضوں کو نہ صرف نبھایا بلکہ اپنے اندر کے کھوجی سے مل کر شہودی و قلبی واردات کے تجربات کا نچوڑ ہمارے سامنے لا رکھا جو محبانِ ادب کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ ہم ان کی نذر اپنا ہی شعر کرتے ہوئے بات کو بڑھانا چاہیں گے۔

الفاظ معانی کو کردار بنا ڈالا
کردار تحرک سے شہکار بنا ڈالا

حفیظ شاہد کا کوئی بھی شعر پڑھ کر ایک بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کا شعر قرطاس و قلم پر مہربان ہونے سے کافی پہلے ان کے قرطاسِ دل کی زینت رہا اور ماحول سے کشش کشید کر کے جامِ ذوق کے لیے سہ آتشہ سامانی کا خواہاں رہا کیونکہ ان کا شعر اثر کرنے میں سماعت سے قبول قلب کا سفر طے کرنے میں ذرہ بھی دیر نہیں لگاتا۔ اہلِ عرب کا حافظہ اور شعر کی حفاظت آپ پر عیاں ہے مگر ہم آپ کی خدمت میں اتنا ضرور عرض کریں گے کہ چونکہ قافیہ بند کلام کو یاد کرنا آسان ہوتا ہے لہٰذا جب لکھنے کا رواج نہیں تھا تب اہم کو شعر کے اوزان میں محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ اسی لئے "وید" کا زمانہ (1000 قبل مسیح سے 1500 قبل مسیح تک) اور اوڈیتی کا زمانہ (675 قبل مسیح سے 800 قبل مسیح تک) کے واقعات و حالات کو ماقبل تاریخ کے زمانہ سے شعر میں محفوظ کیا گیا اور شعوری طور پر زمانہ در زمانہ، نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ لکھنا ایجاد ہوا اور انہیں قلم بند کیا گیا۔

اس تفصیل سے ہماری عرض آپ کو یہ باور کرانا تھا کہ شارح ازلی طور پر فلسفۂ اثبات اور حائل مشکلات کے نغمہ و نوحہ کا نام ہے جس میں ماحول اور افراد کی ترجمانی کا حق ادا کرنا اولین ترجیح ہوا کرتی ہے اور حفیظ شاہد اس ذمہ داری سے نہ صرف کما حقہ سبکدوش ہوئے ہیں بلکہ متلاشیانِ حقائق کے لیے رہنمائی کا سامان بھی بدرجہ اتم کیا ہے اور خوب کیا ہے۔

ہم اپنے موقف کی تائید کے لیے ان کی ان کاوشوں کے نمونے آپ کے سامنے رکھتے ہیں اور آپ کو فیصل قرار دیتے ہیں۔

میرے خیالوں میں چاندنی ہے میری نگاہوں میں ہے اُجالا
میں روشنی کا سفیر بن کر نئے دنوں کی تلاش میں ہوں

خزاں نے مجھ کو دیئے ہیں چرکے بہار نے بھی عذاب بھیجے
میں زخم خوردہ ہوں موسموں کا میں نئی رُتوں کی تلاش میں ہوں

ان چار مصرعوں میں بدلتی ہواؤں کے سنگ بدلتے رویوں، سماجی ناہمواری اور قدم قدم پر بچھے کانٹوں کا منظر ایک مکمل کہانی بیان کر رہا ہے۔ جن میں خزاں میں غیروں اور بہار میں اپنوں کے بخشے دُکھوں کی داستان نمایاں ہے مگر شاعر نے ٹوٹنے کی بجائے سینہ سپر ہونے کی تعلیم دی ہے۔ رُکنے کو موت اور چلنے کو زندگی مانا ہے اور سفر جاری رکھنے کا عملی درس دیا ہے اور حقیقت سے آنکھیں چرانے کی بجائے سامنا کرنے اور اُمید کی شمع جلا کر قلبِ سفیر بن کر اچھے دنوں کو تلاشنے کا سبق دے دیا ہے۔ اسی طرح حفیظ شاہد کا کلام معانی در معانی کا اک جہاں آباد کرتا اور عزم و استقلال اور ثابت قدمی کے بل بوتے اپنا جہاں آپ پیدا کرنے کا درس دیتے ہوئے زندگی کے غموں میں مسکرانے کی سبیل کرنے کا فن سکھاتا چلا جاتا ہے۔ اپنے تجربات کو ابلاغ کے سانچے میں کس موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ آیئے حفیظ شاہد کے دو اور اشعار دیکھتے ہیں۔

تم اجالوں کے تمنائی ہو اتنا سوچ لو
روشنی میں سائے بھی مدغم ملیں کے شہر میں
دیکھنا کچھ اور تازہ زخم لے کر آؤ گے
تم سمجھتے ہو تمہیں مرہم ملیں گے شہر میں

خوب سے خوب تر کی تلاش انسان کی فطری مجبوری ہے لیکن شہر کی چکا چوند محض تصنع کے سوا کچھ نہیں ظاہری اُجالوں کی اندھی پیروی کرنے والے اذہان کو چتاونی دی جا رہی ہے کہ ظاہری کروفر کے عادی ماحول سے اُمید و فاصلگا ہے ہم نے اس سفر میں اپنا یہ حال کر لیا ہے کہ

آبلے ہیں پاؤں میں اور آبلوں میں خار ہیں

آگاہ کیے دیتے ہیں پھر بھی آپ نے پاؤں جلا کر آگ کو آگ ماننا ہے تو ہمیں کوئی تردد نہ ہے آپ آزاد اور ہم سبکدوش!

ملاحظہ فرمائیں کہ شاعر کی قوتِ مشاہدہ، حسن عروج اور فکری گہرائی کا نمونہ اور ثبوت ہوا کرتے ہیں اس حوالے سے حفیظ شاہد حیران کن حد تک کامران قرار پاتے ہیں۔ کسی بھی مسافر کے لیے دو خطرات منتظر رہتے ہیں اور دل کی کسک بن کر سامنے آتے رہتے ہیں۔ ایک گم نہ جائے اور دوسری چھن نہ جائے۔

حفیظ شاہد اپنے تجربات سے رشد و ہدایت کا سامان شعروں کی زبانی اس غیر محسوس مگر موثر ترین فنکاری سے کرتے ہیں کہ قاری کو یہ باور کرانے میں دیر ہی نہیں لگتی کہ زیست کی مسافت پھونک پھونک کر قدم اٹھانے اور احساسِ زیاں سے آسان تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ خود ایک تجربہ کار پیش رو کے طور پر اپنی زندگی اور زندگی کرنے کا گر اس خوب صورت انداز سے بتا جاتے ہیں

میں محبت کی روشنی بن کر
وقت کی کہکشاں میں رہتا ہوں

اور ساتھ ہی اتنے بڑے سفر کی منصوبہ بندی لازمی طور پر وافر وقت کا تقاضا کرتی ہے۔ وقت کیسے جتایا جائے اس کا شافی و کافی نسخہ بھی ہمیں حفیظ شاہد کے کلام میں بخوبی مل جاتا ہے مگر کسر نفسی نمایاں ہے۔

جانے کیا بات ہے کہ میں تنہا
محفلِ دوستاں میں رہتا ہوں

شعری احساس اور زود حسی میں درجہ کمال پر فائز حفیظ شاہد بابانگِ دہل اعلان کرتے ہیں کہ ہم بے خبر نہیں سب جانتے ہیں کہ خود غرضی کے عفریت نے ملی وحدت کو کس طرح ڈس لیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

پہلے تو شہر بھر میں اندھیرا کیا گیا
پھر ہم سے روشنی کا تقاضا کیا گیا
پہلے تو سازشوں سے ہمیں دی گئی شکست
پھر خوب اس شکست کا چرچا کیا گیا
اک شخص کے لیے مری بستی کا راستہ
کچے مکاں گرا کے کشادہ کیا گیا

مندرجہ بالا سطور میں اندھیرے کی بنیاد منافقت کی کارستانی اور امیروں کی طرف سے غریب کا استحصال کتنی خوبصورتی سے بیان کر دیا گیا ہے اور عام فہم الفاظ اور پیغام کی ترسیل کا منتظم حوالہ حفیظ شاہد کس خوبصورت انداز میں پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتے ہوئے ہم حفیظ شاہد کے دیگر ادبی کارناموں کی طرف بڑھتے ہیں۔ ہاں مگر حفیظ شاہد نے سادہ الفاظ میں گہری باتیں کر کے تاثیر کے میدان میں سرایت پذیری کے جو جھنڈے گاڑے ہیں ان کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ہم حفیظ شاہد کی نذر ایک عارف کا یہ شعر ضرور کرنا چاہیں گے کیونکہ آپ نے وہ کار خیر سرانجام دیا ہے جو اہلِ مسند و منبر کے ذمہ تھا۔

شیخ مکتب کے طریق سے کشادہ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

حفیظ شاہد کام کی پختگی اور تسلسل پر یقین رکھتے تھے آپ نے خود ستائشی کے روایتی ہتھ کنڈے اپنانے کی بجائے محنت پر وقت صرف کیا اور عمل سے سونا بن کر اُبھرے۔ پھر بھی تعمیری تنقید کی بھٹی میں خود کو از خود جھونک کر کندن ہوئے بنا دَم نہ لیا۔ وقت کے شمس الادب حضرات کی صحبت اختیار کی اور فن کی معراج تک رسائی حاصل کی۔ تاریخ گوئی میں ایسا کمال حاصل کیا کہ جس کا خواب دُنیائے ادب کیلئے نامور ستاروں کا خواب رہا لیکن تعبیر حفیظ شاہد کے حصے میں آئی۔

نکتہ دانِ ادب ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ فنِ تاریخ نویسی کس قدر نایاب اور کٹھن ہے صرف اور صرف شناور قلزمِ فن و ادب ہی اس راز کو جان سکتے ہیں۔ تاریخ گوئی نثر میں یا قطعہ میں پس منظر پیش کیا جاتا ہے اور آخر میں ابجد کے ذریعہ اس کی تاریخ نکالی جاتی ہے اسی طرح اہم تاریخیں ان سطروں، مصرعوں یا شعروں کی صورت میں ذہنوں میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ غالب، مومن، داغ، دہلوی، شمیم متھراوی، رئیس امروہی، صبا اکبر آبادی، محشر بدیوانی اور نیساں اکبر آبادی کے ساتھ حفیظ شاہد کا نام بھی تاریخ گوئی میں قابلِ فخر انداز میں لیا جا سکتا ہے۔

تاریخ سازی کر گئے ہیں تاریخ گو ہوتے ہوئے
از ادب محروم نہ تاریخ کے سوتے ہوئے

☆☆☆

کلام حفیظ شاہد

کسی کی یاد میں لکھا ہے جو کچھ
یہی کچھ ہے، مرا اپنا ہے جو کچھ

اُسی کا عکس ہے لفظوں میں میرے
نظر کے سامنے دُنیا ہے جو کچھ

ضرورت مند ہوں، مجھ کو عطا کر
سخی داتا مرا حصہ ہے جو کچھ

مقدر ہے اسی کا نام شاید
مجھے وہ بے طلب دیتا ہے جو کچھ

بتا دیں گی ہوائیں ہر کسی کو
لبِ اشجار پہ قصہ ہے جو کچھ

مہ و خورشید تو کچھ بھی نہیں ہیں
مری مٹی کا اک ذرہ ہے جو کچھ

بھنور ہوں یا خس و خاشاک شاہد
ہمارا ہے سرِ دریا ہے جو کچھ

☆☆☆

*زاہدہ نور (خان پور)

شاعر میرے شہر کا

حفیظ شاہد سے واقفیت ذہن میں یہ سوال ضرور اُبھارتی ہے، لاہور سے تعلق نہ توڑتے تو شاید شہرت کے آسمان پر زیادہ دَمکتے۔ پتہ نہیں لاہور میں اُن کی بساط ادبی سیاست نے اُلٹ دی یا قسمت نے پاؤں میں خان پور کے گھنگھرو باندھ دیئے یا کچھ کام بغیر وجہ کے بھی ہو جاتے ہیں۔ ان کی ہجرت لاہور کی بدبختی ہو تو ہمیں کیا' خان پور کی خوش بختی ضرور ہے۔ جو ہوا خوب ہوا، لاہور اس لعل کو اپنے اندر نہیں سمو سکا کہ وہ ''گدڑی'' نہیں تھا۔ اس میں کون سی مقناطیسیت ہے کہ صوبے ہی نہیں پورے ملک کی کریم اس دودھ پر آن جمع ہوتی ہے اور لاہور کے ناز انداز محبوب کے، جس کو ٹیلنٹ کی کمی نہیں۔ حفیظ اَپر سے لوئر پنجاب نہ آتے تو ہم کس حفیظ کو اپنا کہتے؟ پتہ نہیں اپنے قیام کا خان پور نے حفیظ کو سہرا باندھا یا حفیظ نے خان پور کو۔ اپنے سکول سرٹیفکیٹ کے مطابق حفیظ نے 5 جون 1942ء کو اور گھریلو ریکارڈ کے لحاظ سے 1940ء میں اس دُنیائے آب وگل میں آنکھ کھولی۔ بقول حفیظ صحیح تاریخ کا یقین ممکن نہیں ہاں مجھے والدِ محترم کی وفات اور تجہیز و تکفین کے چیدہ چیدہ واقعات یاد ہیں۔

عمر میں دو سال ڈالنے یا نکالنے سے اس عزت و ناموری پر کوئی فرق نہیں پڑتا جو آئندہ سالوں میں حفیظ کے لیے نوشتہ تقدیر بن چکی تھی۔ حفیظ کا تعلق ضلع جالندھر کے ایک اَرائیں خاندان سے ہے جو زراعت سے منسلک ہیں۔ گڑھا وہنداں جالندھر چھاؤنی کے قریب ایک بڑا گاؤں ہے۔ ان کے دادا میاں فتح الدین کچھ اَراضی کے مالک تھے جن کے چار بیٹے میاں رحیم بخش، میاں خیر دین، میاں نبی بخش، میاں کریم بخش، میاں خیر الدین کی قسمت میں حفیظ شاہد جیسے انوکھے کی ولدیت لکھی تھی۔ دادا کا انتقال بچپن میں ہو گیا، دَدھیالی رشتہ داروں میں حفیظ سب سے زیادہ متاثر اور قریب غلام قادر آزاد ہیں جو میاں رحیم بخش کے بیٹے ہیں۔ آزاد اسلامیہ کالج نارووال کے وائس پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے۔ ایک وسیع المطالعہ شخصیت، معتبر نقاد اور بہترین شاعر ہیں۔ آج کل لندن میں مقیم ہیں جب کبھی پاکستان واپسی ہوتی ہے یہاں کے علمی ادبی حلقوں میں تقاریب کے انعقاد کے ساتھ آزاد گھُلے ملے دکھائی دیتے ہیں۔ انہی میں سے لگتے ہیں فاصلہ اجنبیت کا تصور وار نہیں لگتا۔ حفیظ کے الفاظ'' آزاد میرے تایازاد بھائی ہی نہیں، بہترین دوست ہیں۔ لاہور میں اُن کے ساتھ گزرے روز و شب کی خوشگوار اور ناقابلِ فراموش یادیں مرا سرمایہ حیات ہیں۔''

میاں خیر الدین (والد حفیظ شاہد) ملٹری انجینئرنگ سروس میں مکینیکل فٹر تھے۔ قیامِ پاکستان سے دس سال قبل لاہور ملٹری کوارٹر پاور ہاؤس (متصل گلوب سینما) میں اَقامت پذیر ہوئے، جلد ذاتی مکان (مغلپورہ اور باغبانپورہ کے درمیان) محلہ نبی پورہ آرائیاں منتقل ہو گئے۔ ان کو ٹی بی کا عارضہ تھا جس نے اپنے گھر اور بچوں کے درمیان زیادہ نہ رہنے دیا۔ دو ماہ انڈین ہسپتال IMH میں زیرِ علاج رہنے کے بعد جانبر نہ ہو سکے۔

حفیظ شاہد کہتے ہیں، ”یہ 2 جون 1945ء کی رات تھی جب مرے والد کی میت لاہور چھاؤنی کے IMH سے گھر لائی گئی۔ یوں میں شاہراہِ فہم وشعور پر قدم رکھنے سے پہلے ہی شفقتِ پدری سے محروم ہوگیا۔“

حفیظ کی والدہ رَشیدہ کا تعلق سمندری ضلع فیصل آباد کے گاؤں 247 گ ب سے تھا۔ان کے 8 بیٹے، بیٹی کوئی نہیں یعنی حفیظ بہن کے بغیر تھے۔ والدہ کی وفات کے وقت بڑے بھائی عبدالعزیز آٹھویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھے۔ لاہور میں ذریعہ روزگار نہ رہا۔ حفیظ کے ماموں، بہن اور بچوں کو اپنے ساتھ چک 247 لے گئے۔ عبدالعزیز نے تعلیم اَدھوری چھوڑ کر سٹور کیپر کی نوکری کر لی۔ اُدھر گاؤں میں حفیظ کی پرائمری تعلیم شروع ہوئی، اِدھر لاہور میں عبدالعزیز کے اکیلے ہونے کی وجہ سے ماں پھر بچوں سمیت واپس آگئیں۔ حفیظ پرائمری سکول شالا مار میں داخل ہوئے پھر گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ پہنچے۔اس معروف درسگاہ میں ممتاز مفتی مدرس تھے۔ حفیظ کو طالب انصاری بدایونی، مرتضیٰ حسین، فاضل لکھنوی جیسے نامور اَساتذہ بھی یہیں ملے۔

حفیظ شاہد کی پہلی تعلیمی ناکامی کی داستان وہی دُکھ بھری جو اکثر والدین کے ہاتھوں دُہرائی جاتی ہے اُن کے فطری رُجحان کے برعکس بڑے بھائی نے سائنس بطور مضمون رَکھادی لہٰذا چند نمبروں کی کمی سے میٹرک میں سیکنڈ ڈویژن نہ آسکی۔ میٹرک کے بعد دیال سنگھ کالج میں داخلہ لے لیا۔ دو سال پڑھتے رہے مگر امتحان دیئے بغیر کالج چھوڑ دیا اور حبیب بنک میں نوکری اختیار کرلی۔ اس وقت بنک پرائیویٹ تھے۔ محنتی کارکن کی جلد ترقی ہوجاتی۔ حفیظ یہاں رہتے تو فکرِ معاش کا مسئلہ ختم رہتا۔نوکری 1963ء میں شروع کی۔ ماں شوہر کے بغیر تھی اور کماؤ پوت ہوجانے کے بعد کوئی باعثِ تاخیر نہ تھا کہ اگلا کام خانہ آبادی کا ہوجائے۔ 1965ء میں حفیظ کی شادی اپنی خالہ زاد ثریا بانو سے عمل میں آئی۔ سسر ماسٹر عبدالرحمٰن موروثی پور ہائی سکول ضلع فیصل آباد میں تدریس کا کام کرتے تھے۔ ثریا نے پرائمری گاؤں کے سکول سے کیا۔ اگرچہ یہ شادی بزرگوں نے طے کی تھی مگر لڑکے لڑکی کی رضامندی برابر شامل تھی اور حفیظ کا ایک شعر بے تکلف رشتہ داروں کو مذاق کی تحریک دیتا۔

دل راہِ محبت میں ابھی گرمِ سفر ہے
ہم خاک نشینوں کی ثریا پہ نظر ہے

زندگی کے سرد وگرم چکھنے میں ایک ساتھ میسر ہوگیا۔ خاص لوگوں کی زندگی قدرتی طور پر طوفانوں کی زد میں رہتی ہے۔ تپا کر کندن بنانا، خاصل کر کے مزید قریب کرنا، بنانے والے کا طریقہ ہے۔ 1971ء میں ناگزیر وجوہات نے بنک کی نوکری چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ بعدازاں ذاتی کاروبار کے ساتھ فلم کے لیے گیت نگاری شروع کردی۔ ایک پشتو فلم خود بھی بنائی جو شومئی قسمت فلاپ ہوگئی اور کافی بلکہ ناقابلِ تلافی نقصان دے گئی۔ وہ جمع پونجی تھی ہی نہیں جو اُس پر لگ گئی۔ اس کے ساتھ حفیظ کی سوچ کا دائرہ نہ صرف فلم انڈسٹری (ایک وجہ اس کا برا ماحول بھی تھا) بلکہ لاہور ہی سے باہر نکل گیا۔ ہجرت کے ایک طرف مسائل اور آرام دوسری طرف فتح وظفر لیے ان کے لیے کب سے چشم براہ تھی۔

بات شادی کی چل رہی تھی۔ حفیظ نے اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو ہمیشہ مقدور بھر پورا کیا۔ حفیظ کے دو بیٹے، چار بیٹیاں ہیں۔ ثریا اور بچوں کا مشترکہ گِلہ، بلکہ واحد کمی جو اُن کو حفیظ کی طرف سے ملی، کہ جتنا چاہیے تھا اتنا

سب کو وقت نہیں دیا گھر کے اندر رہتے ہوئے زیادہ وقت کتابوں اور شاعری کو دیتے۔ وہ ایک شفیق باپ ہیں، معمولی کوتاہیوں کو نظر انداز کرنے والے بیٹوں کو تو کبھی سختی سے ڈانٹا تک نہیں۔

شعر و ادب سے لگاؤ بچپن سے طبیعت میں موجود تھا۔ اس شوق نے ایسی دَر اندازی کی کہ کسی اور طرف کا رہنے نہ دیا۔ نبی پورہ کی لائبریری سے کرائے پر کتابیں لاتے پڑھتے۔ کہتے ہیں، ''میں دس بارہ کی عمر میں تک بندی کا آغاز کر چکا تھا۔ نبی پورہ کے اردگرد کا ماحول ادبی تھا۔ مجالس و مشاعرے منعقد ہوتے رہتے جس سے میرے شعری ذوق کی تربیت ہوئی۔ بھائی عبدالعزیز کے مطابق حفیظ سکول کی ادبی تقریبات میں بھرپور حصہ لیتا۔ حفیظ شاہد دسویں تک اچھے خاصے شعر کہنے لگے کالج کی تعلیم کے دوران ان کی غزلیں اَدبی رسائل و جرائد میں چھپنے لگیں جن میں ''قندیل، رومان، شمع، نیا زمانہ (لاہور)، بیسویں صدی (دہلی)'' قابلِ ذکر ہیں۔

حفیظ شاہد ''ینگ لٹریری سرکل'' کے ممبر بھی تھے یہ حلقہ لاہور کی ادبی زندگی میں مقبول بھی تھا اور معروف شخصیات کی ہر ماہی یہاں میسر رہی۔ حفیظ کی شامیں ماہنامہ محفل کے دفتر میں گزرتیں جس کے مالک، مدیر طفیل ہوشیار پوری تھے۔ بقول حفیظ ''دوستوں کا معمول تھا شام کے وقت محفل کے دفتر اکٹھے ہوئے محفل شعر و سخن برپا کرتے۔ فی البدیہہ اشعار کہے جاتے۔ ہم طرحی غزلیں کہی جاتیں جو 'محفل' میں شائع ہوتیں۔ ادبی مسائل زیرِ بحث آتے، ادیبوں، شاعروں کے عمومی رویّوں پر بحث ہوتی، باہر سے آنے والے مہمان شعراء سے ملاقاتیں ہوتیں، غرض اس ماحول اور شعراء سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کے مواقع نصیب ہوتے۔''

اب کچھ شعر و فن کے حوالے سے بات ہو جائے۔ حفیظ شاہد کی سات کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

1۔ سفر روشنی کا 1983ء 2۔ چراغ حرف 1989ء

3۔ مہتاب غزل 1994ء 4۔ یہ دریا پار کرنا ہے 1997ء

5۔ فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی 2004ء 6۔ سورج بدل رہا ہے 2008ء

7۔ ختمِ سفر سے پہلے۔ (کلیات) 2010ء

(۱) سفر روشنی کا:

یہ پہلی کتاب روایت اور جدت کا حسین امتزاج ہے۔ حفیظ کی زندگی کو کل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ماضی و حال کو ایک لڑی میں جوڑ کر شاندار مستقبل کا خواب دیکھتے ہیں۔ سفر کا استعارہ اساسی اہمیت کا حامل ہے۔

رغبت رہی ہے مجھ کو ہمیشہ سفر کے ساتھ
مجھ کو ہے اک تعلق بے نام گھر کے ساتھ

خزاں نے مجھ کو دیئے ہیں چرکے بہار نے بھی عذاب بخشے
میں زخم خوردہ ہوں موسموں کا نئی رُتوں کی تلاش میں ہوں

(۲) چراغ حرف:

میں انتظار میں بیٹھا تھا ایک مدت سے
نئے چراغ جلا کر نئی شبوں کے لیے

حفیظ ایک باشعور ناظر کی طرح حالات و واقعات کو نہ صرف دیکھتے ہیں بلکہ تخلیق کار کی نظر سے تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ چراغِ حرف میں عصری صورتِ حال کی عکاسی روایت کے ساتھ جڑے رہنے کا ثبوت غزل سے محبت کی صورت میں عیاں ہے۔ جدت موضوعات بھی موجود ہے۔ عہدِ حاضر کے مسلم ممالک خوف اور عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ مسلم قوم کے زوال کا نوحہ چراغِ حرف میں دکھائی دیتا ہے۔ زندگی کا تقابل بھی ہے۔

روشن چراغ اشک رو اپنی آنکھ میں
ظلمت کی وادیوں میں ضیاء پاؤ گے کہاں
اس قوم پر زوال کے آثار دیکھ کر
دل رو دیا نوشتۂ دیوار دیکھ کر

(۳) مہتاب غزل:

موضوعات کا دائرہ وسیع ہوا۔ روایت وجدت کا امتزاج زیادہ پختگی کے ساتھ ہے۔ یہاں حفیظ شاہد سیاسی، سماجی، معاشی اداروں پر غور کرتے نظر آتے ہیں۔ حفیظ ترقی پسند شاعر کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ترقی پسند نظریئے یا فیشن کی عطا نہیں بلکہ زندگی برتنے کے حقیقی تجزیئے کا حاصل ہے۔ موجودہ استحصالی نظام وطبقاتی کشمکش کی انسانوں کے درمیان کھڑی دیواروں کی داستان اشعار میں موجود ہے۔ انسانی نفسیاتی پیچیدگیاں بھی موضوع ہیں۔ شہروں کی طرف آبادی کا انخلاء اور اس کے پیدا کردہ مسائل، مہتابِ غزل تک آتے، تسلیم ورضا کا عنصر پیدا ہو چکا ہے، اس لیے تقویت بھی دکھائی دیتی ہے۔ ؎

لے جائے ہوا مجھ کو جدھر چاہے اڑا کر
اِک برگ ہوں اور ٹوٹ کے ٹہنی سے گرا ہوں
اس طرح بانٹی ہے کس نے اس نگر میں روشنی
مرے گھر میں ہے اندھیرا ترے گھر میں روشنی
اہلِ سفر کو سائے سے محروم کر دیا
اہلِ ہوس نے راہ کے اشجار بیچ کر

(۴) یہ دریا پار کرنا ہے:

یہاں تک آتے حفیظ کا اعتماد بڑھا اور لفظ پر اعتبار قائم ہوا۔ حفیظ کا دھیما لہجہ فکری پختگی کے ساتھ حقائقِ کائنات کی پردہ کشائی کرتا ہے۔ اداروں کی بدانتظامی، بکاؤ دانشوروں، بدعنوان سیاستدانوں پر طنز کیا ہے۔ رجائیت ومثبت اقدار کا بھروسہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ انسانی رویوں پر طنز، تسخیر خلا جاری اور زمین کے ننگ اور بھوک سے بے خبری۔ (از: مظہر عباس۔ تحقیقی مقالہ، حفیظ شاہد)

مجھ کو کیا تھا قیدی تقدیر کس لیے
قدرت سے انتظارِ جواب و سوال ہے
وہی ہے بھوک اہلِ زر کی لیکن لوگ کہتے ہیں

مجھ کو کیا تھا قیدی تقدیر کس لیے
تھوڑی سی روشنی ہی سہی روشنی تو ہے
اُمید کے چراغ بجھاتے ہو کس لیے
قبروں پہ ہے چراغاں بستی میں ہے اندھیرا
مُردوں سے ہے محبت ، زندوں سے دشمنی ہے
اس زمیں کی وسعتوں سے ہے ابھی نا آشنا
آسمانوں پر مگر انسان کی پرواز ہے

(۵) فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی:

حفیظ حساس شاعر ہے، جب احساس کی تاروں کو مضراب دکھاتے ہیں تو ایسی جھنکار پیدا ہوتی ہے جو دلوں کو تڑپاتی ہے۔ اس کا احساس ذات تک محدود نہیں بلکہ قاری اپنی ذات کا احساس سمجھنے لگتا ہے۔ وہ زندگی کی اَن گنت حسرتوں کے نتائج سے آشنا ہیں۔ (گوہر ملسیانی)

(۶) سورج بدل رہا ہے:

بعض لوگ آنکھوں میں جذب ہو کر دل میں سما جاتے ہیں۔ بعض ذہن وفکر کے زینے سے بساطِ دل پر اُتر آتے ہیں۔ حفیظ کا شمار موخر الذکر لوگوں میں ہوتا ہے۔ حفیظ نے کشتِ غزل کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ ایک سال مرے پاس بہاولپور چیک اپ کرانے آئے۔ ہوموگلوبن 60%، دوسرے سال 3% معلوم ہوتا ہے۔ شاعری کے سمندر کی گہری تہوں سے تغزل کے موتی تلاشنے والے شاعر کا ہوموگلوبن نارمل ویلیو سے کم ہی ہوتا ہے۔ جوں جوں اچھے شعر کہتے جاتے ہیں وہ شعر ان کا خون پیتے جاتے ہیں۔

کہیں جلتے ہوئے پیکر کہیں تپتے ہوئے پتھر — ہمیں کیا کیا دکھائے گا سفر میں دھوپ کا صحرا
جن یادوں سے دامانِ تمنا رنگین — ہم نے کاٹے ہیں ترے سفر کچھ ایسے
جب دھوپ میں چلو گے پگھل جائے گا بدن — پھر کس لیے ہو برف کا پیکر بنے ہوئے
رات جب جدائی کی روشنی کو ترسے گی — میں ترے تصور میں چاند بن کر اُبھروں گا
میں محبت کی روشنی بن کر — وقت کی کہکشاں میں رہتا ہوں

حفیظ کی خدمات کے اعتراف میں 2005ء میں مظہر عباس نے ایم فل اُردو مقالہ بعنوان ''حفیظ شاہد ... فن و شخصیت'' ترتیب دے چکے ہیں۔ حفیظ شاہد کو ''بہترین شاعر ایوارڈ'' چولستان ویلفیئر کونسل 2000ء میں دے چکی ہے۔ جوہر ہومیو کالج خان پور کی طرف سے 2001ء میں حفیظ کو ''ادبی خدمات ایوارڈ'' ملا۔ مرے خیال میں اگر حفیظ لاہوری ہوتے تو صدارتی ایوارڈ کہیں نہیں گیا تھا۔ خان پور کی محبت نے تمغوں سے محروم رکھا۔ لوگوں کے لیے وہ شاہد ہوں یا حفیظ مرے تو بڑے بھائی ہیں، مرے لیے یہ رشتہ باعثِ عزت ہے۔

(*مضمون نگار گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج برائے خواتین خان پور میں اُسسٹنٹ پروفیسر ہیں)

☆☆☆

سعدیہ وحید (خان پور)

حفیظ شاہد... اہلِ فکر و فن کی نظر میں

حفیظ شاہد کے چھ شعری مجموعوں پر لکھے گئے مقدمے، پیش لفظ، تقریظ

اُس کی قُربت بہارِ دیدہ و دل
اُس کی دُوری خزاں کا موسم ہے

حفیظ شاہد کا پہلا شعری مجموعہ... ''سفرِ روشنی کا''
میں شامل مقدمہ (طبع اوّل)

عبادت بریلوی

غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے، جس نے ہر دَور میں زندگی کا ساتھ دیا ہے اور اس کے انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں کی ترجمانی بڑے سلیقے سے کی ہے۔ خاص طور پر اس زمانے میں جس کو عہدِ جدید کہا جاتا ہے، نئے دَور کے نئے احساس کی ترجمانی نے ہر صنفِ ادب کو جدت سے ہمکنار کر دیا ہے۔ غزل نے موجود زمانے میں اس نئے احساس کی ترجمانی بڑھ چڑھ کر کی ہے۔ غزل کا ہر شاعر آج نئی زندگی کا ترجمان اور نئے حالات کا عکاس ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ غزل میں آج روایتی عشقیہ معاملات کی ترجمانی برائے نام نظر آتی ہے۔ برخلاف اس کے زندگی کے دوسرے انفرادی اور اجتماعی معاملات کی ترجمانی کا پلہ اس میں بہت بھاری دکھائی دیتا ہے۔

آج کی غزل میں انسان کی عظمت کا خیال زیادہ نمایاں ہے لیکن اس عظمت کے باوجود اس کی مجبوریوں اور معذریوں کی ترجمانی اس پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ آج کا انسان تنہا ہے اور یہ تنہائی اس کو ہر لحظہ ڈستی رہتی ہے۔ آج کا انسان مظلوم اور پریشان حال ہے۔ اس لیے کہ زندگی میں قدروں کی شکست و ریخت نے اس کو اپنے ماحول کے لیے اجنبی بنا دیا ہے۔ وہ سکون اور طمانیت کو تلاش کرنے میں سرگرداں ہے۔ لیکن وہ اسے نصیب نہیں۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں جبر و استبداد ہے، افلاس ہے، زبوں حالی اور پریشان خیالی ہے، وہاں انسان کو یہ سکون بھلا کس طرح نصیب ہو سکتا ہے اور یہ طمانیت بھلا کس کے حصے میں آسکتی ہے۔ سب سے بڑا اَلمیہ تو یہ ہے کہ انسان آج مادہ پرستی کا شکار ہو گیا ہے اور اپنے پیٹ کے دوزخ کو بھرنے اور دنیاوی زندگی کی آسائشیں فراہم کرنے میں اس حد تک گم ہے کہ لطیف چیزوں کا احساس اس کے ہاں نام کو بھی باقی نہیں رہا ہے۔ جنگ کے بادل اُس کے سر پر منڈلا رہے ہیں۔ اس کے سامنے خون ہو رہے ہیں اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔ مردم آزادی اور ایذا رسانی کے مناظر کو دیکھ دیکھ کر اس کا سینہ فگار اور اس کی شخصیت لہولہان ہے۔ وہ درخت کاٹ رہا ہے اور سر بفلک عمارتیں تعمیر کر رہا ہے لیکن اس کے پاس سر چھپانے تک کے لیے جگہ نہیں۔ درختوں کا سایہ

تک اب اُسے نصیب نہیں۔ سبزہ بیگانہ کی آشنائی سے بھی وہ محروم ہے۔

یہ اور اس طرح کے اَن گنت جذباتی اور ذہنی مسائل ہیں جن کو آج کا غزل گو شاعر اپنا موضوع بنا رہا ہے۔ اس کی ذہنی پختگی اور جذباتی صحت مندی نے غزل کو ایک زندہ اور جاندار صنفِ سخن بنا دیا ہے۔ اور جدید غزل گو شاعروں کے نئے اَحساس اور نئے شعور کی بدولت غزل کی صنف با اعتبار مضامین اور با اعتبار فن روز بروز اپنے حدود کو وسیع کر رہی ہے اور اس میں پختگی کا رنگ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔

اس اہم کام میں وہ تمام غزل گو شاعر شریک ہیں جو لکیر کے فقیر نہیں ہیں اور جنہوں نے صرف روایتی شاعری ہی تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا، برخلاف اس کے جن کے نئے احساس اور نئے شعور نے عرفان و آگہی کے دروازے کھولے ہیں اور اُنہیں ایک ایسے رنگ محل میں داخل کر دیا ہے جہاں معمولی سے معمولی چیز بھی رنگین پر کار اور پہلودار نظر آتی ہے لیکن ساتھ ہی زندگی کے سنگین حقائق بھی بے نقاب دکھائی دیتے ہیں۔

ایسے غزل گو شاعروں کے لیے اس کی زندگی کی ہر چیز بہ ذات خود ایک دنیا ہے کیونکہ ان کے ساتھ یادوں کی ان گنت دنیائیں آباد ہیں اور جذبات و احساسات کا اتنا ہجوم ہے کہ وہ سب کے سب آج کے غزل گو شاعروں پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان شاعروں کے ہاں زندگی کے نشیب و فراز اپنی تمام تر گہرائیوں اور وسعتوں کے ساتھ آج کی غزل کا موضوع بنتے ہیں۔ آج کا غزل گو شاعر اسی صورت حال سے پہچانا جاتا ہے۔

ایسے ہی غزل گو شاعروں میں حفیظ شاہد بھی ہیں جو نہایت خاموشی سے غزل کو با اعتبار مضامین وسیع کرنے کا کام انجام دے رہے ہیں۔ ان کی غزل میں تجربات کی رنگا رنگی ہے جس کو انہوں نے نئے احساس اور جذبے سے ہم آہنگ کر کے کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ جدید دَور کے ہر فرد کو اپنے تجربات معلوم ہوتے ہیں۔ صرف چند اشعار سے ان کی غزل کے موضوعات کے تنوع اور رنگا رنگی کا اندازہ ہوگا۔

ہر اک شاخِ شجر گزرے دنوں کی
سناتی ہے مجھے اکثر کہانی

مری نظر میں ہیں کچے گھروں کی دیواریں
نہ اُٹھ سکیں گے مرے ہاتھ بارشوں کے لیے

دشمنوں سے بھی دوستی کر لی
دیکھ کر ہم نے دوستوں کے رنگ

کچھ ایسا بدلا ہے رنگ زمانے کا
اب تو جھوٹے لوگ بھی سچے لگتے ہیں

کچھ ایسے لمحات بھی آتے ہیں شاہد
جب ہم اپنے آپ کو بچے لگتے ہیں

تم سمجھتے ہو پرندے بھول بیٹھے ہیں اُڑان
کاش تم ان کے کبھی ٹوٹے ہوئے پَر دیکھتے

اپنی بستی میں پلٹ آئے ہیں شاہد اس لیے
ہم کہاں تک شہر میں بے جان پتھر دیکھتے

دیتی ہے مجھ کو اذنِ سفر روشنی یہاں
سڑکوں پہ جا بجا یہ اشارے عجیب ہیں

یہ چند اشعار جو اوپر نقل کیے گئے ہیں، حفیظ شاہد کے کلام کی معنویت، ان کے جذبے، خیال اور فکر کے مخصوص رنگ و آہنگ کے صحیح عکاس اور ترجمان ہیں۔ اور ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف روایتی غزل کے شاعر نہیں ہیں بلکہ نئے احساس، نئے جذبے اور نئے خیال اور نئے شعور کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں حسن و عشق کی باتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ برخلاف اس کے ان میں تو زندگی کی سنگینی اور اس کے ٹھوس حقائق کا فنکارانہ اظہار ہے۔ نئی نسل کا انسان جس طرح اس وقت کی زندگی کو دیکھ رہا ہے اور ایک مخصوص نقطہ نظر سے اشیاء اور حالات و واقعات کو دیکھنے اور محسوس کرنے کا جو فکری رجحان اس کے ہاں پیدا ہوا ہے اس کی ترجمانی ان اشعار میں اس طرح کی گئی ہے کہ غزل کے کارگہ شیشہ گری کو ٹھیس نہیں لگتی۔ یہ نیا احساس اظہار و ابلاغ کے لیے ایسے نئے وسیلوں کو اُن کے ہاں پیدا کرتا ہے جس سے جدید غزل پہچانی جاتی ہے۔ حفیظ شاہد کے کلام میں شاخِ شجر، گھر کی دیواروں، پرندوں کی اڑانوں، سڑکوں کی روشنی اور اس کے اشاروں، شہروں، دیہاتوں، قصبوں، گھروں، تناور درختوں، میدانوں اور سبزہ زاروں وغیرہ کی جو تصویریں اُبھرتی ہیں۔ ان میں نئے احساس کی بدولت پیدا ہونے والی نئی معنویت اور نئے جمالیاتی اظہار کے مختلف رنگ دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اور یہی اُن کی غزل کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

ان کا کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے نئی معنویت کو نئے جمالیاتی اظہار کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ کیا ہے۔۔۔ اور یہی غزل کے فن کا کمال ہے۔ اس کی مثالیں غزل کی تاریخ کے ہر دور میں ایسے شاعروں کے ہاں ملتی ہیں جن کا اَحساس نیا ہے اور جو بدلتی ہوئی زندگی کو سمجھنے اور اُس کو دوسروں تک پہنچانے کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ حفیظ شاہد کا مجموعہ کلام ''سفر روشنی کا'' جو اُن کی نئی غزلوں پر مشتمل ہے، جدید غزل کے نئے رجحانات کا صحیح آئینہ دار ہے۔ اس میں نئی غزل سے دلچسپی لینے والوں کے لیے شعورِ آگہی اور احساسِ جمال دونوں کی تسکین کا بڑا سامان ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ اس کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

"سفر روشنی کا" ...... (طبع اوّل)

عارف عبدالمتین

جدید اساسی عناصر پر استوار، ہمہ جہت غزل نگاری کا پرمایہ صحیفہ!

جدید اُردو غزل نے اپنی جدیدیت کا اظہار کئی نمایاں اور منفرد پہلوؤں سے کیا ہے۔ کہیں اس نے غزل کے کلاسیکی لسانی ڈھانچے کو مسترد کر کے نئی لفظیات کی تشکیل کو اپنا طرۂ امتیاز بنایا ہے، کہیں اس نے پرانے اور گھسے پٹے موضوعات سے اپنا دامن چھڑا کر نئی زندگی کے نئے موضوعات کے اخذ و قبول سے اپنے آپ کو گراں قدر بنایا ہے۔ اور کہیں اس نے مروجہ غزل کو اس کے لغوی مفہوم کی تجدید سے رہائی دلاتے ہوئے ذاتی محبت کو کائناتی وابستگی میں ڈھال کر اپنے وجود کو ارتقائی امتیاز سے ہمکنار کیا ہے...... مگر بہت کم جدید شعراء کے ہاں ایسا ہوا ہے کہ انہوں نے اپنی غزل کو جدیدیت سے آراستہ کرنے کے لیے اس سے ایسے اعتدال و توازن کا اہتمام کیا ہو جو تمام نئے رجحانات کا نقطۂ اتصال بن کر اس البیلی صنفِ سخن کو ایک مخصوص نوعیت کی ہمہ گیریت سے سرفراز کر دے...... اور میری منکسرانہ رائے میں حفیظ شاہد ایسے ہی کمیاب جدید غزل نگاروں میں سے ایک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جب ان کی غزل گوئی کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس دلاویز حقیقت کا ادراک ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے فن کے رنگ محل کو جن جدید اساسی عناصر پر استوار کیا ہے وہ بڑے ہمہ جہت ہیں۔ گویا اگر ایک طرف وہ نئے لسانی دوو بست کا اجتہاد کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ خارجی اور داخلی حوالے سے نئے موضوعات کی داغ بیل ڈالتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور تیسری طرف وہ اپنے ہنر کو عالمگیر شیفتگی کا منظر بناتے نظر آتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں تحسین وستائش کی خاص بات یہ ہے کہ اُن کی تخلیق کاری ہمہ وقت افراط و تفریط سے محفوظ رہتی ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ ہم اُن کے کلام کا مطالبہ کرتے ہوئے نہ تو ان ناگوار لسانی تشکیلات سے متعارف ہوتے ہیں جو عام طور پر مطلق شخصی بوالعجبی کی پیداوار ہوتی ہیں۔ اور نہ ہی انہیں موضوعات کی جدت کے حوالے سے مہمل خیال آفرینی کا مرتکب ہوتے مشاہدہ کرتے ہیں اور نہ انہیں آفاقی دلدادگی کے شوق فراواں کا شکار ہو کر خلائے بسیط میں معلق ہوتے دیکھتے ہیں ، بلکہ اس کے برعکس ہمیں ان کے قدم بڑی پامردی کے ساتھ اپنی دھرتی میں پیوست محسوس ہوتے ہیں۔

جہاں تک نئے اظہاری پیکر تراشنے کا تعلق ہے، حفیظ شاہد نے اس سلسلے میں بڑے نفیس ذوق مال کا مظاہرہ کیا ہے اور ان کا کلام قدم قدم پر ہمیں اس صداقت کا شعور بخشتا ہے کہ قدرت نے انہیں نہایت نزاکت آگیں حسن کاری کے ہنر سے بہرہ ور کیا ہے، اور یہ اسی ہنر کا فیضان ہے کہ ان کے ابلاغی سانچوں میں غرابت، ثقالت اور ژولیدگی کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا، بلکہ اس کے برعکس ان میں ایک ایسی مانوسیت، لوچ اور بے ساختی ہوتی ہے جس کے طفیل ایک عام قاری یا سامع تک کو پتہ نہیں چلتا کہ حفیظ شاہد نے ترسیلِ جذبات و افکار میں کس مہارت کا اہتمام کیا ہے، وہ تو صرف اس قدر جانتا ہے کہ اس پر گویا کوئی لسانی سحر تک پھونک دیا گیا ہے، جو اسے ایک بحرِ زیبائی بن کر بہائے لیے جا رہا ہے۔ چند اشعار نمونے کے طور پر ملاحظہ فرمائیے۔ وہ کہتے ہیں:

آرزو کا سفر ہے اور میں ہوں
یہ مسافت ہو جیسے قرنوں کی!

درد کی برسات ہے، آنکھوں میں ہے طوفانِ اشک
مجھ پر برسا ہجر کا موسم بھی ساون کی طرح!

شہرِ خیال میں ہے ترا پرَتوِ جمال!
آنکھوں کی روشنی ہے تری اک نظر کی یاد

عجیب ہے یہ تلاش میری، ہے میرے کاندھوں پہ لاش میری
میں نفرتوں کا لباس پہنے، محبتوں کی تلاش میں ہوں

میں کیا دیکھوں پرانے منظروں کو
بسی ہے اک نئی دنیا نظر میں

صبح جب جاگے تھکاوٹ سے بدن تھا چُور چُور
رات بھر خوابوں کے جنگل میں سفر کرتے رہے

آرزو کی راہ میں بکھرے ہیں کانٹے ہر طرف
اور تاحدِ نظر اک دھوپ کا جنگل بھی ہے

چمن چمن ہیں بہار منظر
عذاب رُت میں مَیں گلاب چہرے

جہاں تک عہد جدید کی حیاتِ نو سے کشید کیے ہوئے موضوعاتِ نو کی تازہ کاری کا تعلق ہے، حفیظ شاہد نے ہر لحظہ بدلتی ہوئی زندگی کے نت نئے روّیوں کا مطالعہ ایک باریک بین شاہد کی طرح کیا ہے، انہیں اپنے داخلی نظام میں رچایا ہے اور پھر انہیں دل پذیر شعروں کی صورت میں ڈھال دیا ہے۔ اس صورتحال کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ان کے کلام میں اچھوتے خیالات و محسوسات کی گونا گونی اور تنوع ہی کا ادراک نہیں کرتے بلکہ ان میں بعض اوقات تناقض کا احساس بھی کرتے ہیں۔ مگر واضح رہے کہ یہ تناقض ان کی شاعری کو کسی فکری تضاد کی آماجگاہ نہیں بتانا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسے بذاتِ خود زندگی کے ان بظاہر متصادم پہلوؤں کی مخلصانہ نہ دیانتدارانہ عکاسی کی حیثیت حاصل ہے اور اگر ہم اس کا بحتاط تجزیہ کریں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ پہلو دراصل ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہوئے زندگی کو ایک مخصوص نورع کی کلیت ہی سے ہمکنار نہیں کر رہے بلکہ بحیثیت مجموعی اس کے استحکام و استمرار کے لیے بھی کوشاں ہیں اور یہی حفیظ شاہد کی شاعری کا نہایت مثبت اور درخشاں انگ ہے۔ اب ان کے چند

اشعار نئے موضوعات وافکار کی رنگارنگی کے مذکورہ تناظر میں ملاحظہ فرمایئے۔ وہ کہتے ہیں:

میں انتظار میں بیٹھا ہوں ایک مدت سے
نئے چراغ جلا کر، نئی شبوں کے لیے
اُنہیں بھی کاٹ کے دنیا نے بیچ ڈالا ہے
شجر اُگائے گئے تھے جو راستوں کے لیے

ہیں دفن اس جگہ تری تاریخ کے نقوش
بستی کے ساتھ ساتھ ، کھنڈر کا خیال کر

گاؤں سے جاتے ہوئے اُس نے کہا تھا ایک دن
اب مقدر میں ہوا تو ہم ملیں گے شہر میں

پوچھے نہ زندگی میں کسی نے بھی دل کے دکھ
اب شہر بھر میں ذکر میری خودکشی کا ہے

مجھ کو تو اب بھی اپنی روایات ہیں عزیز
مانا کہ آج دَور نئی روشنی کا ہے

گم کہیں نہ ہو جانا ، شہر کے جھمیلوں میں
میں کہاں کہاں تم کو بھیڑ میں صدا دوں گا

آپ نے غور فرمایا کہ ان اشعار سے زندگی کے اس سفر کا شعر جھلکتا ہے، جس کی جہت گاؤں سے شہر کی طرف ہے اور جس میں مدنیت کے نئے تقاضوں کے لیے جہاں کشش واحترام کا احساس ہوتا ہے وہاں تمدنی ارتقاء میں قافلہ انسانی کے اپنے سابقہ نقوشِ قدم کی قدر و منزل اور اہمیت و وقعت کے واضح ادراک کا بھی پتہ چلتا ہے۔۔۔ گویا ہمیں ان اشعار سے حفیظ شاہد کے اس صالح اندازِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے جو حال اور مستقبل کے خدو خال کی تعین میں ماضی کی کارفرمائی کے معجزے کا عرفان رکھتا ہے، جو موت کے حوالے سے زندگی کی گراں مایگی کی شناخت کے ہنر کا مظہر ہے، اور جسے صرف اسی جدیدیت کو قابلِ قبول قرار دینے کا حوصلہ ہے، جو روایت دوستی کے محکم اصول پر بھی استوار ہو، اور جو اپنے ہی جھمیلوں اور اپنی ہی جھما جھم سے خود کو محفوظ کر سکنے کی عالی ظرفانہ بصیرت کی امین بھی ہو۔ اب جہاں تک حفیظ شاہد کی محبت کے غیر معمولی ترفع کا تعلق ہے، ہم دیکھتے کہ ان کے ہاں ذاتی دلبستگی اساسی طور پر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے اور اسے التزام کے ساتھ موجود

بھی ہونا چاہیے تھا، البتہ آگہی کی پختگی اور شعور کے استحکام کے ساتھ ساتھ اس دلبستگی کے منطقے کو وسیع سے وسیع تر ہونا چاہیے تھا اور مقامِ طمانیت ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے۔ اور ہم آسودہ قلبی کے جلو میں محسوس کرتے ہیں کہ وہ بتدریج قومی، ملی اور آفاقی بندھن کے سہانے روپ میں ڈھلتی چلی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ صورت حال حفیظ شاہد کی شخصیت کے اس آزادانہ نشوو ارتقاء کا ایک قدرتی نتیجہ ہے، جس کے فیضان سے ان کا فن جمود وخمود کا شکار نہیں ہوا اور وہ اس المیہ کا نخچیر بننے سے بچ گیا ہے۔ جس کے تحت ہمارے بہت سے فنکاروں کا فن ان کے شباب کی جولانیوں کی رفتار مدھم پڑنے کے ساتھ اپنی آب وتاب ہی نہیں کھو دیتا بلکہ ایک مخصوص نوح کی جواں مرگی کے اندوہ ناک حادثے کی زد میں آجاتا ہے۔ اب حفیظ شاہد کے چند ایسے اشعار ملاحظہ فرمائیے جن میں ان کا جذبہ محبت مذکورہ ارتفاع سے ہمکنار دکھائی دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

شہر سے یوں ہی مجھے پیار نہیں شاہدؔ
شہر میں لوگ بھی رہتے ہیں مرے قصبوں کے

بارِ غمِ حبیب نے بخشے وہ حوصلے
بارِ حیات ہم نے خوشی سے اُٹھا لیا

شاہدؔ وہ شاخ رہتی نہیں بے ثمر کبھی
پیوستگی ہو جس کی مکمل شجر کے ساتھ

یہ بھی تو ہیں فروغِ بہاراں کی یادگار
گُل کی بجائے خار ملے ہیں تو کیا ہوا

مرا وجود تھا دیباچہ کتابِ حیات
میں داستاں بھی رہا، زیبِ داستاں بھی رہا

اس بات پہ ناراض ہیں اربابِ گلستان
کانٹوں سے محبت کی خطا مجھ سے ہوئی ہے

میں دشمنوں سے بھی ملتا ہوں دوستوں کی طرح
بڑے عجیب سے رسم و رواج رکھتا ہوں

میں ان معروضات کے ساتھ حفیظ شاہد کے اس پر مایہ صحیفے کی اشاعت کا گرمجوشی سے استقبال کرتا ہوں۔

دیباچہ طبع دوم

حفیظ شاہد

یہ اوائل ۱۹۸۳ء کی بات ہے کہ اپنے ادبی دوستوں کے پیہم اصرار اور مسلسل تقاضوں کے پیشِ نظر، نہایت عجلت اور رَواداری میں اپنی غزلیات کا اوّلیں مجموعہ ''سفر روشنی کا'' ترتیب دیا اور اپنے مربی اور بزرگ دوست طفیل ہوشیار پوری (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) کے حوالے بغرض اشاعت اور طباعت کر دیا۔ طفیل صاحب کمال شفقت اور عنایت سے اس کی کتابت سے لے کر طباعت تک تمام مراحل بہ طریقِ احسن طے کر کے، جولائی ۱۹۸۳ء میں اس مجموعہ کو منصۂ شہود پر لے آئے۔

مجموعہ تو چھپ گیا لیکن میں اس کے انتخاب اور معیارِ طباعت سے مطمئن نہیں تھا۔ اس کے باوجود خدائے بزرگ و برتر کے بے پایاں فضل و کرم سے ملک کے وقیع اور معیاری رسائل و جرائد نے اس مجموعۂ کلام کو اپنے تبصروں میں حرفِ تحسین و پذیرائی سے نوازا۔ شخصی اور انفرادی طور پر اس کے بارے میں گراں قدر آراء موصول ہوئیں۔ ان بیش قیمت تبصروں اور آراء میں سے کچھ کا مجملاً انتخاب یوں ہے:

(روزنامہ ''جنگ'' کراچی۔ ۱۸ نومبر ۱۹۸۳ء)

''اُردو کی جدید غزل میں جو نئے نام سامنے آئے ہیں۔ حفیظ شاہد کا نام ان میں شامل ہے اور ''سفر روشنی کا'' ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ حفیظ شاہد ان شعراء میں سے ہیں جنہوں نے اپنی راہیں خود تلاش کرنے کی کوشش کی ہے''۔

(روزنامہ ''مشرق'' لاہور۔ ۲۳ نومبر ۱۹۸۳ء)

''حفیظ شاہد ایک پختہ فکر اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اپنی غزل کے غالب اشعار کی روشنی میں وہ ایک تلاش میں ہیں۔ ان کی فکری پختگی، احساسات کے سفر میں بڑی خوبصورتی سے ان کا ساتھ دے رہی ہے۔ ''سفر روشنی کا'' دنیائے غزل میں ایک صحت مند اضافہ ہے''۔

(روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۸۳ء)

''حفیظ شاہد غزل کے اچھے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے کلام میں ایک سے زیادہ پرتوں نے انہیں نئے انداز کے شاعر ہونے کا احساس دلایا ہے اور امید کی جانی چاہئے کہ ادب کے قارئین انہیں خوش آمدید کہیں گے''۔

(ماہنامہ ''محفل'' لاہور۔ جنوری ۱۹۸۴ء)

''حفیظ شاہد نے زندگی کے راہرو کی حیثیت سے زندگی کے سفر پر گامزن ہونے والوں کو اپنی واردات سے متاثر کیا ہے۔ حفیظ کی غزل میں ایک آرزومند دل، ایک پُر امید احساس اور ایک توانا راہرو کی داستان ملتی ہے۔ کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ حفیظ شاہد زندگی کی ظلمتوں میں جلال و جمال کے چراغ روشن کر رہا ہے''۔

(ڈاکٹر حسن اختر۔ لاہور)

''حفیظ شاہد عصرِ حاضر کا حساس شاعر ہے۔ اس کی شاعری میں زمانہ موجود زندہ نظر آتا ہے۔ حفیظ ہمارے

لئے روشنی کا سفیر ہے اور ہمیں احساس کی دولت سے مالا مال کرتا ہے"۔

(حسن اکبر کمال۔ کراچی)

"حفیظ شاہد تازہ دم، تازہ خیال اور تازہ کار شعراء کے قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام "سفر روشنی کا" خود ان کی خلاقانہ صلاحیتوں کا اشاریہ ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو غزل کے ہمہ جہت امکانات کا اشاریہ بھی ہے۔

(آسی خان پوری۔ خان پور)

"حفیظ شاہد کی غزل محض تازہ کاری کی واردات نہیں بلکہ اس میں اپنے عہد کی معاشرتی، سماجی اور تمدنی زندگی کا گہرا شعور ملتا ہے۔ حفیظ شاہد کی شاعری مستقبل بعید تک زندہ رہنے کے لیے امکانات لئے ہوئے ہے کیونکہ حفیظ کی غزل کا سفر، روشنی کا سفر ہے"۔

بایں ہمہ میں اپنے مجموعہ کلام کی اشاعت اوّل سے غیر مطمئن تھا..... کچھ غیر معیاری طباعت کی وجہ اور کچھ غزلوں کے عاجلانہ انتخاب کی بناء پر..... میری خواہش تھی کہ میں اسے نظرِ ثانی اور ترمیم و اضافہ کے بعد دوبارہ خوبصورت انداز میں پیش کروں لیکن میری مصروفیات آڑے آتی رہیں اور یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ اب کہیں ۱۹۹۹ء میں سولہ سال کے بعد میری یہ دیرینہ تمنا پوری ہو رہی ہے۔

اس جدید اشاعت میں کیا کیا ترمیم و اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

ا۔ اس مجموعہ کی پہلی اشاعت میں کل ۷۱ غزلیں شامل تھیں جن میں ۱۱ غزلیں حذف کر دی گئی ہیں۔

۲۔ مختلف غزلوں میں نئے شعروں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ۳۔ اشاعت اوّل میں جہاں جہاں مقطعوں میں حفیظ (نام) استعمال کیا گیا تھا اسے شاہد (تخلص) میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ۴۔ ۱۴ نئی غزلوں کا اضافہ کیا گیا ہے ۔۵۔ حمد اور نعت کو نئی اشاعت میں شامل کیا گیا ہے۔

☆

اُس کے نرم لہجے میں حُسن ہے حلاوت بھی
پیار کا سُمندر ہے پیکرِ شرافت بھی

حفیظ شاہد کا دوسرا شعری مجموعہ ... چراغ حرف

مقدمہ.... ڈاکٹر وحید قریشی (لاہور)

مشرق میں تہذیبی منظرنامے کا عجیب حال رہا ہے کہ اکثر زبانوں نے جب بولیوں کی حیثیت سے آغاز کیا تو دیہات کی زبان اور شاعری سند رہی۔ چنانچہ عربی، فارسی اور اُردو میں ابتدائی شعری کلام اپنی سادگی کی وجہ سے مقبول ہوا۔ جذبات و احساسات کی سادہ صورتیں اور مناظرِ فطرت سے دل بستگی نے شعری سانچوں کو استوار کیا۔ عربی شعری روایت میں ریگستان کی وسعتیں، چاندنی راتیں، نخلستان اور مظاہرِ فطرت کے بعض پہلو بہت نمایاں رہے۔ اسی طرح فارسی شاعری میں دشت و صحرا نے اپنے شعراء کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اُردو شاعری کی ابتدائی صورتیں بھی امیجز کی سادگی اور خیالات کی غیر پیچیدہ شکلوں کی شاعری رہی، جس میں ۔۔ جذبات و احساسات کی دھوپ چھاؤں میں اپنی سادہ شکل میں نظر آتی ہے۔

جب تہذیبی ترقی ہوتی گئی اور رہنے سہنے کے طریقے اور تمدنی زندگی کے حوالے، پیچ دار ہوتے گئے تو تجربات نے بھی مرکب صورت اختیار کی اور شہری بود و باش نے پیش منظر اور پس منظر کے طور پر تجربے کی پیچیدہ شکلوں کو جنم دیا۔ مدتوں شعر و ادب شہروں کی میراث رہے۔ اُردو ادب دکن اور شمال میں درباروں کی زندگی کا پرستار ہوا تو ادب کی روایت میں عجمی عناصر کے ساتھ ساتھ شہری زندگی ظاہر ہوئی۔ برطانوی دور میں جب صنعتی ترقی کا آغاز ہوا تو یہ روایت اور زیادہ قوی ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لسانی اعتبار سے مستند زبان شہروں کی بن گئی۔ دہلی اور لکھنؤ تہذیبی روایات کے پاسدار ٹھہرے اور برصغیر پاک و ہند میں پھر رامپور، دکن اور لاہور کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی چلی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شعر و ادب کی جملہ روایات شہری زندگی کی عکاس ہو گئیں۔ پاکستان بننے کے بعد اگرچہ شہری زندگی میں صنعتوں کی فراوانی ہوئی لیکن اس کے دوش بدوش چھوٹے چھوٹے قصبے بھی ترقی پا کر تجارتی اور صنعتی لحاظ سے اہم ہو گئے۔

ان آس پاس کے نئے بنتے ہوئے شہروں کی اپنی تہذیبی اور تمدنی زندگی تھی جس میں دیہات کے منظر اور جذبات و احساسات کے بعض نئے سانچے تھے۔ اب ادب کے حوالے سے لاہور، کراچی اور پشاور کے مقابلے میں فیصل آباد، راولپنڈی، ملتان اور اس سے بھی آگے چل کر بعض قصبے ادب کے اجارہ دار بن گئے۔ ان شہروں میں بسنے والوں کا رہن سہن مقامی اور دیہاتی تھا۔ اُردو شاعری کی مضبوط روایت نے ان شہروں میں نیا آہنگ اختیار کیا۔ جہاں دیہاتی اور شہری کے فرق نے باہمی مقابلے کی صورت پیدا کی وہاں چھوٹے شہروں کے ادیبوں نے بھی اپنی اپنی گروہ بندیوں کو منظم کیا۔ سب سے پہلے بیداری کے یہ اثرات جہلم، راولپنڈی اور ساہیوال میں اُبھرے اور اُردو کے ادب کو بعض چوٹی کے شاعروں سے روشناس کیا۔ پھر یہ روایت اور پھلی پھولی، فیصل آباد، سرگودھا اور خانپور جیسے شہر بھی اپنی اپنی روایت کے امین ہوئے۔ علاقہ پرستی کے رجحانات قومی سطح پر منفی رجحانات کی تقویت کا باعث تھے لیکن ادبی سطح پر جس طرح رسائل اور جرائد نے ان ادیبوں کی پذیرائی کی اس میں مقامی عناصر اور لہجوں سے اردو شاعری کا دامن مالا مال ہوا۔ پھر جب صحافت، صنعت و تجارت بن گئی تو روزناموں کے ادبی ایڈیشن اس روایت کو مستحکم کرنے میں پیش پیش رہے اور ان میں بھی دُور افتادہ علاقوں کے شاعروں نے منظم طور پر اپنا سکہ منوایا۔

ان دُور دست علاقوں میں خانپور نے بھی اپنا ادبی تشخص اُجاگر کیا۔ اور بہت سے خانپوری شاعر ادب کے آسمان پر طلوع ہوئے۔ آسی خانپوری، حیدر قریشی، حفیظ شاہد اور کئی دوسرے شاعروں نے ادب کی دنیا میں قدم رکھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس سرزمین میں زبان و بیان اور لہجوں کی یکسانی کے باوجود قدیم و جدید کا ایک فرق بھی نمایاں ہے۔ بعض شاعر قدیم شعری روایتوں سے متاثر ہیں اور بعض جدید شعری تحریکوں سے اپنا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ جدید شاعروں میں سرگودھا اور ملتان کی شعری روایتوں کا اثر زیادہ ہے۔

حفیظ شاہد ان شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے جدید اثرات کے ساتھ ساتھ قدیم سانچوں کو بھی خیر باد نہیں کہا۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی علامتیں نئی نہیں لیکن ان میں ایک خاص طرح کی تازگی اور گھلاوٹ ہے۔ خانپور کی شہری اور دیہاتی عناصر سے مرکب زندگی ان کے کلام میں جا بجا جھلک دکھاتی ہے۔

جنگل، بیلے، سورج کی تمازت، اندھیرے اُجالے، دونوں کا نکھار، دیہاتی زندگی کا شہری زندگی میں بدلنے کا عمل اور اس سے پیدا ہونے والے احساسات کی دھوپ چھاؤں ان کے کلام میں ملتی ہے۔ شہری زندگی کا خوف و ہراس، قدروں کی شکست و ریخت، وفا اور محبت کی روز بروز بگڑتی ہوئی ساکھ، یہ عناصر حفیظ شاہد کی شاعری کو ایک ایسا سوز اور امیجری کا ایک ایسا انوکھا استعمال عطا کرتے ہیں کہ کبھی تو وہ حیرت سے بے خبر ہوتی ہوئی زمینوں کو آباد ہوتے دیکھتا ہے اور کبھی غم کے کھنڈر آباد کرتا ہے۔ اس صورتِ حال میں اس کی ذات اُجالوں میں اندھیرے، آگ کے دریا، اجاڑ صحرا، مسافرت اور موسموں کے بعض ایسے رنگ پیش کرتا ہے جو اس کی شاعری کو نیا آہنگ عطا کرتے ہیں۔ اس کے کلام میں سب سے زیادہ قدروں کے ٹوٹنے کا احساس ہے۔ محبت کی جنسِ نایاب کو وہ دل کے کونوں کھدروں سے نکالتا ہے۔ دل کی روشنی سے منظر کو آباد کرنے کی کوشش کرتا ہے اور شہر کے اجنبی راستوں میں اپنے ہی شہر کے باسیوں کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔ غبارِ حیات میں جب راہیں دُھندلا جاتی ہیں تو وہ رستوں کو مسدود دیکھتا ہے اور خوابِ تمنا کی نایابی کے قصے سناتا ہے۔ شہر کے مکین خوف کے جس عذاب میں مبتلا ہیں، اس کی تصویر کشی حفیظ شاہد کا محبوب مشغلہ ہے۔ بدلتے ہوئے معاشرے کے یہ شب و روز حفیظ شاہد کی غزل کا موضوع ہے۔ وہ غزل کی عشقیہ روایت کا شاعر ہے۔ اس لیے اُردو اور فارسی کی شاعرانہ روایتوں سے بھی جا بجا کام لیتا ہے لیکن اس کا بنیادی غم بطور شاعر معاشرے ہی کے حوالے سے ہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعے ''سفر روشنی کا'' میں روایت کا سلسلہ زیادہ قوی تھا لیکن ''چراغِ حرف'' میں اپنی ذات کا اظہار اور گردوپیش کا شعور زیادہ بڑھ گیا ہے۔ ''چراغِ حرف'' یقیناً دوسرا بڑا قدم ہے جس کی پذیرائی بڑے شہروں کے نقاد ضرور کریں گے کیونکہ حفیظ شاہد کے کلام میں جدید طرزِ احساس اور عصری شعور بھی ہے اور وہ شعری قوت بھی جو اچھی شاعری کی ضامن ہے۔☆

ہمیں آتا نہیں ہے ہر کسی کے سامنے جھکنا
ہم اہلِ فکر ہیں عاداتِ درباری نہیں رکھتے

☆

حفیظ شاہد کا تیسرا شعری مجموعہ ... مہتابِ غزل

پیش لفظ.... آغا سہیل (لاہور)

حفیظ شاہد اُردو غزل کے معروف، مقبول اور اہم شاعر ہیں۔ اُن کی مقبولیت اور اُن کے کلام کی اہمیت کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ اُن کے مختلف مجموعہ ہائے کلام طبع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ دوسرے یہ کہ خان پور ضلع رحیم یار خان جیسے خطے اور علاقے میں اُنہوں نے اُردو شعر و ادب کی روایتوں اور قدروں کو نہ صرف زندہ اور تابندہ رکھا ہے بلکہ اربابِ ادب کو غزل جیسی صنفِ ادب میں نت نئے اور صحت مند ادبی پس منظر سے اُبھر کر مطلعِ ادب پر نمودار ہوئے ہیں۔ لیکن اُنہوں نے فرسودہ، از کار رفتہ اور کہنہ اقدار کو من و عن قبول نہیں کیا بلکہ معاشرتی، عمرانی اور تاریخی اقدار کا انتہائی بالغ نظری سے جائزہ لے کر اور معروضی تجزیہ کر کے فکری اور نظری اجتہاد کیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے ان معاصر شعراء سے مختلف، منفرد اور وقیع ہیں جو بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے ہوئے ہیں اور

اُنہیں باہر کے ماحول کی کچھ خبر نہیں۔

حفیظ شاہد کا ذہنی اُفق نہایت وسیع، کشادہ اور وسیع الذیل ہے جہاں محض جذبے، خیال اور وجدان کی مجہول، محدود اور مسدود فضا نہیں بلکہ تفکر و تعقل کا ایک کشادہ میدان ہے جس میں انسانی معاشرے کے ارتقاء کے جملہ اسباب وعلل مستقبل کی بشارت دیتے ہیں۔ یعنی وہ نہ تو ماضی سے مطلقاً ناتہ توڑتے ہیں نہ حال سے بے خبر ہیں اور نہ مستقبل کی تعمیر اور تشکیل سے غافل ہیں۔ ماضی کی صحت مند روایات کو حال تک پہنچنے میں معاون ہوتے ہیں اور مستقبل کی نسل تک ان روایات اور اقدار کو منتقل کرنے میں مخلص ہیں۔ مثلاً اگر انہیں یہ معلوم ہے کہ کوئی زرعی معیشت جب تک صنعتی معیشت میں تبدیل نہ ہو جائے معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔ گویا ترقی کی اصل اساس اور بنیاد سے کوئی مفکر صرفِ نظر کرتا ہے تو وہ خواہ ترقی کا کیسا ہی اڈعا رکھتا ہو وہ اصل میں ترقی معکوس پر عمل پیرا ہے چنانچہ معاشرتی، تاریخی، عمرانی، ثقافتی اور تہذیبی دوائر جن سے ادب اور تخلیقی ادب کا گہرا تعلق ہے اسی بنیادی نظریے کے تحت آتے ہیں۔ حفیظ شاہد انہی معنی میں ترقی پسند شاعر ہیں اور وہ شعراء، ادباء اور تخلیق کار جو اس نظریے کے علی الرغم اپنے کسی مفروضے کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے ہوئے ہیں وہ حقائق محققہ کا بھی اعلان کر رہے ہیں۔ اپنے وجود کی بھی نفی کر رہے ہیں اور مستقبل کی طرف بہنے اور زندہ رہنے والے دھرے سے بھی کٹے ہوئے ہیں اور جنہیں زمانہ بہت جلد حرفِ غلط کی طرح مٹاتا ہوا آگے بڑھ جائے گا۔

مہتابِ غزل معنوی جہت میں اسی اعتبار سے زندہ رہنے والا مجموعہ کلام ہے جس میں صحت مند مستقبل کی بشارت بھی ہے اور روحِ عصر کے حوالے سے موجود زمانے کی ترجمانی بھی ہے جسے دوسرے لفظوں میں عصری حسیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

خود شناسی خدا شناسی ہے، خود ت راشناس۔ اور یہ کہ انسان اپنے معائب کو نہیں دیکھتا، دوسروں کی عیب جوئی کرتا ہے، اُسے حفیظ شاہد یوں بیان کرتے ہیں ؎

نظر آتے ہیں عیب اپنے
ہمارا دیکھنا کیا دیکھنا ہے

یہ میں نے کب کہا ہے اپنے قصرِ زر میں رہنے دو
مجھے شہرِ قناعت کے شکستہ گھر میں رہنے دو

قناعت اور بے نیازی میں جو استغنا ہے اس کے بارے میں کیا خوب کہا ہے۔ ؎

وہ لوگ جو زندگی کا کوئی واضح نصب العین متعین نہیں کر سکے اور ہنوز فکری انتشار میں مبتلا ہیں انہیں کسی روشنی کی ضرورت ہے۔ ؎

ابھی بھٹکے ہوئے کچھ لوگ اپنے گھر نہیں پہنچے
دیا جلتا ہوا کوئی دیار و در میں رہنے دو

عرفیؔ کا استغنیٰ اور انا مشہور ہے۔ ؎

اقبال کرم می گزدار باب ہمم را
ہمت نخورد نیشتر ولا و نعم را

حفیظ شاہد کی اَنا بھی کم نہیں۔ملاحظہ ہو

ہمیں آتا نہیں ہے ہر کسی کے سامنے جھکنا
ہم اہلِ فکر ہیں عاداتِ درباری نہیں رکھتے

کائنات اللہ کی تخلیق ہے لیکن دنیا میں معاشرے کو انسان نے تخلیق کیا ہے اور انسانوں میں استحصالی نظام اور اونچ نیچ بھی اسی استحصالی نظام کے زیرِ اثر معرضِ وجود میں آئی جو انسان اور انسان کے مابین ایک دیوار کی طرح حائل ہے اور یہی وہ دیوار ہے جو تیسری دنیا اور پہلی اور دوسری دنیاؤں میں بسنے والے انسانوں کے مابین حائل ہے۔ ہمارے شاعر کا یقین اور عقیدہ ہے کہ مستقبل قریب میں یہ استحصالی نظام ختم ہو جائے گا اور انسان، انسان سے مصافحہ کر سکے گا۔

جو رکاوٹ بن گئی ہے تیرے میرے درمیاں
ایک دن گر جائے گی دیوار دینا دیکھنا

تیسری دنیا کے نچلے متوسط گھرانوں کے افراد سر پر ایک چھت قائم کرنے کے لیے کن کن مرحلوں سے گزرتے ہیں اور کیا کیا جتن کرتے ہیں۔

بک گیا بیوی کا زیور ذر مکمل ہو گیا
نامکمل جو کبھی تھا گھر مکمل ہو گیا

اسی محرومی کی ایک تصویر یہ بھی ہے۔

چادرِ مہتاب اوپر اور نیچے تھی زمیں
یوں مرافٹ پاتھ پر بستر مکمل ہو گیا

آرزو لکھنوی نے بھی کسی سے خوب خطاب کیا تھا:

مجھے رہنے کو وہ ملا ہے گھر کہ جو آفتوں کی ہے رہگزر
تمہیں خاکساروں کی کیا خبر کبھی نیچے اترے ہو بام سے

تیسری دنیا کے پسماندہ، مقہور اور محروم لوگوں کو حسنِ یار کے احساسِ جمال سے تسکین اور طمانیت کا ایک خوشگوار لمحہ اس طرح میسر آجاتا ہے۔

خوشنما اور کوئی رنگ نگاہوں میں نہیں
جب سے دیکھا ہے ترے عارض و رخسار کا رنگ

غالبؔ نے بھی یوں محسوس کیا تھا:

اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

یہ بحث کچھ نئی نہیں ہے کہ شعر کی شعریت میں متخیلہ کا جوہر یا تو فکری توانائی میں پنہاں ہوتا ہے یا حسّی کیفیت میں۔ ایک تیسری شکل یہ بھی ہے کہ حسیات اور فکر کے امتزاج سے بھی شعریت وجود میں آتی ہے اور اس فکر میں کبھی کبھار کوئی نظریہ یا نظریاتی اشارہ بھی توانائی کا سرچشمہ فراہم کرتا ہے۔ شعریت کو نظم کے پیکر سے صرف غنائی رنگ ملتا ہے جو صرف ایک اضافی وصف ہے۔ حفیظ شاہد بھی اسی وصف کے قائل ہیں۔ وہ شعری لسانیات کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں، معنی اور مفہوم کی اوّلیت کے قائل ہیں۔ بحور و قوافی اور غزلوں کی پامال زمینوں میں تخلیقِ شعر کو وہ محض چبائے نوالے چبانے کے مترادف سمجھتے ہیں۔

چنانچہ اُن کی ایک غزل کے یہ تینوں اشعار اربابِ بصیرت کی توجہ کے طالب ہیں:

چمک چمک کے کرن آفتاب کی مجھ کو
نئی سحر کی کہانی سناتی رہتی ہے
کبھی تو دشت میں ابرِ بہار بھی لاتے
ہوا تو ریت کے بادل اڑاتی رہتی ہے
دیارِ دشت میں شدت کی پیاس بھی شاہد
نئے سراب کی صورت دکھاتی رہتی ہے

اور یہ بھی:

احساس کے مقتل میں ابھی مرثیہ خواں ہوں
کرتے ہیں تقاضا مگر احباب غزل کا

غلامِ خواہشِ دل ہے جہانبانی کا دعویٰ ہے
خبر اپنی نہیں لیکن ہمہ دانی کا دعویٰ ہے
دکھائی دے رہا ہے جس کا دامن خون آلودہ
تعجب ہے اُسے بھی پاک دامانی کا دعویٰ ہے
ہوئی ہے بارشِ سنگِ ملامت شہر میں ہم پر
لبِ احباب پر لیکن گل افشانی کا دعویٰ ہے
حصولِ زر کا جو کل تک مخالف تھا زمانے میں
اُسے بھی آج دولت کی فراوانی کا دعویٰ ہے
اس سے نگاہِ لطف کی خیرات مانگ کر
اپنی انا کی آپ ہی تذلیل ہم نے کی
دل کے چمن کو اپنے لہو سے نکھار کر
اپنی خزاں بہار میں تبدیل ہم نے کی

شاہدؔ تمہیں آئینِ وفا یاد تو ہو گا
سچ کا ہے صلہ دار، محبت کا صلہ رنگ

کاروانِ بشر ہے صدیوں سے
منزلِ ارتقاء کے رستے میں
کیسے کیسے ہیں لوگ سرگرداں
اپنی اپنی اَنا کے رستے میں

کوئی دیوارِ نارسائی ہے
میری طبعِ رسا کے رستے میں

کب تک سنائے گا تو پرانی حکایتیں
برپا جہانِ فکر میں اک انقلاب کو

ہوائے تند بھی جس کو بجھا نہ پائے گی
سرِ دیارِ وفار وہ دیا جلائیں گے
کبھی جو گردشِ حالات نے اجازت دی
تجھی کو تیری کہانی کبھی سنائیں گے
زمیں پہ جو کوئی بستی بسا نہیں سکتے
فلک پہ خاک نئی بستیاں بسائیں گے
کسے خبر تھی بچھاتے تھے پھول جن کے لیے
ہماری راہ میں کانٹے وہی بچھائیں گے
کبھی تو آئے گی وہ شامِ زندگی شاہدؔ
کہ شہرِ دل کے در و بام جگمگائیں گے
نغمۂ آزادیِ انساں تو گا کر دیکھیے
اِس زمیں کا ذرہ ذرہ گوش بر آواز ہے
اس زمیں کی وسعتوں سے ہے ابھی نا آشنا
آسمانوں پر مگر انسان کی پرواز ہے

گاؤں میں جا کر جو دیکھا اپنا آبائی مکان
وہ دریچے، بام و در وہ طاق سب اچھے لگے

میں ترے انصاف کی زنجیر میں جکڑا ہوا
کون سی زنجیر کھینچوں داد خواہی کے لیے

جو صورت سے پرایا لگ رہا ہے
مجھے وہ شخص اچھا لگ رہا ہے
نہیں بھولا تری رخصت کا عالم
ابھی منظر یہ تازہ لگ رہا ہے
کہانی کہہ رہا ہے وہ کسی کی
مجھے اپنا ہی قصہ لگ رہا ہے
نہیں ہے خواہشِ صحرا نوردی
مجھے تو گھر بھی صحرا لگ رہا ہے
ملا ہے جو اس کی نسبت سے شاہد
مجھے وہ غم بھی پیارا لگ رہا ہے

گویا ہر چہ از دوست میرسد نیکوست۔

زنداں میں کس طرح پسِ دیوار دیکھتا
روزن نہیں تھا کوئی بھی دیوارِ سنگ میں
خود کو نثار کس نے کیا ہے بہار پر
شامل لہو کا رنگ ہے پھولوں کے رنگ میں

وہ چہرہ یوں دریچے میں سجا ہے
کہ جیسے پھول گملے میں کھلا ہے
دکھائی تو نہیں دیتا ہے لیکن
مرے اندر کوئی مجھ سا چھپا ہے
میں خود کو دیکھتا ہوں آئینے میں
کہ میرا عکس مجھ کو دیکھتا ہے

(اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں... حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں)

مرے گھر میں ہے سناٹے کا عالم
مگر اک شور سا دل میں بپا ہے

اک وفا کے سفر پہ نکلا تھا
اب ملے گا کہاں پتہ دل کا
لے گیا رونقیں وہ ساتھ اپنے
شہر برباد کر گیا دل کا

نہ پوچھ وسعتِ دل مختصر سے قالب میں
مکان تنگ ہے آنگن مگر کشادہ ہے

شاہدؔ کسی کی اب یہاں پہچان ہی نہیں
شہروں کی بھیڑ بھاڑ میں چہرے بدل گئے

خط تو واپس کر دیے لیکن بطورِ یادگار
اب بھی میرے پاس تیری اک نشانی اور ہے
میں نہیں شاہدؔ کسی زلفِ روایت کا اسیر
میرا لہجہ ہے نیا، رنگِ معانی اَور ہے

تو کس لیے ہے وقت کے تیور سے غمزدہ
رنگِ رخِ حیات بدلنا ہے ایک دن

جدت پسند ہوں نہ روایت پسند ہوں
رکھتا ہوں میں خیال قدیم و جدید کا
اس میں جو ہے سرور کہاں ہے شراب میں
زہرِ غمِ حیات گوارا تو کرکے دیکھ

بموجب ؎

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

آئے نہ کوئی حرفِ شکایت زبان پر
شب بھر میں اپنے ہونٹ سیئے جاگتا رہوں

استفادہ یا توارد:

مرا در دیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم در کشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد
(امیر خسرو)

من ماں راکھوں من جرے کہوں تو مکھ جر جائے
گونگے کا سپنا بھیو سوچ سوچ بورائے
(عبدالرحیم خانخاناں)

لکڑی جل کر کوئلہ بھیو کوئلہ جل بھیو راکھ
میں پاپن ایسی جلی کوئلہ بھیو نہ راکھ
(میرابائی)

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی
(غالب)

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے
(غالب)

اس چمن کے موسمِ گل سے خزاں کے دور تک
کونسا منظر مری چشمِ تماشا میں نہیں

میری طرح تھا وہ بھی سفر کے عذاب میں
منزل پہ میرے ساتھ ہی پہنچا ہے راستہ
شاہد شکست کھائی ہے اپنی ہی ذات سے
میں نے ہی اپنے آپ کا روکا ہے راستہ

سوچتے رہتے ہیں اکثر کنجِ تنہائی میں ہم
ہر کسی سے کٹ گئے تیری شناسائی میں ہم
اب ہے اپنے گھر کا نقشہ بھی ہمیں بھولا ہوا

ایک مدت سے لگے ہیں دشت پیمائی میں ہم
کچھ نہیں رکھتے ہیں اپنے آپ کی پہچان بھی
ہیں ابھی تک مبتلا اک فخرِ آبائی میں ہم
جو بھی ہوگا پیار میں شاہد وہ دیکھا جائے گا
مبتلا کب تک رہیں گے فکرِ رسوائی میں ہم

اک عمر سے حالات کی موجوں میں گھرا ہوں
لگتا ہے مگر آج بھی ساحل پہ کھڑا ہوں
لے جائے ہوا مجھ کو جدھر چاہے اُڑا کر
اک برگ ہوں اور ٹوٹ کے ٹہنی سے گرا ہوں
قبضہ ہے کسی اور کا اب میرے مکاں پر
میں اپنی ہی دیوار کے سائے میں پڑا ہوں
شاہد مجھے کسی موڑ پر لاتی ہے محبت
دنیا سے بھی ناراض ہوں خود سے بھی خفا ہوں

بس اب میں اپنی نگاہِ شوق کے سفر کو اسی مقام پر ختم کرنا چاہتا ہوں ورنہ مجھے خدشہ ہے کہ میں سارا دیوان نقل کرتا چلا جاؤں گا قارئین بھی قندِ مکرر کے طور پر "مہتاب غزل" کی سبک، نرم اور ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی میں بھیگتے رہیں گے اور مجھے کچھ کہنے کی حسرت ہی رہ جائے گی۔ خیر کہنے کو میں جو کچھ کہوں سچ پوچھیے تو کہنے کو میرے پاس کچھ ہے نہیں کہ کلام خود اپنی پہچان ہے اور اچھے شعر کو مدرسے کے نصابی پوسٹ مارٹم سے نقصان ہی پہنچتا ہے۔ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ افلاطون اور ارسطو کے مابین شعر و ادب کی جمالیاتی اور افادی حیثیتوں کی تفہیم میں جو جزوی اختلاف ہے وہ بجائے خود اس لیے اہم ہے کہ کسی نہ کسی عنوان سے یہ بحث آج تک جاری ہے اور اس سلسلے میں ہزار ہا دبستانِ نقد معرضِ وجود میں آتے چلے جا رہے ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ شعر میں جمالیاتی پہلو بھی ضروری ہے اور افادی بھی۔ تخلیقِ شعر میں جمالیات اور افادیت کی تفہیم کے لیے پلیخانوف، لوکاچ اور برگنت کے نظریات اس قدر اہم اور عام ہیں کہ اہلِ علم ان سے بخوبی واقف ہیں۔ مارکسی نقطۂ نظر جو مادی جدلیاتی بحث کا دروازہ کھولتا ہے وہ بھی یہی ہے کہ ہر شے میں ارتقاء کا عمل جاری ہے اور ہر شے بہتر سے بہتر کی طرف رواں دواں ہے۔ چنانچہ حفیظ شاہد بھی اسی فطری ارتقاء کے خود بھی قائل اور فلسفے کی طرف مائل ہیں اور اپنے شعری جوہر کے بین السطور قاری کو یہی پیغام دیتے ہیں۔ ان کا شعر خود بخود اپنی طرف مائل کرتا ہے جو اُن کے احساس جمال پر دال ہے اور اپنی افادیت منواتا ہے۔ یہ اس کا افادی پہلو سے عبارت ہے:

پرانے شہر کے منظر نئے لگنے لگے مجھ کو
ترے آنے سے کچھ ایسی فضائے شہر بدلی ہے

ہزاروں انقلاب آئے ہیں دنیا میں مگر شاہدؔ
نہ وہ بدلا نہ وہ اس کی نگاہِ قہر بدلی ہے

عکسِ جمالِ دوست کا اعجاز دیکھنا
آئینہ بھی ہے عالمِ حیرت میں آج تک

اہلِ سفر کو سائے سے محروم کر دیا
اہلِ ہوس نے راہ کے اشجار بیچ کر
ان کو ہماری فتح و ہزیمت سے کیا غرض
خوش ہیں ہمارے ہاتھ وہ ہتھیار بیچ کر
کس سے گلہ کریں کہ ہمیں رہزنوں کے ہاتھ
خود چل دیئے ہیں قافلہ سالار بیچ کر
ایسے بھی لوگ ہیں کہ جنہیں کچھ نہ ہو ملال
اپنے وطن کے کوچۂ و بازار بیچ کر

منزلِ مقصود پر اب تک نہ پہنچا آدمی
کتنی صدیوں کا سفر ہے اور تنہا آدمی
کیا بتاؤں زندگی کا کھیل کیسا کھیل ہے
آدمی محوِ تماشا ہے تماشا آدمی
کیوں نہ دنیا اک جہنم کی طرح لگنے لگے
جب زمانے میں ہو دشمن آدمی کا آدمی

شہر سے آ کر جو دیکھا اک طویل عرصے کے بعد
گاؤں میں گھر کی بجائے اک کھنڈر موجود ہے
تلاشِ منزلِ زر میں جو گھر سے نکلے تھے
گھرے ہوئے ہیں ابھی تک سراب میں دیکھو

اور یہ کنایہ بھی قابلِ لحاظ ہے:

لہجہ بدل بدل کے نہ کر مجھ سے گفتگو
پہچانتا ہوں رنگ تری بات بات کا

جب آ گیا خیال تری چشمِ مست کا
پھر مے کشی میں دل نہ لگا مے پرست کا

بموجب سوداؔ

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اسی طرح بانٹی ہے کس نے اس نگر میں روشنی
میرے گھر میں ہے اندھیرا تیرے گھر میں روشنی
جب اندھیروں ہی میں ہے ڈوبا ہوا سارا نگر
میں کہاں سے لے کے آؤں اپنے گھر میں روشنی

کچھ تو باقی ہے اثر شاہدؔ اندھیری رات کا
اس قدر مدھم جو ہے میری سحر میں روشنی
چھپر مرا اُڑا کے کہیں دُور لے گئی
اور سر پہ آسماں کی رِدا دے گئی ہوا

دنیا میں اس طرح میں رہائش پذیر ہوں
ٹھہرا ہو جیسے کوئی کسی کے مکان میں

طین (TAINE) تخلیقِ ادب میں روحِ عصر کا وکیل ہے اگرچہ فی زمانہ شکا گو اسکول کے بعض نقادانِ فن صرف شعر یا نظم کے قائل ہیں اور زمان و مکاں اور شاعر کی ذات کو منہا کر کے شعر کی اصل روح تک پہنچنے کو قاری اور نقاد کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ نظریہ بجائے خود مجہول اور گمراہ کن ہے کیونکہ جس طرح کسی شخص کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر کہا جائے کہ بتاؤ روشنی میں رنگ کتنے ہیں اور وہ ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے تو ایسی گم نام شاعری اور بے نام ونشان نظم کے باب میں خامہ فرسائی اور خیال آرائی ماورائی ہوگی۔ یعنی تخلیق کار کی تخلیق اس کی ذات اور زمان و مکان سے پہچانی جاتی ہے۔ جب تک شاعر اور تخلیق کار اپنے ماحول، اپنے وقت، اپنے زمانے کے حصار میں رہ کر سوچے گا کہ وہ خلاء میں کچھ تخلیق نہیں کر سکتا۔ چنانچہ حفیظ شاہد اپنے گردو پیش اپنے ماحول، اپنے وقت، اپنے تاریخی، عمرانی، ثقافتی اور تہذیبی حصار کے اثرات قبول کر کے اپنے درونی نفسیاتی حسیات سے رُجوع ہو کر متخیلہ کو تحریک نہیں دیں گے۔ وہ سچے، صحیح اور دیانت دار فن کار نہیں ہو سکتے۔ حفیظ شاہد کا گاؤں، اُن کا شہر، اُن کا گھر اور اُن کے گردو پیش میں پھیلے ہوئے مناظر اُن کے ذہنی اُفق کی زندہ حقیقتیں ہیں اور ان کی متخیلہ میں فعال اور متحرک ہیں۔ اس لیے فرائڈ کے ساتھ ساتھ ژونگ کے نظریات کے تحت حفیظ شاہد

معاشرتی، عمرانی ماحول اور تاریخ کے ساتھ ساتھ تاریخیت اور روحِ عصر سے خود کو الگ تھلگ رکھ کر شعر نہیں کہہ سکتے اسی کے ساتھ ساتھ نیوراتیت کے انتہا پسند نظریے کا بھی وہ شخص ہرگز قائل نہیں ہوسکتا جو بقیدِ ہوش و حواس زمانی اور مکانی ادراک رکھتا ہو لہٰذا ان کی غزل ایک ترقی پسند اور ہوش مند انسان کی غزل ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ان کا یہ مجموعۂ کلام پہلے مجموعوں سے زیادہ اپنا حلقۂ اثر پیدا کرے گا اور گزشتہ تمام نقوش کے مقابلے میں نقشِ تازہ ہر اعتبار سے دلکش، جاذبِ توجہ اور خوبیوں کا حامل ثابت ہوگا۔

☆

جس شاخ سے نہ آئے میسّر کسی کو پھل
اُس شاخِ بارور سے محبت نہیں ہمیں

حفیظ شاہد کا چوتھا شعری مجموعہ ... "یہ دریا پار کرنا ہے"

تقریظ

شبنم رومانی (کراچی)

حفیظ شاہد کا یہ چوتھا شعری مجموعہ ایک سو تین غزلوں پر مشتمل ہے۔ غزل کی کوئی ایک تعریف ممکن نہیں۔ "بازناں گفتن" بھی نہیں۔ غزل کا برق رفتار، جہاں گرد شعر دو دھاری تلوار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو پھول کی پتی جیسا ایک آبدار مصرع بھی ہیرے کا جگر کاٹ کے رکھ دیتا ہے مگر یہ اعجازِ فن سرکاری اور سیاسی مناسب یا دنیوی اسباب سے حاصل نہیں ہوتا، اس کے لیے میر کی سی درویشی اور غالب کی سی دُور اندیشی چاہیے ۔

تُو، اور آرائشِ خمِ کاکل
میں، اور اندیشہ ہائے دُور دراز

دراصل غزل ہماری اجتماعی سائکی کا مقیاس الحرارت ہے۔ ایک اعتبار سے غزل کا سفر ہماری تہذیب کا سفر ہے۔ یہ فرہاد کا تیشہ ہے جو اپنی ہی رگِ گلو کو کوٹ کر جوئے شیر نکالتا ہے۔ غزل نے دَور بہ دَور جنوں کی حکایاتِ خونچکاں لکھی ہیں اور فکری و حسی تجربات و تغیرات کی نشان دہی بھرپور انداز سے کی ہے۔ اگر ہمارے سامنے ہماری تاریخ نہ بھی ہو۔ تب بھی صرف غزل کے تجزیاتی مطالعے سے ہم اپنے سیاسی اور سماجی اتار چڑھاؤ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاسکتا ہے کہ غزل مبتدی کا اُوزار بھی ہے اور منتہی کا آزار بھی۔ یہ کسی کے لیے محض "صریرِ خامہ" ہے تو کسی کے لیے "نوائے سروش"...... اس "صریرِ خامہ" اور "نوائے سروش" کے درمیان بہت سی نئی پرانی آوازیں اپنی اپنی گونج میں اپنا تشخص تلاش کرتی رہتی ہیں:

مجھے کچھ بھی نہیں حاصل ہوا اونچی اڑانوں سے
قدم اپنے زمیں پر اب جما کر دیکھ لیتا ہوں

نہ جانے اس میں پوشیدہ ہیں اس کی حکمتیں کیا کیا
ہمیشہ گردشوں میں یہ زمین و آسمان رکھنا

آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری میں زمین کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔ زمین کی گردشوں ہی سے زندگی متحرک اور ارتقاء پذیر ہوتی ہے۔ اسی سے عمل اور ردِ عمل، کشش اور ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ ویسے تو حفیظ شاہد کا لہجہ دھیما اور آہنگ نرم ہے لیکن کہیں کہیں لَے تیز ہوگئی ہے یا پیرایۂ اظہار میں شدت پیدا ہوگئی ہے تو وہ منفی عمل کے خلاف فطری ردِ عمل ہے۔

دنیا ہمارے قتل کو کہتی ہے خودکشی
مرنے کے بعد بھی ہمیں رُسوا کیا گیا

وہی ہے بھوک اہلِ زر کی، لیکن لوگ کہتے ہیں
بھرا ہو پیٹ تو کوئی غذا اچھی نہیں لگتی

یہ لہجہ زہرناک ضرور ہے مگر سفاکی کو گرفت میں لینے کے لیے درّا کی بھی ضرورت ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے ہمارے ادبی سماج میں ''احتجاجی'' اور ''مزاحمتی'' شاعری کا بہت شور ہے۔ بہت سے مشاہیر بھی اپنا نام رجسٹر کرانے کے لیے قطار میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ بہتوں نے اپنے نام نہاد احتجاجی یا مزاحمتی مصرعوں یا سطروں کو اچھے داموں CASH بھی کروالیا ہے...... یوں تو ہم بھی ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد سے اب تک شاعری کرتے رہے ہیں۔ ہمارا ''جزیرہ'' ایسی نظموں اور غزلوں سے بھرا پڑا ہے لیکن قیمت حرف وصول کرنے والے لوگ کاروباری ہوتے ہیں اور یہ شیوۂ اہلِ دل نہیں ہے:

بھیڑ میں گم ہو جانے سے مر جانا بہتر ہے
میں کیوں نام لکھاؤں تیرے چاہنے والوں میں

کچھ یہی کیفیت بعض دوسرے ضمیر دار اہلِ قلم کی ہے جن میں ہمارے عہد کا ایک جواں ہمت شاعر حفیظ شاہد بھی شامل ہے۔ ''احتجاج'' اس کی شاعری کا بھی ایک نمایاں وصف ہے۔ ویسے شاعری تو ہوتی ہی احتجاجی ہے، چاہے وہ محبوب کے مظالم کے خلاف ہو یا اسٹیبلشمنٹ کے جبر کے خلاف۔ یہ احتجاج، بہر رنگ اور بہر زماں، از آدم تا ایندم جاری ہے اور جاری رہے گا۔ حفیظ کی یہ کتابِ غزل بھی اسی روّیے کا تسلسل ہے۔ یہ آپ بیتی بھی ہے۔ ملک بیتی بھی اور شہر بیتی بھی۔ اس کی وطنیت میں ہجرت کا کرب بھی ہے اور اس سے حاصل ہونے والے زیاں کا شدید احساس بھی، جو نسلوں کا مسئلہ ہے:

جس شاخ سے نہ آئے میسر کسی کو پھل
اس شاخِ باروَر سے محبت نہیں ہمیں

جو بُخل سے کیا ہے اکٹھا تمام عمر
تیرا نہیں ہے، وہ ترے بیٹوں کا مال ہے

جسے پسند آئے گا، وہ توڑ لے گا شاخ سے
امان اپنے باغ میں، گلاب کے لیے نہیں

کیسے کیسے لوگ بے چہرے ہوئے
اہلِ زر کے ہاتھ چہرے بیچ کر

پہلے تو سازشوں سے ہمیں دی گئی شکست
پھر خوب اس شکست کا چرچا کیا گیا
کیا کرو گے جب کبھی شہرِ تمنا میں تمہیں
ہم سے بے آباد لوگوں کو بسانا پڑ گیا
دیکھنا اہلِ چمن شاہد بلائیں گے ہمیں
جب چمن کو بادِ صَرصَر سے بچانا پڑ گیا
اک شخص کے لیے مری بستی کا راستہ
کچے مکاں گرا کے کشادہ کیا گیا

مگر یہ حفیظ شاہد کی شاعری کا صرف ایک پہلو ہے ورنہ اس کتاب میں جہاں جہاں زندگی کی پہلو داری کے ساتھ ساتھ اظہار کی تہ داری بھی نظر آتی ہے جو اس امر کی گواہِ صادق ہے کہ

ع راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں

تازہ مضمون کا ذکر چھڑا ہے تو ان تازہ کار اشعار پر بھی نظر ڈال لی جائے۔

اَجل اور زندگی کی دوستی اک حرفِ باطل ہے
بہت دشوار ہے پانی پہ بنیادِ مکاں رکھنا

ہوا ہے تند تو بھی جا کے سو جا
درختوں پر پرندے سو رہے ہیں

نہ ہم دیکھ پائے نہیں رات بھر
کئی خواب ایسے پسِ خواب تھے

اندھیری رات کی تاریکیوں سے
چراغِ چشمِ تر کچھ کہہ رہا ہے

ٹھہر جا رہرو راہِ محبت
یہ سنگِ رہگور کچھ کہہ رہا ہے

رہ روِراہِ محبت کو، ایک ذرا ٹھہر کر، سنگِ رہگور کی بات سننے کا جو مشورہ حفیظ شاہد نے دیا ہے وہ زندگی کا اثبات ہے اور اقدارِ حیات کا اثبات بھی۔ شعر کہنا زندگی ہی کو لکھنا ہے...... اپنی زندگی کو بھی، اپنوں کی زندگی کو بھی اور غیروں کی زندگی کو بھی...... یہ متاثر ہونے اور متاثر کرنے کا عمل ہے مگر متاثر ہونے کے لیے احساس کی شدت اور متاثر کرنے کے لیے اظہار کی قوت شرط ہے:

جلتا ہوا چراغ اگر ہے مرا وجود
پھر اپنے دل کے طاق میں جلنے تو دے مجھے

ہمیں بخشی ہے نرمی موسموں نے
مگر کچھ لوگ پتھر بن گئے ہیں

مہ و خورشید تو کچھ بھی نہیں ہیں
مری مٹی کا اِک ذرہ ہے جو کچھ

یہ لفاظی نہیں حقیقتِ حال ہے کہ اپنی مٹی کا ایک بے مقدار ذرہ بھی تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزر کر، اور بے وقعتی کی انتہاؤں کو چھو کر، ایٹم بم سے بھی کہیں زیادہ تباہ کن صورت اختیار کر سکتا ہے۔ ہمارے معاشرے کے اطراف و جوانب اور معاشرے کے حوالے سے، ہمارے ادب کے تمام سیاق و سباق بھی، نیوکلیئر تجربات کے نتائج سے کچھ زیادہ بے بنیاد نہیں ہیں۔ دیوان پر دیوان لکھنے والے متقدمین، متوسطین، متاخرین اور عہدِ حاضر کے وہ اَن گنت شعراء کہاں ہیں، کبھی جن کے نام کا ڈنکا بجتا تھا مگر اب کوئی ان کا نام تک نہیں جانتا جب کہ ایک شعر، بلکہ ایک مصرعے کے خالق ہمارے حافظوں میں اور ہماری تحریروں میں نہ صرف زندہ ہیں بلکہ ان کی مزید زندگی کے آثار بھی بعض محققین کی توجہ کے سبب پیدا ہو چلے ہیں۔ جہاں تک اُردو ادب کے عصری مسائل کا تعلق ہے اس کا ٹھیکا نہ سکہ بند ناقدین نے لے رکھا ہے۔ بعض اہلِ نقد ''معیار'' کو اہمیت دیتے ہیں تو بعض ''مقدار'' کو اور بعض ناقدینِ معیار اور مقدار دونوں پر ایک ساتھ اصرار کرتے ہیں اور اس بنیاد پر۔ جوش اور جگر جیسی لیجنڈ شخصیات کو بھی یہ یک جنبشِ قلم رَد کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے، اور یہ بھی نہیں سوچتے کہ ہمایوں، تاثیر، اصغر، فانی، یگانہ (اور شکیب جلالی) پر کتنے دواوین کا بوجھ ہے؟

خوشی کی بات ہے کہ حفیظ شاہد کے ہاں معیار اور مقدار دونوں مطالبے پورے کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ اب تک اس کے تین شعری مجموعے آ چکے ہیں۔ یہ اس کی چوتھی کتابِ غزل ہے جو اس کے سابقہ مجموعوں سے زیادہ پرکشش اور پر خیال ہے۔ بے قدری، بے جہتی اور بے چہرگی کی اس عمومی فضا میں اَقدار کی یہ پاسداری اور روایت کی یہ تازہ کاری قابلِ قدر ہے۔ حفیظ اپنے روشن یقیں کی روشنائی سے زندگی کو لکھ رہا ہے۔ مگر یہ زندگی

ویسی ہے نہیں، جیسی نظر آتی ہے۔ اس کو دیکھنے کی طرح دیکھنے کے لیے آنکھیں چاہئیں۔ یہ ایک طبعی بلکہ سائنسی حقیقت ہے کہ ہر فرد کا، اچھا یا بُرا، اپنا ایک اندازِ نظر ہوتا ہے جو اسے دوسروں سے ممیز کرتا ہے۔ سو حفیظ کی یہ غزلیہ شاعری بھی صاف بتاتی ہے کہ اس کے دیکھنے، سوچنے اور لکھنے کا اپنا ایک ڈھنگ ہے جس کا خمیر تو روایت سے اُٹھا ہے مگر جس کا ضمیر اَرض وسما سے مکالمے کا آرزو مند ہے...... ہر چند کہ یہ ''حسرتِ بے جا'' نہیں ہے لیکن قبل از وقت ضرور ہے۔ حفیظ کو ابھی علم وحلم اور فکر ونظر کے کئی ہفت خواں طے کرنے ہیں۔ پھر بھی اتنی عمر میں اتنا کچھ حاصل کر لینا بھی کچھ آسان نہیں ہے۔ اور میں خان پور کے اس حوصلہ مند اور رجائیت پسند شاعر کے اس خیال سے پوری طرح متفق ہوں ۔

شکستہ دل کی کشتی ہو کہ ہو طوفاں حوادث کا
ہمیں ہر حال میں غم کا یہ دریا پار کرنا ہے
گم کہیں نہ ہو جانا شہر کے جھمیلوں میں
میں کہاں کہاں تم کو بھیڑ میں صدا دوں گا

☆

حفیظ شاہد کا پانچواں شعری مجموعہ
''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی''
پیش لفظ
سہیل اختر (بہاول پور)

اب یہ بحث بہت پرانی ہو چکی ہے کہ غزل کیا تھی، اس کے لغوی و اصطلاحی معانی کیا تھے اور اس نے انداز و اُسلوب اور افکار و خیالات کا کس قدر اور کتنا سفر طے کیا اور آج اس کی شکل کیا ہو گئی ہے؟ یا یوں کہیے:

ع...... کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی جاتی

ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جنہوں نے خانپور جیسے صحرائی اور بے آب وگیاہ علاقے کے باسی حفیظ شاہد کی شاعری کو وہ عظمت اور وہ تمکنت بخشی ہے کہ ملک کے نامور نقادوں نے اپنے مختصر فلیپوں اور طویل دیباچوں میں اُنھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے بڑی مسرت محسوس کی ہے۔ ان کے شعری مجموعے بڑے اہتمام سے شائع ہوئے ہیں۔

حفیظ شاہد کا پہلا شعری مجموعہ ''سفر روشنی کا'' (۱۹۸۳ء اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۹ء) کے فلیپ پر جیلانی کامران لکھتے ہیں کہ: ''حفیظ شاہد کی غزل ایک منفرد لہجے کی خبر دیتی ہے اور ایسے منفرد لہجے کے ساتھ ہمیں ایک ایسا انسان گزرتا اور سفر کرتا دکھائی دیتا ہے جو نا ساز گار زمانے کے فراز ونشیب میں اور اک زمانہ کی طلب کرتا ہے۔''

عبادت بریلوی کا کہنا ہے کہ: ''حفیظ شاہد نہایت خاموشی سے غزل کو باعتبار مضامین وسیع کرنے کا کام سر انجام دے رہے ہیں۔ ان کی غزل میں تجربوں کی رنگارنگی ہے جس کو اُنہوں نے نئے احساس اور جذبے سے ہم آہنگ کر کے کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ جدید دَور کے ہر فرد کو اپنے تجربات معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً:

مری نظر میں ہیں کچے گھروں کی دیواریں
نہ اُٹھ سکیں گے مرے ہاتھ بارشوں کے لیے

نہ ہم دیکھ پائے نہیں رات بھر
کاش تم ان کے کبھی ٹوٹے ہوئے پَر دیکھتے

عارف عبدالمتین یوں اظہار خیال کرتے ہیں: ''جہاں تک عہدِ جدید کی حیاتِ نو سے کشید کیے ہوئے موضوعاتِ نو کی تازہ کاری کا تعلق ہے، حفیظ شاہد نے ہر لحظہ بدلتی ہوئی زندگی کے نت نئے روّیوں کا مطالعہ ایک باریک بین شاہد کی طرح کیا ہے:

گم کہیں نہ ہو جانا شہر کے جھمیلوں میں
گم کہیں نہ ہو جانا شہر کے جھمیلوں میں

عقبی فلیپ پر حفیظ الرحمٰن احسن یوں رقم طراز ہیں کہ: ''حفیظ شاہد ان مخلصینِ غزل میں سے ہیں جو ربع صدی سے زائد عرصے سے کشتِ سخن کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کر رہے ہیں...... غزل کے ساتھ اُن کی اس غیر متزلزل اور وفادارانہ وابستگی نے اُن کو یہ مقام بخشا ہے کہ اب ان کو پورے اعتماد کے ساتھ اقلیمِ غزل کا اوّل درجے کا شہری قرار دیا جاسکتا ہے۔''

''چراغِ حرف'' کا سنِ اشاعت ۱۹۸۹ء ہے۔ اس کا مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی اور عقبی فلیپ یزدانی جالندھری نے تحریر کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ: ''حفیظ شاہد کے کلام میں سب سے زیادہ قدروں کے ٹوٹنے کا احساس ہے، محبت کی جنسِ نایاب کو وہ دل کے کونوں کھدروں سے نکالتا ہے، دل کی روشنی سے منظر کو آباد کرنے کی کوشش کرتا ہے اور شہر کے اجنبی راستوں میں اپنے ہی شہر کے باسیوں کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔''

فلیپ نگار یزدانی جالندھری رقم طراز ہیں کہ: ''ادبی فضا سے دور افتادہ خانپور جیسے شہر میں جن دو ہستیوں نے شعر و ادب کا پرچم بلند کیا ہے ان میں ایک نمایاں بلکہ نمائندہ نام حفیظ شاہد کا ہے۔ ''سفرِ روشنی کا'' سے ''چراغِ حرف'' تک اس نے فکر و فن کی نور پاش قندیلیں روشن کی ہیں۔''

''مہتابِ غزل'' ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ دیباچہ آغا سہیل نے لکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مہتابِ غزل معنوی جہت میں اس اعتبار سے زندہ رہنے والا مجموعہ کلام ہے جس میں صحت مند مستقبل کی بشارت بھی ہے اور روحِ عصر کے حوالے سے موجود زمانے کی ترجمانی بھی ہے جسے دوسرے لفظوں میں عصری حسیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے...... قناعت اور بے نیازی میں جو استغنا ہے اس کے بارے میں حفیظ شاہد کیا خوب کہتے ہیں:

یہ میں نے کب کہا ہے اپنے قصرِ زر میں رہنے دو
مجھے شہرِ قناعت کے شکستہ گھر میں رہنے دو

مارکسی نقطۂ نظر جو مادی جدلیاتی بحث کا دروازہ کھولتا ہے۔ وہ بھی یہی ہے کہ ہر شے میں ارتقاء کا عمل جاری ہے اور ہر شے بہتر سے بہتر کی طرف رواں دواں ہے۔ چنانچہ حفیظ شاہد بھی اس فطری ارتقاء کے خود بھی قائل اور اس فلسفے کی طرف مائل ہیں اور اپنے شعری جوہر کے بین السطور قاری کو یہی پیغام دیتے ہیں۔ ان کا شعر خود بخود

اپنی طرف مائل کرتا ہے جوان کے احساسِ جمال پر دال ہے۔

پرانے شہر کے منظر نئے لگنے لگے مجھ کو
ترے آنے سے کچھ ایسی فضائے شہر بدلی ہے

حفیظ شاہد کے چوتھے مجموعے "دریا پار کرنا ہے" (۱۹۹۹ء) کے دیباچے میں شبنم رومانی رقمطراز ہیں:
"آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری میں زمین کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔ زمین کی گردشوں سے ہی زندگی متحرک اور ارتقا پذیر ہے۔ اسی سے عمل اور ردِ عمل، کشش اور ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ ویسے تو حفیظ شاہد کا لہجہ دھیما اور آہنگ نرم ہے لیکن کہیں کہیں لے تیز ہوگئی ہے یا پیرایہ اظہار میں شدت پیدا ہوگئی ہے تو وہ منفی عمل کے خلاف فطری ردِ عمل ہے:

دنیا ہمارے قتل کو کہتی ہے خودکشی
مرنے کے بعد بھی ہمیں رُسوا کیا گیا
وہی ہے بھوک اہلِ زر کی لیکن لوگ کہتے ہیں
بھرا ہو پیٹ تو کوئی غذا اچھی نہیں لگتی

اب آیئے ان عوامل کی طرف جن کے بارے میں درج بالا سطور میں ذکر کیا گیا ہے۔ تقسیمِ ہند سے چند سال پہلے حفیظ کے والدین جالندھر سے ترکِ سکونت کر کے لاہور آ مقیم ہوئے۔ پاکستان بننے سے چار سال پہلے حفیظ کے والد انتقال کر گئے۔ یہ دَور حفیظ شاہد کی اوائل عمری کا دَور تھا۔ لاہور میں تعلیمی مدارج طے کرنے کے بعد وہ حبیب بینک لمیٹڈ میں ملازم ہو گئے۔ شعر و ادب کا شوق بچپن ہی سے ان کی طبیعت کا حصہ رہا ہے۔ لاہور میں معاش کے ہنگاموں سے جو فرصت ملتی اُسے جوانی مستانی کے چکر میں اِدھر اُدھر ضائع کرنے کی بجائے فنِ شاعری سیکھنے اور اپنے ذوق کی تسکین کرنے میں صَرف کرتے۔ لاہور میں انہیں اُس دَور کے مقبول و معروف شعرائے کرام کی صحبت میسر رہی۔ حفیظ شاہد حبیب بینک لمیٹڈ میں ملازم تھے اور چھٹی کے بعد سیدھے معروف و مقبول شاعر شاعر طفیل ہوشیار پوری کے ادبی ماہنامے "محفل" کے دفتر چلے جاتے۔ وہاں خوش قسمتی سے اُن کی شامیں طفیل ہوشیار پوری کے علاوہ شرقی بن شائق، رشید کامل، ایف ڈی گوہر، یزدانی جالندھری اور ارمان عثمانی جیسے اساتذۂ فن کی صحبت میں گزرتیں، محفلیں جمتیں، ادبی لطیفوں کی رنگینیاں بکھرتیں، ایک دوسرے کو تازہ کلام سنایا جاتا۔ مصرعہ ہائے طرح دیئے جاتے۔ ان پر طبع آزمائی ہوتی۔ اشعار اور غزلیں کہی جاتیں جو اس وقت کے معروف اور مقبول رسائل مثلاً "محفل"، "قندیل"، "اقدام"، "بیسویں دہلی"، "شمع دہلی" وغیرہ میں شائع ہوتیں۔ اہلِ محفل میں بیشتر اُس وقت کے اُستاد، بزرگ، کہنہ مشق اور پر گو شاعر شامل تھے۔ اور ایک سے بڑھ کر ایک قد آور شخصیت کا مالک تھا۔ یوں ان کی قربت میں حفیظ شاہد کو فنِ سخن میں مشق و ریاضت کے ایسے مواقع ہاتھ آئے جو عام طور پر ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتے۔

طفیل ہوشیار پوری ایک مترنم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ باکمال فلمی گیت نگار بھی تھے اور یہ فن ہر کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسی باعث ہمارے ملک میں فلمی گیت نگاروں کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ انھی

معدودے چند گیت نگاروں میں حفیظ شاہد بھی شامل ہیں جنہیں طفیل ہوشیار پوری کی صحبت میں رہ کر اس فن کے اسرار و رموز کا شعور حاصل ہوا۔ لاہور کے اپنے مختلف قیام میں حفیظ شاہد نے دو سال تک وہاں کے نگار خانوں میں کام کیا اور دو فلموں کے گانے لکھے۔ لیکن ہمارے ملک میں فلموں کو تکمیل کے مراحل تک پہنچنے میں ہزار طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بعض فلمیں تو تکمیل تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ دیتی ہیں۔ ایسا ہی ایک بار ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ ایک فلم کے لیے دو گیت جن کے بول درج ذیل لکھے لیکن فلم کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی:

1: پائل کی جھنکار پہ دیکھو جسم تھرکتا جائے۔ 2: بہار بن کے مری زندگی پہ چھارہے ہو تم

ایسا ہی حفیظ شاہد کے ساتھ ہوا۔ ان سے دو پنجابی فلموں کے لیے گیت لکھوائے گئے تھے۔ ایک فلم تھی ''بلبل پنجرے دی''۔ اس فلم کے میوزک کے ڈائریکٹر رحمان ورما تھے۔ اس کے چار گیت ریکارڈ ہوئے تھے جو میڈم نور جہاں، مالا، مسعود رانا، نسیم بیگم اور تصور خانم نے گائے تھے لیکن یہ فلم تکمیل کے مراحل طے نہ کر سکی۔ دوسری بھی پنجابی فلم تھی۔ نام تھا ''چھڈ برے دی یاری'' اس فلم میں حفیظ شاہد کے دو گیت شامل تھے۔ موسیقار مشتاق علی تھے اور ہدایتکار تھے اے ریاض۔ یہ فلم کافی مقبول ہوئی۔ حفیظ شاہد کا لکھا ہوا اس کا تھیم سانگ جو رجب علی کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا ہٹ ہوا۔ بول تھے:

اپنے ای پیاریاں دا پیار لٹ لیندے نیں... کدی کدی یاراں تو وی یار لٹ لیندے نیں

اور پھر ۱۹۷۶ء میں حفیظ شاہد کے مستقل طور پر لاہور سے خان پور منتقل ہونے کے بعد فلمی گیت نگاری کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مشاہیر کے تاثرات اس اُمر کے شاہد ہیں کہ حفیظ شاہد کی ہر ادبی کاوش خواہ وہ اُن کی غزلیہ شاعری، بدیہہ گوئی اور فلمی شاعری ہو یا تاریخ گوئی، اُن کی ٹھوس مہارت اور عظمتِ فن کی دلیل ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حفیظ شاہد نے شہرت حاصل کی لیکن اس کے حصول میں بیساکھیوں کا سہارا نہیں لیا۔ وہ کسی انجمن تحسین باہمی کے رُکن نہیں بنے۔ ایسے رُکن جو نہ صرف ہر وقت کورس میں یہ گاتے سنائی دیتے ہیں کہ ''من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو''۔ بلکہ آپ میں ایک دوسرے کو ملک کے سب سے بڑے شاعر اور ہندو پاک کے سب سے بڑے ادیب کا درجہ دیتے نہیں تھکتے۔ حفیظ شاہد نے خود ساختہ سکینڈلوں کے ذریعے نام و نمود حاصل کرنے کا بھونڈا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ وہ شعری محفلوں میں کم تر درجے اور احساسِ کمتری میں مبتلا نوجوان شعرا کی طرح اپنے ستائش گر ساتھ نہیں لے جاتے جو مشاعروں کی تہذیبی روایات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے داد کے شور و غل کے باعث آسمان سر پر اُٹھالیں اور پہلے سے طے کردہ حکمت عملی کے تحت غزلوں کی فرمائشوں پر فرمائشیں کر کے مشاعروں میں اُن کی اہمیت جتانے کی کوشش کریں۔ ایسے ستائش گر اپنے ممدوح کے اشعار پر داد کے ڈونگرے کچھ ایسے زور و شعور سے برساتے ہیں گویا کوئی پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو، یا پھر بعض شعرا اپنے کلام کو نکھار دینے کے لیے ترنم کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن اس طرح سے ان کا قد لمبا نہیں ہو سکتا بلکہ ایک طرح سے ان کے سائے لمبے ہو جاتے ہیں اور ایک انگریزی مقالے کے بموجب 'When shadows become longer that is Evening.'' (یعنی جب سائے لمبے ہو جائیں تو ڈھلتی شام اور مایوسی کا اندھیرا ان سایوں کا مقدر بن جاتا ہے) ان سب کے برعکس حفیظ شاہد نے صرف اور صرف میرٹ پر اپنی خاموشی، شرافت، سنجیدگی،

شائستگی، آہستگی اور خوش خرامی سے شاعری کی گل رنگ منزلیں طے کی ہیں اور آج ان کا شمار اُردو کے معروف اور نامور غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ حفیظ شاہد کی شاعری کا ایک اور پہلو تاریخ گوئی ہے جسے انہوں نے اساتذہ کی صحبت میں حاصل کیا۔ یہ صنعتِ تاریخ کا فن کس قدر نایاب اور کس قدر مشکل ہے اس کا اندازہ وہی تاریخ گو لگا سکتے ہیں جو اس بحرِ بیکراں کے شناور ہیں۔ تاریخ گوئی میں کسی خاص واقعے پر نثر میں یا پھر قطعہ کہہ کر اور آخری مصرعے یا شعر سے ابجد کے حساب سے اس کی تاریخ نکالی جاتی ہے۔ اس طرح اہم تاریخیں ان سطروں، مصروں یا شعروں کے توسط سے ذہنوں میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ فن بہت پرانا ہے لیکن آج تک اس کو برتنے اور اس میں نام پیدا کرنے والے صرف چند ہی شاعر مشہور ہیں مثلاً غالب، مومن، داغ دہلوی، شمیم متھراوی، رئیس امروہوی، علامہ قابل گلاؤٹھوی، صبا اکبر آبادی، محشر بدیوانی اور نیساں اکبر آبادی وغیرہ۔ مثلاً غالب نے اپنی تاریخ وفات خود کہی:

غالب مرد:

لیکن موت کا فرشتہ دو سال بعد آیا تو ان کے کسی دوست نے مادہ تاریخ کو یوں حسب حال کر دیا:

غالب بمرد ۱۸۶۹ء

مومن کہیں گر پڑے اور انہیں چوٹیں آئیں تو انہوں نے خود مصرع کہا:

دست و بازو بشکست

داغ دہلوی نے مولوی عبدالرحمٰن راسخ دہلوی کے درمیان کی تاریخ طباعت یوں نکالی:

کہی ہے داغ نے تاریخِ اتمام

کلام مولوی راسخ ہے نادر ۱۳۱۴ھ

بہاولپور میں ایک اہم تاریخ گو شاعر قاضی محمد لئیق محوی عثمانی تھے جن کی کہی ہوئی تاریخوں پر مشتمل ایک پوری کتاب موجود ہے۔ قاضی صاحب مرحوم اور اُردو اور فارسی کے اپنی طرز کے منفرد شاعر تھے۔ ان کے بعد محمد حسن خاں میرانی نوشاہی ہیں جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ گو وہ بہت بڑے شاعر نہیں تھے لیکن تاریخی مصرعے خوب نکالتے تھے۔ مثلاً انہوں نے حضرت شاہ محمد پیر بخاری صابری کی وفات پر یہ مصرع کہا:

''صابری بیٹھے ہیں جنت میں'' کہو ۱۳۲۸ھ

بر وفات بابا محمد سلیمان صابری: ندا محمد کو ہاتف نے دی یہ حسن

کہ ''باغ جناں میں سلیمان آئے'' ۱۴۰۹ھ

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ قاضی محوی عثمانی نہ صرف اُردو اور فارسی کے پختہ مشق شاعر تھے بلکہ تاریخ گوئی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ یہاں محوی عثمانی کی چند تاریخوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ انہوں نے اپنے فرزند قاضی محمد شاہد کی زوجہ مرحومہ کی تاریخ وفات یوں نکالی:

چوں قضائے قیدِ ہستی برہم و ناساز کرد

جانب دیسِ ارم شاہیں رخ پرواز کرد

۱۹۷۷ء

بہاولپور کا فانوس سینما ان کی ذاتی ملکیت تھا۔ جب اس کی تعمیر و مرمت کا کام مکمل ہو گیا تو انہوں نے بہت سے قطعہ ہائے تاریخ کہے جن میں سے دو درج ذیل ہیں:

یادگار خوب ایں تشکیل شد
خوب شد فانوس نو تکمیل شد

۱۹۶۹ء

اسی طرح انہوں نے تابش دہلوی کے مجموعی کلام "غبارِ انجم" کی تاریخ یوں کہی۔

برتراز خاکِ شفا کار "غبارِ انجم"
غازۂ عارضِ اخیار "غبارِ انجم"
دیدم آں طرفہ نکالتے کہ ندیدم گاہے
فائحۂ سرمہ ابصار "غبارِ انجم"

۱۹۸۲ء

احسان دانش، جوش اور فراق کا ایک ہی سال میں انتقال ہوا تھا محوی عثمانی نے کہا:

قطعہ رحلت بنائے دانش و جوش و فراق

۱۹۸۲ء

محمد اظہار الحسن کی وفات پر کہا:

یک ہزار ونہ صدو ہفتا دو یک

۱۹۷۱ء

جو تاریخ گوئی کے فن میں بھی ادراک رکھتی ہیں۔ حال ہی میں ان کا خوبصورت مجموعہ کلام "نشاطِ ہجر" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں رفتگاں کی یاد میں چند ایک تاریخیں ملاحظہ فرمایئے۔ ان کے کہنے ہوئے اکثر مادۂ تاریخ بڑے کامل ہوتے ہیں اور ان میں بیساختگی، دلکشی اور سادگی کا پہلو خاصا نمایاں ہے:

میرے والد: احترامِ آدمیت کے نقیب "ہائے غربت آشنا" برکت علی ۱۹۷۰ء

میری ماں تو رہر مشکل میں اب بھی دستگیر
"خوبصورت جو سیرت" میری ماں

۱۹۸۷ء

باجی صغیرہ: بہناپے میں ممتاز کی خو
"خواب ہوئیں اب آہ صغیرہ"

۱۹۹۳ء

بھائی مصطفیٰ چوں از دارِ فنا سوئے بقا رفت

بگوا'' وائے غلام مصطفی رفت''

۱۹۹۷ء

بھائی جان — بھابھی رخصت ہوگئیں پچھلے برس
''خوش خرام و نیک نام اب بھائی جان''

۲۰۰۰ء

اور اب ذیل میں حفیظ شاہد کی کہی ہوئی چند ایک تاریخیں اشعار کی صورت میں پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ اشعار اُن کے طویل قطعات سے لیے گئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہو جائے گا کہ ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' کے خالق فنِ تاریخ گوئی میں کس قدر تخلیقی مہارت اور کیسے کیسے دلکش مصرعے اور قطعات کہنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حفیظ کے کہے ہوئے مادہ ہائے تاریخ زیادہ تر تدخلہ یا تخرجہ کی ذیل میں آتے ہیں یعنی تاریخ پوری کرنے کے لیے اعداد میں کوئی عدد جمع یا خارج کرنا پڑتا ہے یا کچھ کمی بیشی کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً:

بروفات جوش ملیح آبادی: — دل سے شاہد یہ کہو سال وفات

۳۴

ہو گیا رخصت شہِ اقلیمِ فن

۱۹۸۲ء = ۳۴ + ۱۹۸۰

بروفات فیض احمد فیض — کہا دل نے جو روئے درد دیکھا

۴

امامِ شاعری رخصت ہوا

۱۹۸۴ء = ۴ + ۱۹۸۰

بروفات رئیس امروہوی: — بے وقت رحلت پر تری، تاریخ شاہد نے کہی
''ویراں ہے اب شہرِ ادب، سید رئیس امروہوی''

۱۴۰۹ھ

بروفات صبا اکبر آبادی: — شاہد، صبا کی رحلتِ پرغم کا سال بھی
اس کی کتابِ شعر ''چراغِ بہار'' ہے

۱۴۱۲ھ

بروفات یزدانی جالندھری:

جب ہو گیا وہ رخصت، نکلا یہ سالِ رحلت

۱۱

اک بے مثال شاعر دنیا سے چل بسا ہے

۱۴۲۱ھ (-) ۱۱ = ۱۴۱۰

بروفاتِ طفیل ہوشیار پوری:

شاہد کہو یہ از سرِ افسوس سالِ فوت
اک صدمۂ عظیم ہے رحلتِ طفیل کی
۱۹۹۳ء=۱+۱۹۹۲

بروفات عارف عبدالمتین: دی ندا ہاتف نے بہرِ سالِ فوت
۵۵
عارفِ شیریں بیاں خاموش ہے
۲۰۰۱ء=۵۵+۱۹۴۶ء

گزشتہ چار شعری مجموعوں کی تخلیق و اشاعت سے حفیظ شاہد کے فن کو بڑی جلا ملی ہے۔ اور ''نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل'' کے مصداق اُن کی ہر دوسری تصنیف پہلی سے مہارت و متانت، دلبستگی اور دلگدازی کے باعث نمایاں طور پر بہتر ہوتی ہے۔ اور اب اُنھیں شعر گوئی میں اتنا ملکہ حاصل ہو گیا ہے کہ وہ قلم برداشت نہایت کمال کی غزل تخلیق کر سکتے ہیں۔ غزل اور خاص طور پر خوبصورت اور دلکش غزل کہنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن شاہد اپنی ماضی کی ریاضت، عمر بھر کے مشاہدے اور مطالعے کے طفیل ایک ہی نشست میں مکمل زمین میں بڑی آسانی کے ساتھ آٹھ دس شعر کی غزل کہنے پر قادر ہیں۔ اور یہ قدرت دیارِ شعر میں اتنی عام نہیں۔

شاید حفیظ شاہد جوانی میں عشق و عاشقی کے چکر میں زیادہ نہیں پڑے ورنہ اُنھیں غمِ جاناں سے غمِ دوراں کی طرف رُخ بدلنے میں بڑی محنت اور کاوش کرنی پڑتی۔ جو شاعر جوانی ہی میں فکرِ معاش کا ہدف بن جائے اور ذمہ داریوں کا بوجھ اُس کی کمر کو دوہرا کر دے تو ان کے کلام میں ڈستے ہوئے مسائل کا ذکر بلا کسی شعوری کاوش کے دَر آتا ہے اور پھر مسافرت اور دَربدری کا احساس بڑے نمایاں انداز میں ان کے دل و دماغ میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ ۔

جانے کیا اس نے میری خاکِ بدن میں رکھا
بے وطن جس نے مجھے اپنے وطن میں رکھا
رہتا ہے مستقل وہ سفر کے عذاب میں
کتنا نہیں ہے بندۂ حاجات کا سفر

اسی طرح آج کے معاشرے میں مسائل میں گھرا ہوا انسان وہ نہیں رہا جو آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے اطمینان اور قناعت سے زندگی بسر کرنے والا انسان تھا:

نئے اشغال نے ہر آدمی کے
بدل کر رکھ دیئے معمول کیا کیا

حفیظ شاہد بجا طور پر محسوس کرتے ہیں کہ اُنھیں جو کچھ ملا ہے اس وطن پاک کے صدقے میں ملا ہے۔ اسی باعث اُن کے ہاں وطن سے محبت کا پہلو بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ جس طرح وہ اپنی اور اپنے گھر کی خیر مانگتے

ہیں، اسی طرح وہ اپنے وطن پاک کی زندگی اور پائندگی کے لیے دستِ دُعا ہیں:

خود گرا کر یہ فصیلیں شہر کی
قبضۂ اغیار کو روتے ہو کیوں
کھنک رہے ہیں شگوفے نگاہِ گلچیں میں
چمن چمن کو وہ اپنی پناہ میں رکھے
محفوظ ہی رہے یہ محبت کا آشیاں
اس پر کسی برقِ عداوت نہ گر پڑے

حفیظ شاہد اس لحاظ سے خوش نصیب اور صاحبِ فہم وفراست ہیں کہ انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار اور ابلاغ کے لیے غزل ایسی صنفِ سخن کو اپنایا جو ہر دَور میں تروتازہ اور دلکش ورعنا رہی ہے۔ خواہ وہ کلاسیکی دَور ہو یا جدید دَور، خواہ وہ عشقِ جاناں ہو کہ عشقِ کائنات، غزل ہر دَور میں اپنی نغمگی اور ایمائیت کے طفیل انسان کی راز دان وہمسفر رہی ہے۔ رومانوی شاعری ہو کہ مسئلہ مسائل معاش ومعیشت، عدل وانصاف کا فقدان ہو یا ظلم وجبر کی فراوانی۔ غزل نے ہمیشہ انسانی آہوں، سسکیوں اور نوحوں کو ایک دلدوز لہجہ اور کربناک آہنگ بخشا ہے۔ وہ انسانوں کے دُکھ سکھ کی آواز بنی ہے۔ ہر چند کہ بہت سے جدید شعر محض لفظوں کی جگالی کرتے ہیں اور جدت کے حسن سے ان کا دُور کا بھی واسطہ نہیں لیکن جن معدودے چند شاعروں نے رومانیت اور کلاسیکیت کے ساتھ ساتھ جدت کو اپنایا ہے اور اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ ان میں بڑے اعتماد سے حفیظ شاہد کا نام لیا جاسکتا ہے۔ الفاظ کا جدید انداز میں استعمال ہو کہ منفرد ومرکب تراکیب (مثلاً نصیبوں کی سیپیاں، شکارِ لشکرِ آفاتِ روزگار، مصدارِ نور وضیا، پیامِ موسمِ گل، سرِ شہرِ ملامت، چراغِ وجودِ انساں وغیرہ) تشبیہیں ہوں کہ رموز وعلائم حفیظ شاہد کے اشعار میں ان سب کی قدم قدم پر جلوہ نمائی نگاہوں کو خیرہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ بہت سے جدید شعرا نرم و ملائم الفاظ کی بجائے جدت کے نام پر جا وبیجا کھردرے استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا اظہار وبیان میں جہاں دل کا تقاضا ہوتا ہے وہاں وہ دماغ رکھ دیتے ہیں۔ لیکن (''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'') کے شاعر بقول کالرج ''The best words in best order is the tru definition of poetry'' لفظوں کے بہت بڑے پارکھ ہیں اور ان کے استعمال کا خوبصورت قرینہ اور سلیقہ ان کے اظہار وبیان کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کب ہو گی یہ مسافتِ دار و رسن تمام
زخموں سے چور چور ہے میرا بدن تمام

(اور یہ بھی دیکھیے کہ مولانا حسرت موہانی کی زمین میں کتنا اچھا اور ان کی رومانویت کے برعکس آج کے دَور کا عکاس کتنا زبردست شعر نکالا ہے)

خواب جس کے دکھائے گئے رات بھر
وہ سحر اور تھی، یہ سحر اور ہے

ترے عہدِ ستم میں زندگانی
کڑی افتاد ہوتی جا رہی ہے

شاعری ضروری نہیں کہ اخلاقیات کا درس بھی دے۔ لیکن اسے غیر اخلاقی بھی نہیں ہونا چاہیے۔ افلاطون اور میتھیو آرنلڈ کے مطابق شاعر معلم اخلاق بھی ہوتا ہے۔ اردو شاعری کی روایت میں اخلاقیات اور پند و موعظت کا بڑا حصہ اور بڑا مقام ہے۔ غالب اور مولانا حالی سے لے کر علامہ اقبال اور بعد کے بہت سے دوسرے شعراء نے اپنی شاعری میں نیکی، اچھے اخلاق، راست گوئی اور راست بازی کا بھی درس دیا ہے۔ مثلاً غالب:

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

اسی طرح حالی:

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
تکلف علامت ہے بیگانگی کی
نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ

علامہ اقبال:

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
رہتا ہے مستقل وہ سفر کے عذاب میں

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر نہ سیہ کار رہے

حفیظ شاہد بھی شعرا کے اسی طبقہ عالیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے اِکا دُکا اشعار کے علاوہ اپنی مسلسل غزلوں کی بنیاد تعمیرِ سیرت و کردار پر رکھی ہے۔ ''مہتاب غزل'' کے فلیپ نگار ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے مطابق ''حفیظ

شاہد خیر کی اقدار کے علمبردار ہیں۔'' یہاں ان کے چند اشعار دیکھیے:

گھر سے باہر نکلا کر
دنیا کو بھی دیکھ کر
کیا کھویا کیا پایا ہے
تنہا بیٹھ کے سوچا کر
جس کے کارن جیون ہے
یاد اسے ہر لمحہ کر
اپنے تو پھر اپنے ہیں
غیروں کو بھی چاہا کر
شاہد اکثر پچھلی رات
اس کی یاد میں رویا کر

سمندر سے یہی سیکھا ہے ہم نے
کناروں سے کبھی باہر نہ ہونا

رہتا ہے مستقل وہ سفر کے عذاب میں
کٹتا نہیں ہے بندہء حاجات کا سفر

شاہد پچھلی رات دُعائیں
بگڑے کام بنا دیتی ہیں

حفیظ شاہد کے ہاں جدید تر عصری حسیت اپنی توانا ترین شکل میں موجود ہے۔ وہ دہشت و بربریت، دھوکا دہی اور استحصال کے مخالف اور خدا کی عطا کردہ زندگی کو پرامن دیکھنے کے متمنی ہیں۔

بنامِ منزل خود انحصاری
ہمیں لوٹا ہے زرداروں نے اکثر

اپنے فن کو بیچنے والے شاعروں اور صحافیوں کے بارے میں کہتے ہیں:

سرِ بازار بیچا ہے قلم کو
سخن سازوں، قلمکاروں نے اکثر
لگائے ہیں کڑے پہرے زباں پر
صداقت کے پرستاروں نے اکثر

ہمارے دیس کا ہو یا بدیسی
ہماری جنگ ہر سفاک سے ہے
دیکھو تو سرِ شہر ملامت مری خاطر
یاروں نے ابھی تیر بچار کھے ہیں کیا کیا

ان مثالوں سے یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ بڑی سنجیدگی، اُستادانہ مہارت اور آسانی کے ساتھ لفظ برتنے کا جو سلیقہ شاہد کو ملا ہے وہ ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتا۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں دنیا شاعر کو حادثات اور تجربات کی شکل میں جو کچھ دیتی ہے شاعر اس میں اپنی منفرد طبع کا رنگ ملا کر دنیا کو لوٹا دیتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے کا عمل کوئی اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ یوں نہیں ہے کہ شاعر صفحۂ قرطاس پر لفظوں کی شکل میں روشنائی کے چھینٹے بکھیر دے بلکہ اسے اپنا ماضی الضمیر کچھ اس شکل میں بیان کرنا پڑتا ہے کہ پڑھنے والوں کے دِلوں پر نہایت عمدہ اَنداز میں اثر انداز ہو جائے۔ شاعری لفظوں کے کڑے انتخاب سے عبادت ہے۔ انتخاب میں حسن بھی ہونا چاہیے اور فصاحت و بلاغت بھی۔ اور یہ سب کچھ ایک بے نام اور طلسماتی طریقے سے ہوتا ہے۔ تبھی ہم شاعر کے ساتھ ان دیکھی فضاؤں میں ان دیکھے زمانوں کی طرف خود کو محوِ پرواز محسوس کرتے ہیں:

کلی کلی مری اُمید کے گلستاں کی
شہید بختی موسم دکھائی دیتی ہے

وہ بڑے عزم و حوصلہ کے ساتھ صحرا کی تپتی راہوں اور چلچلاتی دھوپ میں اپنی منزل کی طرف گامزن ہیں۔ وہ چولستان کے تپتے اور سلگتے صحرا کے باسی ہیں۔ تبھی ان کے کلام میں وہ تمام الفاظ اور وہ تمام استعارے اور علامتیں قدم قدم پر ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی معلوم دیتی ہیں جو بارش کے ایک ایک قطرے کو ترستی ہوئی دھرتی کا مقدر ہیں۔ جہاں خوش رنگ اور مہکتے ہوئے گلبن و گلزار کی بجائے تیروں کی طرح جسموں کو چھلنی کر دینے والی سورج کی کرنیں اور نیزوں کی طرح لہولہان کر دینے والے خارزار راہی کا مقدر بنتے ہیں۔ جہاں خیابانوں میں خوش خرامی کی بجائے پاؤں کے آبلے مسافروں سے خراج حاصل کرتے ہیں۔ تو پھر یہ ماحول اور یہ سب کچھ حفیظ شاہد کی سوچ اور اظہار کا مرکز کیوں نہ بنتا:

صحرا کی تیز دھوپ سے ڈرتا نہیں ہوں میں
انساں ہوں کوئی موم کا پتلا نہیں ہوں میں
کر کے سود اراہ کے اشجار کا
سایۂ اشجار کو روتے ہو کیوں

کوئی شاعر خواہ کتنا ہی جدت کا پرچار کرے۔ خواہ کتنا ہی گردشِ دوراں کے اظہار کے لیے خود کو وقف کر دے لیکن کوئی سرمئی آنکھیں، کوئی دھنک رنگ آنچل، کوئی دلوں میں اترتی ہوئی نظریں اور لب و رخسار کی رعنائیاں اس سے کبھی نہ کبھی ضرور تقاضا کرتی ہیں کہ اپنی بھولی ہوئی منزل کی طرف بھی رُخ کر لو۔ کیونکہ اس کے

بغیر یا پھر صرف بے کیف لفظ و آہنگ، غضبناک خیالات اور تجزیاتی طرزِ اظہار کے ساتھ کوئی شاعری صحیح معنوں میں شاعری نہیں بنتی۔ بلکہ یوں کہیں تو زیادہ بہتر ہے کہ راہگزاروں، راہگزاروں، آندھیوں، طوفانوں، صرصرو سموم، آہوں اور نوحوں کے ماحول میں اگر کہیں حسن و جمال کی شفق اور جذبہ کی دھنک بھی فضائے دل و دیدہ پر لہراتی ہوئی نظر آ جائے تو زندگی سکون و طمانیت سے خورسند ہوتی نظر آتی ہے۔ حفیظ شاہد کی نظر جب ایوانِ حسن و عشق کی طرف اُٹھتی ہے اور ان کا دل و دماغ اظہار کے نئے نئے پیکر تراشتا ہے تو وہ بھی آرزو کر اُٹھتے ہیں کہ زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں کسی زہرہ جبیں کے گیسوؤں کی رواں کی ہستی پر کسی خنک گھٹا کی طرح چھا جائے یا پھر موسمِ گل کا دریچہ کھول کر ہوا کا کوئی تو جھونکا ان کے بھی جسم و جاں کو معطر کر دے۔ ملاحظہ کیجیے:

جب مجھے چھوڑ کر ہمسفر چل دیا
ایک سایہ میرے ساتھ گھر چل دیا

ترے عہدِ ستم میں زندگانی
کڑی افتاد ہوتی جا رہی ہے

تم اپنے گیسوئے پرخم سے پوچھو
مرے پاؤں میں ہے زنجیر کس کی

درخشاں دل کے بام و در پہ شاہدؔ
ابھی اس کی محبت کے دیے ہیں

جو ہو سکے تو ہمیں ہجر کی تمازت میں
تم اپنے سایہ زلفِ سیاہ میں رکھنا

کیا خبر تھی وہ ہمیں ایک ستارے کی طرح
پار رہ کر بھی بہت دور دکھائی دیں گے

کیوں نہ ہم لپکیں چراغِ حسن پر
روشنی پر تو پتنگا آئے گا

ایک غنچہ دہن کی آمد پر
موسمِ گل کا اہتمام نہ پوچھ

محسوس کرتا ہوں کہ ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' پر میری یہ گزارشات اس وقت تک مکمل نہیں ہوں گی جب تک میں حفیظ شاہد کی دو ایک غزلوں کے مسلسل کئی اشعار قارئین کی خدمت میں پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش نہ کروں کہ دیکھیے شاعر فصاحت و بلاغت، چستی بندش اور لفظوں کی برمحل نشست و برخاست کے ساتھ اپنے فکری معیار کو قائم رکھتے ہوئے کس بے تکلفی سے متواتر شعر پر شعر کہے جا رہا ہے اور اس قسم کی Sustaind creativity ہر ایک شاعر کے بس کا روگ نہیں ہوتی:

بھٹکتی ہیں نہ جانے کیوں سرِ ہر رہگزر آنکھیں
کبھی ہیں خاک پر آنکھیں کبھی افلاک پر آنکھیں
جنہیں وقتِ سفر میں محوِ گریہ چھوڑ آتا ہوں
مری آنکھوں میں رہتی ہیں وہ میری ہمسفر آنکھیں
غموں کی دھوپ میں اک سائباں کا کام دیتی ہیں
یہ تیری مہرباں آنکھیں یہ تیری چارہ گر آنکھیں
کبھی ایسے بھی لمحے زندگی میں آ ہی جاتے ہیں
کہ ہو جاتی ہیں شاہدؔ خود بخود اشکوں سے تر آنکھیں

....

نئی شاخیں، نئے پتے ہیں پیوستہ نہیں ہوتے
نیا موسم بھی ہوتا ہے شجر کے ساتھ وابستہ
دعاؤں کا تعلق تو دلوں کے ساتھ ہوتا ہے
دعائیں تو نہیں ہوتیں اثر کے ساتھ وابستہ
کبھی تو نے تو اس موسم کا منظر ہی نہیں دیکھا
جو موسم ہے ہماری چشمِ تر کے ساتھ وابستہ
عجب آوارگانِ دشت ہیں ہم لوگ بھی شاہدؔ
نہ در کے ساتھ وابستہ، نہ گھر کے ساتھ وابستہ

حفیظ شاہدؔ کے کلام کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی گلیم بردوش درویش علی الصباح کسی اونچے ٹیلے پر بیٹھا نسیم و صبا کے دوش پر لہراتی ہوئی اپنی آواز کی لہروں سے ہماری سماعت کو حال کے کربناک مسائل اور آئندہ کی راست خوئی و راست روی سے آگاہ کرتے ہوئے ہمیں یوں زندگی کرنے کا ہنر سکھا رہا ہو کہ ہم اس کے دلنشیں لہجے سے اپنے جسم و جاں میں ایک توانائی سی محسوس کرتے ہوئے اس کی طرف سپاس گزار نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں۔ اور حفیظ شاہد کا یہی طلسماتی ہنر ان کے تازہ شعری مجموعے ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' کی ملک گیر وسعتوں میں پھیلی ہوئی پذیرائی کا ضامن ہے۔

جس بات نے کیا ہے سفر دور دور تک... پہنچی تھی لاشعور سے میرے شعور تک

چھ شعری مجموعوں پر مشتمل کلیات... ''ختم سفر سے پہلے''

عرضِ مرتب

پروفیسر سہیل اختر (بہاول پور)

بعض لوگ آنکھوں میں جذب ہو کر دل میں سما جاتے ہیں جبکہ بعض ذہن و فکر کے زینے سے بساطِ دل پر اُترتے ہیں۔ حفیظ شاہد کا شمار موخر الذکر لوگوں میں ہوتا ہے۔ جنوبی پنجاب میں حفیظ شاہد بہترین بلکہ اگر اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے تو عظیم ترین غزل گو کے منصب پر فائز ہیں۔ انہوں نے یہ منصب اپنے چھ غزلیہ شعری مجموعوں کی روشنی اور تابناکی سے حاصل کی ہے۔ آج کل جبکہ بعض نوجوان دو چار سال کے شعری سفر کے بعد ہی خود کو مسندِ شہرت و مقبولیت پر براجمان سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ حفیظ شاہد کی شاندار کامیابیوں کا سفر نصف صدی سے بھی زیادہ سالوں پر محیط ہے۔ اور پھر یہ صرف نظریاتی بات نہیں کہ حفیظ شاہد نے کشتِ غزل کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ بلکہ عملی کیفیت اس کی شاہد ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ چند ماہ پیشتر جب وہ خان پور سے میرے پاس بہاول پور تشریف لائے تو ان پر اضمحلال کی کیفیت طاری تھی۔ وہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کے لیے مجھے ساتھ لے گئے۔ چیک اپ کے بعد پتہ چلا کہ ان کا موہوگلوبین بارہ تیرہ پرسنٹ کی بجائے صرف چھ پرسنٹ ہے۔ یعنی

ع ۔ خوں تھا جو جسم و جان میں غم کو پلا دیا

یوں کہہ لیجئے کہ غمِ ذات و غمِ جہاں ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ کھاتے پیتے شاعر اور موٹے تازے اہلِ قلم اس غم اور پھر اس اعلیٰ پائے کے کلام سے محروم ہوتے ہیں جو دھان پان قسم کے اچھے شاعروں کا خاص نصیبہ ہوتا ہے۔ توانا و تندرست اور اہلِ ثروت کو وہ سوزِ دروں حاصل نہیں ہوتا جو اچھے شعر کی بنیاد ہوتا ہے۔ اگر تحقیق کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ شاعری کے سمندر کی گہری تہوں سے تغزل کے موتی تلاش کر کے لانے والے اچھے شاعروں کا ہوموگلوبین شاید نارمل ویلیو سے کم ہی ہوتا ہوگا۔ اسی باعث تو کسی شاعر نے کہا ہے:

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

اور جب ایک سال کے بعد چیک اَپ کے سلسلے میں حفیظ شاہد دوبارہ تشریف لائے اور ہم دونوں لیبارٹری پہنچے تو معلوم ہوا کہ اب کے ان کی شاعری کے عمودی سفر اور جسمانی اضمحلال کا باعث پھر ان کا ہوموگلوبین ہے جو صرف تین پرسنٹ ہے۔ حفیظ جوں جوں اچھے سے اچھے شعر کہتے جاتے ہیں وہ اُن کا خون پیتے جاتے ہیں اور خود ان کے بقول:

خالی دکھائی دیتے تھے تاثیر سے حروف
جب تک کہ ہم نے اپنے لہو سے لکھے نہ تھے

حفیظ شاہد نا صرف باوقار لب ولہجہ کے شاعر ہیں بلکہ انتہائی بسیار اور زود گو بھی ہیں۔ ان کی بسیار گوئی کی ایک مثال میں یوں دے سکتا ہوں کہ چند برس پہلے ہر روز رات کے دس بجے میرے موبائل فون کی گھنٹی بجتی اور جناب حفیظ شاہد اپنی تازہ غزل سے میری سماعت و ذہن میں کھنکھناتے ہوئے نغمے انڈیل دیتے۔ ہمارے صحن

میں گلِ شبو، رات کی رانی اور موتیا کی خوشبوئیں ان کی غزل کی نکہت اور ان کے لہجے کی ملائمت کے ساتھ مل کر عجیب سماں باندھ دیتی تھیں۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک ماہ جاری رہا اور انھوں نے ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' کی بہت سی غزلوں سے میری راتوں کے لمحوں کو عطر بیز کر دیا۔

تب مجھے خیال آیا کہ چھ اعلیٰ درجے کے شعری مجموعوں کے خالق کا حق بنتا ہے کہ ان کے کلام کو یکجا کر کے کلیات مرتب کی جائے۔ سو میں نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر پہلا قدم یہ اُٹھایا کہ شاہد کے مجموعہ ہائے کلام ڈھونڈ ڈھونڈ کے اپنے بستر کے سرہانے جمع کرنے شروع کر دیے اور اُن کا از سرِ نو مطالعہ شروع کر دیا تا کہ کلیات کے جواز اور اُس کی تشکیل کا نقشہ میرے ذہن میں عکس ریز ہو جائے۔ پھر میں نے ان کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے ان سے رابطہ کیا۔ پہلے تو انہوں نے اپنی طبعی منکسر المزاجی کے باعث تکلف سے کام لیا لیکن آخر کار میری تجویز کو قبولیت سے لال گلول کر دیا۔ پھر ہم نے معروف اور صاحب طرز ادیب گوہر ملسیانی سے درخواست کہ وہ صاحب کلیات پر ایک سیر حاصل مقالہ سپردِ قلم فرمائیں۔ انہوں نے صاد کیا اور وہ ایک ماہ کے بعد ایک تفصیلی مقالہ ہمارے ہاتھوں میں تھا۔ یہ ان کا ہم سب پر احسان بھی ہے اور کرم بھی۔

''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' کے دیباچے میں حفیظ شاہد کے فن کا ایک نایاب پہلو بھی ملاحظہ کریں گے یعنی تاریخ گوئی۔ یہ وہ فن ہے جو ہزاروں میں سے کسی ایک کو ہی فطرت کی طرف سے ودیعت کیا جاتا ہے۔ یعنی لفظوں، حرفوں اور مصرعوں سے حروفِ ابجد کی قدر کے حوالے سے کسی اہم واقعے، سانحے اور سفرِ حیات کی تاریخ نکالنا۔ حفیظ شاہد نے اس فن میں بھی کمال کیا ہے۔ اس کی تفصیل ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' میں درج ہمارے پیش لفظ کی سطروں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ گزشتہ دنوں اُن کی کہی ہوئی ایک تازہ تاریخ نظر سے گزری جو خود اُن کی اپنی ذات سے متعلق ہے۔ یہ قطعہ تاریخ کلیات میں شامل کر دیا گیا ہے۔ کلیات مرتب کرنے کی تحریک دوسرے عوامل کے علاوہ مذکورہ بالا مادۂ تاریخ سے بھی ہوئی۔ حفیظ شاہد نے جس ختمِ سفر کی طرف اشارہ کیا ہے اس میں ایک گونہ اداسی اور یاسیت بھی جھلک رہی ہے۔ اسے بھی محسوس کر کے راقم کے ذہن میں ان کے کلیات مرتب کا خیال آیا۔ حفیظ شاہد نے ''سفر روشنی کا'' سے اپنے شعری اور اشاعتی سفر کا آغاز کیا تھا جو ''چراغ حرف''، ''مہتابِ غزل''، ''یہ دریا پار کرنا ہے''، ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' اور ''سورج بدل رہا ہے'' پر اختتام پذیر ہوا۔ مذکورہ مجموعوں میں سفرِ فکر و تفکر کا کلیدی حوالہ مہر و ماہ کی ضیا پاشیوں ہی کا ہے۔ اور اب جو تازہ قطعہ تاریخ صاحب کلیات نے کہا ہے اور جس کا عنوان انہوں نے ''ختمِ سفر سے پہلے'' تجویز کیا ہے۔ میرے نزدیک اس میں ایک طرح کی ماندگی اور نا اُمیدی جھلکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں عمرِ خضر اور صحت و تندرستی سے نوازے۔ (آمین) تا کہ وہ روشنی کے سفر کو جاری رکھ سکیں اور باذوق قارئین کو ایک اور کلیات کا تحفہ دے سکیں۔

اس کلیات میں حفیظ شاہد کے کلام کی تحسین و تفہیم کے سلسلے میں معروف اہلِ قلم کے دیباچے اور پیش لفظ بھی شامل کر دیے گئے ہیں تا کہ عصری منافقت در مصلحت کیشی سے دامن کش حفیظ شاہد کے ذہنی سفر اور ندرت و جدت کی ضو ریزی بھی ذہنوں کو منور کر سکے۔ بہترین کتاب، طباعت اور تزئین و آرائش سے جھلملاتی ہوئی یہ کلیات بصیرتوں کے ساتھ ساتھ بصارتوں کو بھی یقیناً ضو ریز کرے گی۔

کلیات "ختمِ سفر سے پہلے" میں شامل ابتدائیہ
اُردو غزل کا معتبر شاعر حفیظ شاہد
گوہر ملسیانی (صادق آباد)

حفیظ شاہد کا گلستانِ سخن دلربا، جانفزا بہاروں کی فضا اور جذبہ وخیال کی چونکا دینے والی صدا رکھتا ہے۔ انہوں نے کشتِ غزل کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ یہ شعر وسخن کی دولت وثروت اُن کی عمر بھر کی کمائی ہے۔ وہ خود اس بات کی تصدیق کرتے ہیں:

جس کو کہتی ہے شاعری دنیا
عمر بھر کی مری ریاضت ہے

تخلیقِ پاکستان کے بعد غزل میں نئے مضامین، جدید جذبات وخیالات کی ضیائیں لیے ہمارے قلب ونظر کو خیرہ کرتے ہیں۔ خصوصاً آشوبِ وقت نے ہر غزل نگار کو متاثر کیا ہے۔ انسان کے خون کی ارزانی، وطن سے مفارقت، نئی فضا کی طوفانی لہریں، اضطراب، ذہنی خلجان، معاشرتی اور سماجی اُلجھنیں، کرب، درد وغم، غربت، تنگدستی اور آشفتہ حالی کے واقعات غزل کو جدید خیالات سے مزین کرتے ہیں۔ روایت میں الفاظ وتراکیب نے نیا پیراہن پہنا۔ ایمائیت اور رمزیت تغزل کی روح ہیں۔ ایسے ایسے جذبے فکر کو اُسلوب کا جامہ بناتے ہیں کہ ایک نیا روشن کینوس تاریخِ ادب کا جمال بن کر اُبھرتا ہے۔ پھر سائنسی ترقی اور مغربی تعلیم کے جدید منظر نامے نے موضوعات کو وسعت عطا کی، غزل میں نئی زندگی اور پر بہار تازگی داخل ہوئی جس نے جدید غزل کو حسنِ خیال، حسنِ تاثیر اور عصریت کی آگہی کا حسن عطا کیا۔ پاکستان کی تخلیق کے بعد، پندرہ بیس برس تک مختلف تحریکوں کے زیرِ اثر تجربات ہوتے رہے، یہاں تک کہ جدید غزل ۱۹۶۰ء کے قریب جدید نسل کے ذریعے جدید سوچیں، معاشرے کے نئے سماجی اور معاشرتی امور کے تاثرات سے مزین ہو کر سامنے آئیں اور غزل کی روایت میں نئے خیالات و تصورات، جدید الفاظ وتراکیب، تشبیہات واستعارات اور جدید رجحانات کے گلہائے رنگا رنگ شامل ہونے لگے۔ جدید غزل گو شعرائے کرام نے اپنے خیال کو الفاظ کا جامہ پہنانے کے لیے جدید لفظی علامتیں بھی، روایت کے استعمال کردہ الفاظ وتراکیب کو نئے معانی دے کر منتخب کی ہیں، جس سے غزل کی فضا تبدیل ہوئی۔

جدید غزل جو آج کل ادبی محافل اور ادبی جرائد میں ہمارے سامنے ہے، اس کی فضا نئی ہے، اس کا ماحول نیا ہے۔ اس کا لہجہ نیا ہے تغزل کا رنگ نیا ہے، اس کی ڈکشن نئی ہے، اس کے خیال کا پیراہن نیا ہے، اس کی بنت نئی ہے، اس کی روایت کا اُسلوب نیا ہے۔ اس قافلے کے جن شعرائے کرام کو عصرِ جدید میں پذیرائی کے ساتھ ساتھ مقبولیت بھی ملی ہے۔ ان میں جدید تر اسلوبِ غزل کے نمائندہ اور منفرد لہجے کے شاعر حفیظ شاہد ہیں۔ جن کو فکر وفن، خیال وہنر اور جذبہ و پیرائیہ اظہار کی رعنائیاں ودیعت ہوئی ہیں۔ جن کی غزلیات کے درج ذیل سات مجموعے منصۂ شہود پر آ کر اہلِ فکر وبصیرت وصاحبانِ علم وحکمت اور نقادانِ شعر وسخن سے داد وتحسین پا چکے ہیں:

۱۔ سفر روشنی کا ۱۹۸۳ء
۲۔ چراغِ حرف ۱۹۸۹ء

۳۔	مہتابِ غزل	۱۹۹۴ء
۴۔	یہ دریا پار کرنا ہے	۱۹۹۷ء
۵۔	سفر روشنی کا (بہ ترمیم و اضافہ)	۱۹۹۹ء
۶۔	فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی	۲۰۰۴ء
۶۔	سورج بدل رہا ہے	۲۰۰۸ء

اب ان کا کلیات جسے معروف دانشور پروفیسر سہیل اختر نے مرتب کیا ہے اور جس کا تاریخی نام حفیظ شاہد نے تجویز کیا ہے، ہمارے سامنے ہے۔ عصرِ حاضر کی تاریخِ ادب وفن کے اوراق میں جدید غزل کی صوری و معنوی خصوصیات سے مزین کتب کا تذکرہ اہلِ نظر کی بصارت و بصیرت کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ان تذکار میں حفیظ شاہد کے جملہ مجموعے اپنے اُسلوب، غزل کی رعنائی، رمزو کنایہ کی جامعیت اور فکری رفعت و صداقت کے بہار آفرین چمنستان سجائے غزل کا نیا در کھولتے ہیں۔ وہ شعرائے عہدِ حاضر کے ایک توانا اور نمائندہ شاعر ہیں۔ مشرقی اقدار کے امین اور زندہ روایات کے وارث ہیں بلکہ جدید غزل میں طرحِ نو کے حامل ہیں۔ ان کی غزل میں صداقت کے پھول مہکتے ہیں۔ نغمگی اور شاداب حسن و جمال کی آئینہ دار ہے، شعری وجاہت اور فنی نفاست اُردو غزل کی عظمت و ثروت ہے۔ ان کی غزل کی کلیوں سے نکلنے والی خوشبو مشامِ جاں کو معطر کرتی ہے۔ یہ بات اہلِ نقد و نظر اور اہلِ فکر وفن سے پنہاں نہیں کہ جب کوئی غزل گو خیال کو دوسروں تک منتقل کرنے کی سعی کرتا ہے تو اُسلوب کے نئے نئے انداز تراشتا ہے اور پھر اس منصبِ جلیلہ پر فائز ہو جاتا ہے، جس کے بارے میں سہیل اختر کہتے ہیں کہ

دیارِ شعر میں یہ فن غزل گوئی کو آتا ہے
کہ اپنی بات کہہ کر کل جہاں کی بات کر دینا

حفیظ شاہد کے اُسلوبِ غزل کے جمال کی رعنائی معاشرے کے تابندہ رُجحانات سے حاصل کردہ ہے۔ موضوع کا تنوع بھی عصرِ حاضر کی فعال، مضطرب اور ہمہ جہت مصروف زندگی سے اخذ کردہ ہے۔ یوں اُن کی غزل میں عصری آگہی کے پھول مہکتے ہیں جن میں قنوطیت نہیں بلکہ رجائیت ہے۔ فضا بھی رومان پرور ہے، ان کی غزل میں صداقت کے پھول مہکتے ہیں۔ اس میں انسانی زندگی کے احساسات چمکتے ہیں۔ دل کی دھڑکنیں ہیں۔ مٹھاس ہے اور تغزل کی نکہت ہے۔ آیئے چند اشعار سے لطف اٹھاتے ہیں:

کچھ نئے منظروں میں ڈھلتی ہے
زندگی رنگ جب بدلتی ہے
نرم و نازک سی اک کلی دیکھو!
کیسے کانٹوں کے ساتھ پلتی ہے

(سفر روشنی کا)

پریشانی میں بھی زندہ دلی سے کام لیتا ہوں
بنامِ زندگی میں زندگی سے کام لیتا ہوں

ہمیشہ آدمی سے رابطہ رکھا ہے یوں میں نے
کسی کے کام آتا ہوں کسی سے کام لیتا ہوں

(چراغِ حرف)

ہم ان سے وفاؤں کا ثمر مانگ رہے ہیں
ناداں ہیں کہ پانی سے شرر مانگ رہے ہیں
اک اشک بھی آنکھوں کے سمندر میں نہیں ہے
ہم خشک سمندر سے گہر مانگ رہے ہیں

(مہتابِ غزل)

جانے کیا بات ہے کہ میں تنہا
محفلِ دوستاں میں رہتا ہوں
کیا دریچوں کو بند کرنا ہے
آندھیوں نے تو اب گزرنا ہے

(یہ دریا پار کرنا ہے)

اب مرے سامنے رہگزر اور ہے
اک سفر کٹ گیا، اک سفر اور ہے
تیرے چہرے پہ تحریر ہے اور کچھ
تیرے لب پر کہانی مگر اور ہے

(فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی)

یہ زندگی ہے ایک حسین خواب کی طرح
یہ زندگی ہے ایک کڑا امتحان بھی
شاہد مجھے یقین ہے فصلِ بہار میں
بھر جائے گا گلوں سے مرا گلستان بھی

(سورج بدل رہا ہے)

حفیظ شاہد کے ہاں ایسا ہی تخلیقی عمل ہے جو جاودانی کیفیات اور درخشاں تصورات رکھتا ہے۔ استعارے کا حسن تو ان کے مجموعہ ہائے غزلیات کے ناموں سے لے کر ان کے کلام کی بنت میں زندگی کی ترجمانی اور سوچوں کی پاسبانی کرتا ملتا ہے۔ روشنی اُن کا عمدہ استعارہ ہے۔ ان کی غزلوں کے چار مجموعوں کے ناموں سے روشنی کا تعلق وابستہ ہے۔ ان کی غزلیات میں روشنی کے تلازمات، چراغ، دیا، مہتاب، آفتاب، کرن، سورج، مشعل بکثرت مستعمل ہیں جو استعاراتی جمال دکھاتے ہیں۔ روشنی کا استعارہ اپنی وسعت، صداقت، روحانیت اور آفاقیت کے لحاظ سے اسلامی روایت کا مظہر ہے۔ روشنی حقیقتاً نور کا مترادف استعارہ ہے۔

اللہ نور السموت والارض

چنانچہ روشنی کا یہ استعارہ جہاں اپنے اندر نور رکھتا ہے وہاں زندگی کی نورانی صداقت بھی رکھتا ہے۔ حرکت اور عمل کی توانائی بھی رکھتا ہے۔ قیام و جمود کے بجائے سفر اور عمل کی روح بھی رکھتا ہے۔ حفیظ شاہد کے اُسلوبِ غزل میں اس روشنی کے استعارے کی بہار کا اپنا رنگ ہے۔ یہ استعارہ انسانی زندگی کی گہما گہمی کا مظہر ہے۔ معاشرتی، سماجی اور اسلامی روایات کی حقانیت کا پیغام بر بھی ہے۔ جذباتی اور ذہنی مسائل میں روحانیت کا نور بھی بھرتا ہے۔ آیئے روشنی کا استعارے کی چند جھلکیاں دیکھیں جو حفیظ شاہد کے اُسلوبِ غزل کی ضیا بار کرتی ہیں:

آنکھوں کی روشنی ہے تری اک نظر کی یاد — شہرِ خیال میں ہے ترا پرتو جمال
زندگی کے گھر میں روشن ہے — کس کا عکسِ جمال وضاحی

(سفر روشنی کا)

یوں گل ہوا چراغ دھواں بھی نہیں رہا — اب روشنی کا کوئی نشان بھی نہیں رہا
ہیں طلوعِ مہر پر بھی روشنی کے ضابطے — ہر اجالا اک نظامِ وقت کا پابند ہے

(چراغِ حرف)

ان چراغوں سے ہے میری چشمِ تر میں روشنی — دل کی بستی یں لہو کے جل رہے ہیں جو چراغ
بال کھولے رو رہی ہے کیوں کھنڈر میں روشنی — کس کی بربادی کا غم ہے کس کے لٹ جانے کا سوگ

(مہتابِ غزل)

مجھ کو یہ روشنی ہی کافی ہے — جادہ راستی ہی کافی ہے
فکر کی تازگی ہی کافی ہے — دل کے آنگن میں روشنی کے لیے

(یہ دریا پار کرنا ہے)

روشنی پر تو پتنگا آئے گا — کیوں نہ ہم لپکیں چراغِ حسن پر
روشنی کا نشان ہم بھی ہیں — چاند سورج کو دیکھنے والے

(فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی)

بن گئی تیز روشنی دیوار — آپ کو دیکھ بھی نہیں سکتے
میرے سخن میں کوئی اندھیرا نہیں رہا — شامل ہے بات بات میں لفظوں کی روشنی

(سورج بدل رہا ہے)

جدید غزل کو زندہ اسلوب دے کر بامِ عروج تک پہنچانے میں جن شعرائے کرام نے گلستانِ جذبہ و خیال سجایا ہے اور اظہار و بیان میں رنگا رنگ پھول کھلا کر انفرادیت کا روپ دکھایا ہے۔ حفیظ شاہد ان میں سرِ فہرست ہیں۔ روشنی کی طرح ایک اور استعارہ سفر بھی جدید اُسلوب کے چنیدہ رنگوں اور تجربات و واقعات کی وسیع دنیا لیے ہوئے ہے زندگی کی رنگا رنگ حشر سامانیاں، منزلِ مقصود پانے کے لیے روز و شب کی جولانیاں، رقصاں تغیرات کی تابانیاں اور آلامِ روزگار کی پریشانیاں اسی سفر کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں۔

دنیا کا ہر مفکر و مدبر، شاعر و ساحر اور فنی وجاہت کا حامل مصور، اپنی عظمت و شوکت اور عزت و رفعت کے مدارج اسی وقت پاسکا ہے جب وہ "سفر" کی تنگنائیوں، مشقت سے لبریز کوہ پیمایوں اور قدم قدم پر سدِ راہ بننے والی گہرائیوں کو عبور کرنے کا حوصلہ کرسکا۔ حفیظ شاہد کی فکری توانائی میں سفر کے استعارے کا یہ رنگ معاشرتی، تاریخی اور عمرانی حقیقتوں کا ترجمان بنتا ہے۔ سفر زندہ رہنے، حرکت کرنے، مقصد پانے، عشق و محبت کو جگمگانے اور طوفان و حوادث سے ٹکرانے کا نام ہے۔ انسانی معاشرے کی ہر تحریک سفر سے طاقت و قوت پاتی ہے۔ اسی میں مستقبل کی روشنی ہے، اسی میں روحِ عصر کی کش مکش کی رعنائی ہے۔ اسی میں زندگی کے تابندہ آثار ہیں، اسی میں رفاقت کے نگینے ہیں۔ آیئے ان کے اسلوبِ غزل میں سفر کی جدید بنت کے رقصاں مناظر کا مشاہدہ کریں۔

دل میں نہ اپنے رختِ سفر کا خیال کر — کام آئیں گی یہ بے سرو سامانیاں ترے
پرخار راستوں میں بڑی دیر سے ہوں میں — کب ہو گا ختم دیکھئے امید کا سفر

(سفر روشنی کا)

کس سفر پہ نکلے ہیں کارواں پرندوں کے — رت ابھی نہیں بدلی، اپنے آشیانوں سے
رک گیا ہوں کہ میں سفر میں ہوں — اب تو احساس ہی نہیں ہوتا

(چراغِ حرف)

کچھ لوگ ابھی زادِ سفر مانگ رہے ہیں — اغیار ہیں مہتاب کی منزل سے بھی آگے
چل کے دیکھو خدا کے رستے میں — کتنا اچھا ہے یہ سفر شاہدؔ

(یہ دریا پار کرنا ہے)

بکھرے ہوئے ہیں موم کے پیکر قدم قدم — اک دھوپ کے سفر کا یہ انجام دیکھنا
ہر جادۂ خیال سے اک ربط ہے ابھی — جاری ہے مدتوں سے مری سوچ کا سفر

(فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی)

ہمیں کیا کیا دکھائے گا سفر میں دھوپ کا صحرا — کہیں جلتے ہوئے پیکر کہیں تپتے ہوئے پتھر
ہم نے کاٹے ہیں ترے ساتھ سفر کچھ ایسے — جن کی یادوں سے ہے دامانِ تمنا رنگین

(سورج بدل رہا ہے)

حفیظ شاہد بہت حساس شاعر ہیں۔ جب وہ احساس کی تاروں کو مضراب دکھاتے ہیں تو ایک ایسی جھنکار پیدا ہوتی ہے جو دلوں کو تڑپاتی جاتی ہے۔ ان کا یہ احساس ان کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس میں جامعیت اُبھر آتی ہے اور ہر قاری یا سامع اسے اپنی ذات کا احساس سمجھنے لگتا ہے۔ یہ حیثیت ان کے اسلوبِ غزل کو نیا حسن عطا کرتی ہے۔ وہ زندگی کی ان گنت خواہشات اور حسرتوں کے نتائج سے آشنا ہیں اور وہ ان جذبات و محسوسات سے اپنی دنیا آباد کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کی غزل میں دھوپ، درخت، دریچے، چاند کا داغ، سورج بدل رہا ہے، دشتِ حیات اور کانٹوں کی رفاقت جیسے الفاظ و تراکیب انئی اشاریت کا روپ دھار لیتے ہیں اور جدید اُسلوبِ غزل کا جمال بن جاتے ہیں۔ آیئے احساس کی حدت اور جذبے کی حرارت کو اُن کے اشعار کی زینت

بنتے دیکھیں:

احساس کو عجیب سی اک ٹیس دے گیا — سوکھے ہوئے شجر کو سرِعام دیکھنا

جب دھوپ میں چلو گے پگھل جائے گا بدن — پھر کس لیے ہو برف کا پیکر بنے ہوئے

اب پھول راستوں پہ بھی چلنا محال ہے — کل تک تھا سنگِ راہ بھی مخمل بنا ہوا

کیا کہتی ہیں تجھ سے یہ چٹکتی ہوئی کلیاں — تو نے کبھی اس راز کو سوچا ہے نہ سمجھا

نہ جانے کس لیے ہوتی ہیں نازل — بلائیں آسمانوں سے ہمیں پر

دل کا ہوں وہ امیر کہ رکھتا نہیں ہوں میں — لعل و گہر سے پیار، امیروں سے رابطہ

شہرِ دل میں ہیں جا بجا شاہد — مقبرے بے حساب یادوں کے

خدا کو چھوڑ کر اپنا سفینہ — سپرد ناخدا کیوں کر رہے ہو

جدید غزل میں محبت کا موضوع رنگارنگ پہلو رکھتا ہے۔ حفیظ شاہد نے محبت کی یہ تابانیاں جدید اُسلوب میں پیش کر کے غزل کے کینوس کو نئی نئی تصویروں سے بھر دیا ہے۔

رات جب جدائی کی روشنی کو ترسے گی — میں ترے تصور میں چاند بن کے اُبھروں گا

دیارِ چشم سے نکلے ہیں آنسو یوں ترے غم میں — کہ جیسے گاؤں سے سیلاب میں بے گھر نکلتے ہیں

قربتوں کی منزل تک تم پہنچ نہیں سکتے — تم نے دشتِ ہجراں کا راستہ نہیں دیکھا

وہ جل جان بہارِ آرزو ہے لوگ کہتے ہیں — اے شاخِ تمنا پر سجا کر دیکھ لیتا ہوں

میں محبت کی روشنی بن کر — وقت کی کہکشاں میں رہتا ہوں

حفیظ شاہد کی غزل میں جدید اُسلوب کے حوالے سے محبت کے متنوع موضوع کے جدید تجربات کسی اور جدید اسلوب کے غزل گو کے کیسۂ فکر میں نہیں ملتے۔ شاہد کے یہ چند اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ محبت کے استعارات کی رعنائی کہکشاں کے ستاروں کی طرح جگمگا رہی ہے۔

رات جب جدائی کی روشنی کو ترسے گی — میں ترے تصور میں چاند بن کے اُبھروں گا

دیارِ چشم سے نکلے ہیں آنسو یوں ترے غم میں — کہ جیسے گاؤں سے سیلاب میں بے گھر نکلتے ہیں

قربتوں کی منزل تک تم پہنچ نہیں سکتے — تم نے دشتِ ہجراں کا راستہ نہیں دیکھا

حفیظ شاہد کی غزل میں کوئی پراسراریت اور ماورائیت نہیں ہے۔ اگرچہ الفاظ رموز و علائم کے طور پر استعمال ہوتے ہیں مگر حالاتِ حاضرہ کی صحیح تصویر صداقت احساس اور معنویت ان کے فن کو دلآویز بناتی ہے۔ ان کی کوئی غزل زیرِ مطالعہ لے آیئے۔ ہر شعر نئی ڈکشن، وسعتِ مضامین، ندرتِ فکر کی دولت سے مالا مال ملے گا۔ انہوں نے عصرِ حاضر کے نشیب و فراز سے گزر کر کشمکشِ دنیا کے تھپیڑے سہہ کر حقیقتِ حیات پائی ہے۔ اُنہوں نے غمِ روزگار کے جھمیلے دیکھے ہیں مگر ان میں قنوطیت نہیں ہے۔

الفاظ و تراکیب روایت کے گلشن سے آتی ہیں مگر ان کا استعمال نیا پیرایہ اظہار اختیار کر جاتا ہے۔ آیئے اُن کے جدید خیال اور جدید اُسلوب کی چند ضیاؤں سے اپنے ذہن اور اپنی سوچ کو منور کریں۔

ڈھونڈتے پھرتے ہیں کس بے نام منزل کا نشاں — دشتِ غم میں ہم بگولوں کی قبا پہنے ہوئے
جھلسے ہوئے گلاب کے پیکر کو دیکھ کر — رخصت ہوئی ہیں کالی گھٹائیں بہا کے اشک
شاہد میں سوچتا ہوں کڑی دھوپ میں گھرا — کیوں میرے نام دشتِ بلا کر دیا گیا
سمندر سے یہی سیکھا ہے ہم نے — کناروں سے کبھی باہر نہ ہونا
شہر والوں کو اندھیرے بیچ کر — سو گیا وہ شخص گھوڑے بیچ کر
میں کیا دیکھوں، پرانے منظروں کو — بسی ہے اک نئی دنیا نظر میں

مجھے یہاں حفیظ شاہد کی اپنی زبان سے نکلے ہوئے صداقت کے پیکروں کا ذکر کرنا ہے کیونکہ شاعر کا فن تو خود بولتا ہے اور شاعر کا خون اس کے فن میں شامل ہوتا ہے۔ وہ خیال کی گرہیں کیسے کھولتا ہے، ہنر کی پاسداری کیسے کرتا ہے، آیئے دیکھتے ہیں:

میں نے شاہد اس کو ڈھالا ہے غزل کے روپ میں — مجھ کو جو کچھ عصرِ حاضر کے مسائل سے ملا
اگر اہلِ ہنر ہی کو نہیں پاسِ ہنر شاہد — تو کس کے سامنے اظہارِ فکر و فن کیا جائے
اور بھی محفل میں ہیں، اہلِ سخن شاہدؔ، مگر — مختلف لہجہ ہے میرا مختلف انداز ہے
اہلِ زر سے میرا کوئی رابطہ ممکن نہیں — میں ہنر ور ہوں، مرا اہلِ ہنر سے ربط ہے
کہاں آسان ہے اہلِ سخن کی بھیڑ میں شاہد — جدا اوروں سے اپنا طرزِ گفتار و بیان رکھنا
چراغِ خونِ دل ہم تو جلا کر — مضامین کا خزانہ ڈھونڈتے ہیں
ہنر کے شہر میں ہم بھی وقار رکھتے ہیں — ہر ایک حرفِ ہنر معتبر ہمارا ہے
بات وہ ہے جو اتر جائے کسی کے دل میں — اپنے الفاظ کو یوں تشنۂ مفہوم نہ رکھ
اب نہ ہوگی تو پھر کبھی ہوگی — میرے شستہ کلام کی توصیف
مری سوچوں کے رنگوں سے سجے ہیں — کبھی دیکھو مرے لفظوں کے چہرے
خالی دکھائی دیتے تھے تاثیر سے حروف — جب تک کہ ہم نے اپنے لہو سے لکھے نہ تھے

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ حفیظ شاہد لاکھوں میں ایک ہیں۔ انسانیت کے رمز شناس، بے حد حساس مگر رفاقت میں دمکتے الماس۔ اللہ تعالیٰ انہیں علم و فکر، فہم عصر اور زر فشانی ابر عطا کرے۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

☆☆☆

خراجِ عقیدت

حسنین ارشد (خان پور)

حفیظ شاہد.. انسان دوست شخصیت

محترم حفیظ شاہد صاحب سے میری ملاقات ان کی وفات سے ۱۰ سال پہلے ہوئی تھی' تب میں ۱۸ سال کا تھا۔ میں نے ان کو انتہائی شفیق اور مہربان انسان دوست شخصیت پایا۔ وہ اس قدر محبتیں بکھیرنے والے ہمہ جہت شخص تھے کہ ان سے ملے بغیر دل کو سکون نہیں ملتا تھا۔ اکثر ملاقاتوں میں' اُن کی زندگی کے تجربات کے بارے میں پوچھتا تھا۔ حفیظ شاہد صاحب ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے اور ہمیں بھی یہی تلقین کیا کرتے تھے۔

حفیظ شاہد کی علالت کے دنوں میں جب ان کو وکٹوریہ ہسپتال بہاول پور میں لے کر جانا ہوا تو اتفاق سے میں ان کے ساتھ تھا۔ دورانِ سفر میں نے اُن سے پوچھا کہ مجھے اپنی زندگی کے بارے میں بتائیں اور مجھے کچھ نصیحت کریں تو حفیظ شاہد صاحب نے نہایت دھیمے لہجے میں بولے:

"بیٹا! یہ زندگی نشیب و فراز کا نام ہے۔ اس میں کبھی نا اُمید نہیں ہونا اور امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا۔ تمہارا اخلاق زندگی گزارنے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اسی لیے ہمیشہ بااخلاق اور باکردار انسان رہنا۔"

آج بھی جب کبھی مجھ پہ مشکل حالات آتے ہیں تو ان کی کہی ہوئی نصیحت مجھ میں ہمت پیدا کر دیتی ہے۔

حفیظ شاہد صاحب ایک فرشتہ صفت انسان تھے جو سب سے محبت و خلوص سے پیش آتے۔ لوگوں کے درد کو اپنا سمجھتے تھے۔ قدرت نے انہیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔

انتقال سے دو گھنٹے پہلے جب ان کو شیخ زید ہسپتال رحیم یار خان لے جانے لگے' اس موقع پر میں اُن کے ساتھ تھا۔ ہسپتال پہنچ کر گاڑی سے اُترنے سے پہلے حفیظ شاہد صاحب نے اپنی ویسٹ کوٹ اور قمیض اُتار دی۔ میں نے کہا: انکل! قمیض نہ اُتاریں، باہر ٹھنڈ ہے۔ تو انہوں نے بہت پیار سے اور دھیمے لہجے میں کہا: بیٹا! اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ گاڑی سے اُترنے کے تیس منٹ بعد وہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

آج بھی جب کبھی مجھے اُن کے آخری لمحات یاد آتے ہیں تو میری عقل یہ سوچنے پہ مجبور ہو جاتی ہے کہ ہم نے اس دنیا میں ایک عظیم انسان کو کھو دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ حفیظ شاہد صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

اظہر عروج (خان پور)

اُستادِ محترم حفیظ شاہدؔ (مرحوم) کے نام

ملے جو تم سے تو اِدراک ہو گیا ہم کو
کہ حُسنِ شعر کی تکمیل کیسے ہوتی ہے
خیال کس طرح ہوتے ہیں کربلا آثار
غزل فرات میں تبدیل کیسے ہوتی ہے
تو کوزہ گر تھا، مصور تھا، ایک شاعر تھا
ترے نقوش گواہی ترے ہنر کی ہیں
سمندروں میں چھپے جیسے موتی ہوتے ہیں
قلم قبیلے میں تیرا وجود ایسا ہے
سلیقے تم نے سکھائے ہیں بات کہنے کے
ترے طفیل مرے لفظ شعر بن پائے
مرے قلم کی وگرنہ کہاں رسائی تھی
مرا شعور تھا سنگلاخ بے نمو لیکن
ترا وجود بشارت تھا آبِ زم زم کی
تُو آبرو تھا محبت کے نرم موسم کی
حسین رُت میں نومبر کے سرد موسم میں
تری جدائی کا ہم کو عذاب سہنا تھا
عروجؔ آنکھ سے اب کے
لہو ہی بہنا تھا

☆☆☆

شہباز نیّر (رحیم یار خان)

حفیظ شاہدؔ کی یاد میں

وہ ایک صحرا نورد شاعر
ہماری دھرتی کے جو سخن کا
سنہرا ابرِ کرم بنا تھا
وہ لفظ گر تھا، وہ بزمِ شعر و سخن میں
لفظوں کا اعتبار و بھرم بنا تھا
اُسے حریمِ قلم کے باسی
محبتوں کی گداز بحروں کا دلربا شخص جانتے تھے
اُسے خیالوں کے قافلوں کا
عظیم سالار مانتے تھے
وہ پختہ شاعر حفیظ شاہدؔ
چھڑا کے دامن چلا گیا ہے
وہ واپسی کے تمام امکان
جاتے جاتے جلا گیا ہے
وہ ساتھ رہنے کے سارے دعوے
وہ سارے وعدے بھلا گیا ہے
ہماری شاعر مزاج آنکھوں کو
دوستو! وہ رُلا گیا ہے

☆☆☆

ترتیب: سعدیہ وحید

تبصرے، تجزیے، تاثرات

مدیر کے نام!

السلام علیکم!

"شعور وادراک" کا شمارہ نمبر ۵ موصول ہوا جس کی رسید موبائل کی پیغام سے ارسال کردی تھی۔ کتاب اور کاغذ سے بیزاری کے اِس عہد میں اس مجلّے کا ملنا کیا تھا کہ یوں لگا کہ جیسے مسیحائی کی تاثیر روح تک پہنچ گئی اور آنکھوں کی تراوت کا عالم نا قابلِ بیان۔ شکریہ!

اس کرونا کی ماری فضا میں ایک بادِ صبا کے جھونکے یعنی مجلّہ "شعور وادراک" کے پہنچانے کا۔ سرکار سلطان باہوؒ کے کلام سے شروع ہونے والا مجلّے نے ایک الگ ہی سماں باندھ دیا۔ پھر حمد ونعت کے کیا ہی کہنے، یاور کی نعت کا یہ شعر تو یاد ہی رہ گیا:

رنج دیتا ہے کسی کو نہ زیاں دیتا ہے
وہ ایسا ہے کہ دشمن کو اماں دیتا ہے

محمد یوسف وحید کی "اپنی بات۔۔۔۔" نے اس کے عزم اور اس کی مضبوط شخصیت پتا دیا ہے کہ نامساعد حالات ہوں یا راہ کی مشکلات یہ تو رکاوٹ نہیں بنتیں بلکہ یہ تو تحرک کا موجب ہیں، محمد یوسف وحید تو واقعی متحرک انسان ہیں۔ اللہ نے اُن کو ادب کی خدمت کے لیے ویسے ہی چن لیا کہ جیسے اللہ چن لیا کرتا ہے۔ ان کی اہلیت اور صلاحیت میں کلام نہیں۔ ڈھیروں دُعائیں اور مکمل تعاون کی یقین دہانی بھی۔

خصوصی گوشہ سید محمد فاروق القادری کی بارُعب اور جاذب تصویر نے جو تاثر دیا وہی اُن کے گوشے کی تحریروں کا نتیجہ بھی تھا۔ مضمون سیدنا امامِ اعظم ابوحنیفہ کا کیا کہنا۔ شاہ صاحب کا علمی قد کاٹھ واقعی تھا کہ ان کا گوشہ ترتیب دیا جائے اور اہلِ فکر ونظر کا ان سے تعارف ہو۔ یہاں ایک اور نکتہ خاص ہے کہ جب سے ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بی ایس میں ایم فل کیے مقالات کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو اساتذہ اور اسکالرز اپنے اپنے مقالات کے لیے شخصیات اور موضوعات تلاش کرتے ہیں۔ (بحیثیت اُستاد میرے پاس بھی سوال آتے ہیں گو میں یونیورسٹی یا ایسے کالج میں نہیں) لیکن پھر بھی موضوع کی تلاش میں مدد کے تقاضے ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کے مجلّے کا یہ سلسلہ یقیناً بہت اسکالرز کی بالواسطہ مدد کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ کو جاری اور ساری رکھیے گا اور میں بھی چند اسمائے گرامی آپ کو بتاؤں گا کہ جن کا گوشہ ہم مل کر "شعور وادراک" میں لگائیں گے۔ اس سلسلے کے اہتمام پر میں آپ کی پوری ٹیم کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

مواد کے اعتبار سے آپ کا شمارہ بہت ثروت مند ہے، آپ یقین جانیے آپ کے شمارے کے موضوعاتی تنوع نے مرشد احمد ندیم قاسمی صاحب کے "فنون" کی یاد دِلا دی ہے۔ اس بات میں کوئی دو رائے نہیں ہیں کہ آپ کے

مجلہ ''شعور وادراک'' میں مواد کا معیار اور مقدار دونوں قابلِ رشک ہیں۔ یہاں میں یہ بات بھی کہتا چلوں کہ اللہ نے یہ خاص ذمہ داری آپ کو سونپی ہے اور اسی کی مددِ خاص بھی آپ کے ساتھ ہے۔

اب میں آپ کو بتاؤں کہ کشور کمار کی ''اُترن'' نے تو رُلا دیا، کہانی اختصار کے ساتھ بیان ہوئی اور ہندی الفاظ نے بھی اس افسانے کے تاثر کو چوکھا کیا۔ فن و شخصیت کے باب میں مجھے حبیب الرحمان کا مضمون سرائیکی کے ملک الشعرا، ڈاکٹر کبیر اطہر کا مضمون ''نئی جہات کا شاعر۔ شاہد ماکلی'' بہت پسند آیا، باقی مضامین بھی خوب تھے اور محنت سے لکھے گئے تھے۔ اگر خصوصی مطالعہ کی باب کی بات کریں تو افتخار علی کا مضمون ''جنوبی پنجاب میں اُردو افسانہ: رجحانات اور امکانات'' نے لطف دیا گویا یہ سندی تحقیق کے محضر پر لکھا ہے۔ مضمون اپنے لکھاری کی محنت اور سلیقہ مندی کا گواہ ہے، لکھاری کے اُسلوب نے اس مضمون کو خاصے کی چیز بنا دیا۔ راؤ مظہر الیاس کا مضمون ''معاصر شعرا پر اقبال کے اثرات'' ایک شاندار مضمون پڑھنے کو ملا، راؤ مظہر نے بڑی جاں فشانی سے ان اثرات کی تلاش کی۔ اقبال کی شاعری کے مرتبہ اثرات یقیناً لفظیات، صوتیات، نحویات اور معنیات ہر چار صورتوں پر مرتب ہوئے ہیں اس حوالے سے بھی کام کیا جا سکتا ہے، جس کو عرفِ عام اُسلوبیات کہا جاتا ہے۔ یہ ایک طے شدہ اُمر ہے کہ شعرا کا اپنے معاصر پر اور متاخرین پر بھی اثر ہوتا ہے۔ لفظیات کے اعتبار سے تو ہمارے فیض احمد فیض بھی شاعرِ مشرق کے خوشہ چین ہیں اور یاد رہے اس خوشہ چینی سے کسی بھی شاعر کا قد گھٹتا نہیں بلکہ بڑھتا ہے کہ تخلیق کار نے اپنی ادبی روایت اور اساتذہ کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ حافظہ عائشہ صدیقہ کا مضمون ''پاکستان کے لیے فکرِ اقبال کی ضرورت و اہمیت'' ایک دردِ دل سے لکھا گیا مضمون ہے، اس حوالے سے کام کی بہت گنجائش ہے، ہماری خوش قسمتی ہے کہ اب یونیورسٹیز میں پاکستان کے حوالے سے کام سامنے آنے لگا ہے، نیز یہ بھی کہ فکرِ اقبال کی تجسیم ہی پاکستان کی نظریاتی اساس ہے۔ گیریژن یونیورسٹی میں ڈاکٹر ارشد اویسی صاحب پاکستان اور مشاہیرِ پاکستان کی محبت سے سرشار شخصیت ہیں۔ علمی اور ادبی مجلہ نورِ تحقیق اعلیٰ پائے کا رسالہ ہے جہاں اس حوالے سے کام سامنے آ رہا ہے۔ عائشہ کا یہ سندی تحقیق کے تقاضوں کو پورا کرتا مضمون بہت پسند آیا ہے۔ نصرت بخاری کا مضمون ''ذاتی کتب خانے'' سے بھی خاصی معلومات حاصل ہوئیں۔ محمد حسین تسبیحی فارسی محقق نے بڑی جاں فشانی سے سارے پاکستان کے کتب خانوں کا تعارف کرایا ہے لیکن انھوں نے ان کتب خانوں میں صرف فارسی اور عربی کی قدیم کتب کی فہرست تیار کی ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کتب خانوں کا مکمل تعارف کرایا جائے اور تمام نہ سہی لیکن تحقیق و تنقید اور اسلامی تاریخ اور دینیات کی کتب کا اشاریہ تیار کیا جائے تا کہ دُور دراز کے پڑھنے والے لوگوں اور محققین کو اس مضمون اور فہرست سے رہنمائی مل سکے۔ بہر حال نصرت بخاری کا مضمون لائقِ تحسین ہے۔

ڈاکٹر حمیرا حیات کا مضمون ''ترقی پسند تنقید کا تجزیاتی مطالعہ'' کو پڑھنے سے قبل ہی ایک ذہن سا بن گیا۔ لیکن ڈاکٹر صاحبہ نے ترقی پسند تنقید کے اس موضوع کو کیا ہی خوش اُسلوبی سے برتا ہے، نہایت معروضیت سے لکھا گیا مضمون پڑھنے کو ملا ہے، لکھاری نے مضمون کو مضمون کے تقاضوں کے لحاظ سے لکھا اور ایک مکمل ترقی پسند تنقید کا خاکہ پیش کر دیا اور خود کو مضمون سے الگ رکھا ہے، یہ معروضیت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے ورنہ اس طرح

کے موضوعات کی بد قسمتی ہی یہی ہے کہ مصنف اصل موضوع پر حاوی ہو جاتا ہے اور پھر اس کا مسلک اُصل موضوع کو نقصان پہنچاتا ہے۔ گو ڈاکٹر صاحبہ کا مضمون نہایت اختصار سے لکھا گیا ہے جبکہ اس موضوع کی وسعت اور وقعت خاصی تھی لیکن اس مضمون کو پڑھتے وقت مجھے ڈاکٹر سید عبداللہ یاد آئے کہ وہ ایسے مضامین لکھتے تھے جو بالخصوص طلبہ و طالبات کے کام آتے اور مزید مطالعہ کی آمادگی پیدا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر حمیرا نے بھی اپنے اس مضمون میں معروضی انداز اپنایا اور اختصار سے لکھا۔ بہت داد اس مضمون کے لیے۔

"آؤ حجت تمام کرتے ہیں" ایک متاثر کرنے والا مضمون ہے۔ منیر انور کے تازہ لب و لہجے سے تعارف ہوا۔ سیدہ شاہدہ مبین نے بڑی محنت سے مضمون لکھا اور بھلا ہوا کہ ڈھیر مثالیں پیش کیں کہ منیر انور کی شاعری کا ذائقہ چکھنے کو ملا۔ منیر کا ہر ہر شعر داد خواہ ہے، ایک سنتے چلیں:

میرے اشعار کے جھروکوں سے..... اس کا حسن و جمال جھانکتا ہے

(ج کی تکرار نے بے پناہ لطف دیا)

مدیر مجلہ "شعور اور اک" محمد یوسف وحید کی تازہ تحقیقی کاوش "خان پور کا ادب" خان پور کی ۱۲۰ سالہ علمی، ادبی اور صحافتی تاریخ پر لکھے تبصرے اور تاثرات پڑھنے کا بھی مزا آیا اور ان اسلاف کو دلی خراج کہ جنھوں نے ایسے عظیم کام کی بنیاد رکھی اور آج ہمیں "شعور و ادراک" کی ایک مضبوط ٹیم ملی اور قلمی معاونین میسر آئے۔

حصہ شاعری بھی بہت خوب ہے خاص کر حیدر قریشی کے ماہیے، فاخرہ بتول کی شاعری بڑی مدت بعد پڑھنے کو ملی۔ باقی شعرا کلام بھی متاثر کن تھا مثلاً

عامر بھایا:

نگاہوں پر قابو، یہ قتلِ عام کرتی ہیں — کہیں بے دم، کہیں نادم، کہیں بدنام کرتی ہیں

ڈاکٹر کبیر اطہر:

خود سے فرصت ہی نہیں میسر آئی ورنہ — ہم کسی اور کے ہوتے تو تمہارے ہوتے

ثمینہ راجہ:

نئی صدی ہے اور اس کے نئے تقاضے ہیں — ہر آدمی کی ضرورت بدلنے والی ہے

فیصل عجمی:

کس امتحان میں گزری ہے رات، مت پوچھو — وہ مجھ سے آنکھ چراتا، چراغ سے میں

شاعری کا سارا حصہ بہت اچھا تھا۔ چند اُشعار لکھنے سے دوسرے شعرا پر سبقت دینا ہرگز مقصود نہیں۔ سبھی کے اُشعار نے لطف دیا۔ اللہ ترقی دے۔ آمین

بقول میر:

لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر ... شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

(شعور و ادارک کا محب... ڈاکٹر عادل سعید قریشی ایبٹ آباد۔ ایبٹ آباد پبلک سکول، ایبٹ آباد)

☆☆☆

تسلیمات!۔ عزیزم محمد یوسف وحید، مدیر: شعوروادراک خان پور

اُمید ہے آپ خیر و عافیت سے ہوں گے۔آپ نے سہ ماہی ''شعوروادراک'' کے اگلے شمارے میں استادِ محترم حفیظ شاہد (مرحوم) کے بارے میں جو گوشہ شائع کرنے کا اعلان کیا ہے وہ اہلِ خانپور کے لیے لیے شادمانی کا جھونکا لے کر آیا ہے۔ اُمید ہے اس گوشے سے اُستاد مرحوم کی زندگی کے اہم گوشے اور اُن کا غیر مطبوعہ کلام سامنے آسکے گا۔اس کے لیے آپ سلمان بھائی سے رابطہ کرتے رہیں کہ وہ اُستاد مرحوم کا کلام متعلقہ احباب سے بازیاب کرا کے آپ کے حوالے کریں۔ استاد مرحوم کو ہم سے بچھڑے سات برس ہوئے۔ اپنے وعدے کے مطابق ان احباب نے اب تک وہ کلام نہیں چھپوایا۔ وہ احباب جب چاہیں اس کلام کو کتابی شکل دیتے رہیں، اس کو چھپوائیں، اس کے مرتبین میں اپنا نام لکھتے رہیں۔ ہمیں تو یہ خوشی ہوگی کہ استاد مرحوم کا اَن چھپا کلام سامنے آ گیا۔ لیکن ان سات برسوں کے تعطل اور انتظار کو دیکھتے ہوئے کم از کم اس موقع پہ آپ کے شمارے میں اگر وہ کلام شائع ہو جائے تو نہ صرف محفوظ ہو جائے گا بلکہ اس سے حفیظ شاہد (مرحوم) کے گوشے کی افادیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا نیز استاد مرحوم کے دوستوں، شاگردوں اور پرستاروں کو خوشی ہوگی۔ میں اس میل کے ذریعے سہ ماہی ''شعوروادراک'' کے اگلے شمارے کے لیے ''میں اور استاذی'' کے عنوان سے ایک تازہ مضمون بھجوا رہا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ آپ کے لیے اور ''شعوروادراک'' کی کامیابی کے نیک تمنائیں!

(یاور عظیم۔ تلمیذِ حفیظ شاہدؔ۔ اُردو لیکچرار، ایم ٹی بی کالج، صادق آباد)

☆☆☆

''ہے کاوشِ تری صد آفرین''

''شعوروادراک'' (جنوری تا مارچ ۲۰۲۱ء)

تُو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہوا
اس اِک چراغ سے کتنے چراغ جل اُٹھے

''شعوروادراک'' کے مذکورہ شمارے کا مطالعہ کیا تو یہ کاوش کسی ایسے ہی چراغ کی مانند محسوس ہوئی۔ جہد و کوشش کے معانی و مطلب کا پہلا نکتہ بھی یہی ہے کہ ''ہمیشہ پہلا قدم اُٹھانا ہی مشکل ٹھہرتا ہے'' اور یقیناً ''شعوروادراک'' کے مُدیر نے بھی یہ قدم اُٹھاتے ہوئے کئی بار سوچا ضرور ہوگا۔ کہیں بادِ مخالف نے روکا ہوگا تو کہیں مصائبِ زمانہ نے ہتھیار پھینک دینے کی سرگوشی بھی کی ہوگی۔ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ کہیں نہ کہیں کوئی ایسا لمحہ یوسف وحید صاحب کے ذہن پر بھی نقش ہوگا۔ میری طرف سپاس تمہیدی الفاظ کا مقصد قارئین کی سوچ ''اُس ایک چراغ کی لَو'' تک لے جانا ہے۔ درحقیقت محض تعریفی کلمات تک بات محدود نہیں ہو جاتی بلکہ نصب العین کی گہرائی تک رَسائی اصل صُورت عیاں کرتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے اُردو زبان کی ترقی و ترویج کا بیڑا اُس وقت اُٹھایا جب یہ زبان آغاز کے صِفر سے پاکستان میں عام کرنا مقصود تھا اُس وقت کی مشکلات میں یہ مشکل تو نہ تھی کہ کسی اُردو زبان کے آشنا کو اُردو بولنے کی ترغیب دی جا رہی تھی اب تو المیہ یہ ہے کہ ''آشنائی کے دعوے دار بھی اجنبی بن بیٹھے ہیں'' اور اُنھیں نئے سرے سے فراموش شُدہ زبان کے حروفِ تہجی سے ہم کنار کرنا ہے۔ اس طرح کی

نازک ترین حالت میں علمی، ادبی اور ثقافتی سطح پر قومی زبان کی اہمیت بہ زبانِ قلم بیان میں لانا یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی زبان کی ترویج و اشاعت میں جرائد و رسائل نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہاں بھی ترقیٔ اُردو کی تاریخ میں جرائد نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے اور میری نظر میں اب ''شعور و ادراک'' بھی اُن رسائل کی فہرست میں شمار ہونے کے لیے بالکل تیار ہے جن کا مقصد آنے والی نسلوں کو اُردو زبان کا روشن مستقبل سونپنا ہے یا اُنھیں ایک عظیم وراثت کا حق دار بنانا ہے۔

مذکورہ شمارہ پاک وطن کی تین اہم زبانوں کے سفر پر گام زن ہے۔ محترم یوسف صاحب نے ان تین زبانوں سے انصاف کرتے ہوئے ادبی نکتہ نظر سے رسالے کا معیار بھی قائم رکھا ہوا ہے۔ مذکورہ شمارے میں گوشہ خصوصی ادبی شخصیت کے جزو میں ''قیس فریدی اور حیدر قریشی'' کے بعد ''سیّد محمد فاروق القادری'' سے مفصل اور نہایت جامع انداز میں متعارف کروایا گیا۔ کسی ادبی شخصیت کی زندگی کے ہر پہلو پر نظر ڈالنے کے لیے بے شمار کتب کا مطالعہ لازم ہوتا ہے لیکن یہاں اندازِ بیاں کچھ اس لیے بھی متاثر کن ٹھہرتا ہے کہ ایک ''شعور و ادراک'' کا مطالعہ اُس میں شامل شخصیت کے تمام تر ادبی حوالہ جات کی کامل ترجمانی کرتا ہے۔ مذکورہ شمارہ میں ڈاکٹر عمر حیات کا مضمون ''تاریخ ساز شخصیت'' صادق جاوید کا مضمون ''سرنگوں ہیں پرچم اَدب کے جہاں میں'' الفاظ کے خوب صورت چناؤ کے ساتھ سیّد محمد فاروق القادری کی شخصیت کے لیے عُمدہ خراجِ تحسین ہے الغرض اس گوشے کی زینت بننے والا ہر مضمون قارئین کے لیے سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔

مذکورہ شمارے میں ایک بار پھر ہر حصّے کی ترتیب کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ شاعری، افسانے وخاکے، فن وشخصیت اور تحقیقی وتنقیدی مضامین پڑھنے والوں کے لیے دل چسپ اندازِ بیان لیے ہوئے ہیں۔ بحوالہ ''فریدیات'' اس جزو کے دونوں مضامین مختصر ترین صُورت میں کلامِ فرید کے اہم نکات کی نشان دہی ہے۔ راکب راجا کا مضمون بھی اس شمارے کے لیے نہایت خوب صورت چناؤ ہے ''اُردو شاعری کا دبستان: ٹیکسلا'' وہ جو ٹیکسلا شہر کو محض ثقافت اور نوادرات کی علامت سمجھتے ہیں اس مضمون کا مطالعہ اب اُن کے ذہن پر شہرِ ٹیکسلا کے علمی و ادبی دریچے بھی وا کرے گا۔

میرے الفاظ سے بنتے یہ جملے طوالت پکڑتے جا رہے ہیں اگر چہ میری کوشش تھی کہ آج قصّہ مختصر ہی رہے لیکن جو پڑھا ہے وہ دل و دماغ پر اس طرح نقش ہے کہ وہ اپنی پذیرائی کی راہ از خود نکال رہا ہے اور اگر اس ستائش کا کوئی بھی جزو میرے ذہن میں باقی رہ گیا ہے تو یقیناً یہ ''شعور و ادراک'' کے ساتھ ناانصافی ہوگی' اس لیے جو کہنے کے لیے مَیں راضی تھا اُس کا بڑا حصّہ قلم کی نذر کر دیا ہے۔

میری دُعا ہے کہ یوسف صاحب کی یہ کاوش صد آفرین ہی رہے۔ خان پور شہر سے روشن ہونے والا یہ چراغ علم و ادب کے کئی چراغ روشن کرے اور اس روشنی کے سلسلے کا ہر چراغ اپنی لَو سے قابلیت کے نئے جوہر منظر پر لائے، ادب کی دُنیا کے نئے ادیب اُردو کے اُفق پر روشن چراغ بن کر صد اجگمگائیں۔ آمین

عطیہ جدون۔ (صدر: شعبہ اُردو، آرمی برن ہال کالج برائے طالبات۔ ایبٹ آباد)

☆☆☆

السلام علیکم !... محترم مدیر مجلہ ''شعوروادراک'' خان پور۔ مزاج بخیر

علمی وادبی مجلہ ''شعوروادراک''، محمد یوسف وحید کی شاندار ادبی خدمات ۔۔۔۔ ضلع رحیم یار خان تعلیمی، ادبی، معاشی اور ثقافتی لحاظ سے کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ اس ضلع میں جہاں ادبی اور تعلیمی کام ہو رہا ہے' بہترین ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ وہیں ضلع کی چاروں تحصیلوں میں مختلف شعبوں میں بہتر انداز میں کام جاری ہے اور یہاں کے رہنے والے اپنے اپنے شعبوں میں اعلیٰ نوعیت کا کام کر کے دنیا بھر میں خود کو منوا رہے ہیں۔ آج ذکر کریں کہ تحصیل خان پور کا جو اپنی زرخیزی اور زرعی پیداوار کے لحاظ سے بہترین نتائج دے رہا ہے۔ خان پور میں ادبی لحاظ سے بہت عمدہ کام جاری ہے۔ جواں سال ادیب اور ادبی رسائل کے مدیر محمد یوسف وحید مسلسل گزشتہ ۱۴ سال سے وقت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے نا صرف بچوں کے لیے ادبی کام جاری رکھے ہوئے ہیں اور ادبی ،تعلیمی اور ثقافتی محاذ پر کسی حد تک سہ ماہی ''شعوروادراک'' شائع کر کے مفید معلومات پہنچا رہے ہیں۔

علمی وادبی حلقوں میں مقبولیت کے جھنڈے گاڑھ رہے ہیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی اب انہوں نے ادبی کام کے لیے بیڑا اُٹھایا ہے۔ اُردو ادب کے علاوہ مقامی ادب کے فروغ کے لیے قلم اُٹھایا بلکہ ضلع رحیم یار خان کے لکھنے والوں کے لئے نئے مواقع پیدا کئے اور بڑی ضخامت میں ''شعوروادراک'' کے نام سے شاندار ادبی پرچے کی اشاعت کا بندوبست کر کے ادبی رزق پہنچانے کا انتظام کیا اور نئے ادب سے نئی تخلیقات سے لکھنے والوں کے لئے سامان کیا۔ ''شعوروادراک'' میں خان پور کی مختصر ادبی تاریخ (۱۹۰۱ء تا ۲۰۲۰ء) شائع کر کے نئی نسل کو ادبی تاریخ سے ہمکنار کیا ہے جو ایک بہترین عمدہ ادبی کاوش ہے۔ اس کے بعد نئے شمارہ میں ملک کے معروف دانشور اور شاعر قیس فریدی کا گوشہ شائع کر کے ایک اور بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے جس کے وہ مستحق تھے ۔ برادرم محمد یوسف وحید ادبی تاریخ مرتب کر کے خود کو ایک دانشور اور ادیب کے طور پر منوا رہے ہیں۔ جس سے محمد یوسف وحید بطور باصلاحیت ادیب اور خان پور کا ادبی نمائندہ بن کر سامنے آیا ہے۔

''شعوروادراک'' کی اشاعت ایک خوب صورت علمی وادبی کاوش ہے جو سراہے جانے کے لائق ہے۔ یہ ادب کی عمدہ و اعلیٰ مثال ہے جس میں ماضی کے نمائندہ ادیبوں، شاعروں کو نا صرف شامل کیا بلکہ آج کے ادیبوں اور شاعروں کو شامل کر کے خوب صورت کہکشاں مرتب کر دی اور یقیناً یہ بات اہلِ قلم کے دلوں تک پہنچنے کا ذریعہ بنے گی اور نئے لکھنے والوں کے لئے مشعل کا کام دے گی۔ جبکہ مجلہ ''شعوروادراک'' میں راقم کا مضمون ''ضلع رحیم یار خان میں پنجابی ادب کا جائزہ'' بھی شامل ہے۔ محمد یوسف وحید آج کا اہلِ قلم ہے اور آنے والا کل بھی اس کا ہوگا۔

ملک بھر کی یونیورسٹیوں میں تاریخی اور تحقیقی کام ہو رہا ہے اور محمد یوسف وحید ''شعوروادراک'' کے ذریعے تخلیقی کام کو آگے بڑھانے کے لیے اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ جو اُس کو تاریخ میں زندہ رکھے گا۔ محمد یوسف وحید جیسے لوگ کم وسائل کے باوجود بڑے کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آج کے الیکٹرونک میڈیا اور جدید دَور میں ''شعوروادراک'' کی مستقل اشاعت قابلِ فخر اور صد لائقِ تحسین ہے۔

(خالد جاوید، رحیم یار خان'' ریٹائر منیجر اوقاف داتا دربار لاہور)

مدیر ''شعور و ادراک''۔۔۔محمد یوسف وحید۔۔۔السلام علیکم!

شہر کے اندھیروں کو اِک چراغ کافی ہے
سو چراغ جلتے ہیں اِک چراغ جلنے سے

(احتشام اختر)

اگرچہ خان پور کی سرزمین نے دنیائے ادب میں متعدد اہلِ علم و اہلِ فن پیدا کیے مگر یوسف وحید صاحب نے کم وقت میں جو مقبولیت حاصل کی وہ اظہر من الشمس ہے۔ درج بالا شعر اُنہی پر صادق آتا ہے۔ یوسف وحید کی علمی وادبی کاوشیں قابلِ تحسین ہیں' جس طرح محبت اور جہدِ مسلسل سے ''شعور و ادراک'' کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں' جریدے کی کامیابی کا سہرا اُنہی کے سر جاتا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ''شعور و ادراک'' کی اشاعت کا پہلا سال مکمل ہوگیا اور وہ کامیابی سے شعور و آگہی کے سفر کی طرف رَواں دَواں ہے۔

حسبِ روایت جریدے کی کتابت و طباعت نفیس ہے۔ مضامین کا معیار بلند ہے۔ صوری اور معنوی اعتبار سے یہ ایک ایسا جریدہ ہے جس پر اہلِ خان پور بجا طور پر فخر محسوس کر سکتے ہیں۔ ہر نیا شمارہ گذشتہ شمارے سے بڑھ چڑھ کر ہوتا ہے۔ ''شعور و ادراک'' اُردو، پنجابی اور سرائیکی زبانوں کی مختلف اصنافِ سخن پر مشتمل علم و ادب کا ایک ایسا حسین گلدستہ ہے جس میں نامور مصنفین، صوفیا کرام اور شعراء کے کلام کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ خالصتاً ادبی مجلّہ ہے جو ہر قسم کے ''ازم'' سے پاک ہے اور کسی نظریے یا تحریک کی حمایت کیے بغیر ذاتی تاثرات اور تعصبات سے ہٹ کر معروضی انداز میں قلم کاروں کی تخلیقات کو پیش کرتا ہے۔ جریدے کے لیے مضامین اور دیگر اصنافِ سخن کا انتخاب اَہم ہوتا ہے۔ انتخاب کا کام دیکھنے میں جس قدر آسان معلوم ہوتا ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔ مسئلہ صرف مضامین اور اشعار کے انتخاب کا ہی نہیں ہوتا بلکہ مرتب کے جمالیاتی ذوق کی آزمائش بھی ہوتی ہے۔ محترم مدیر نے بڑی محنت سے تحقیقی مضامین، افسانے، انشائیے اور شعری کلام کا انتخاب کیا ہے کہ انتخاب کا معیار بھی ذوقِ مرتب کو داد دے رہا ہے۔ اس شمارے کے خصوصی گوشہ میں سیّد محمد فاروق القادریؒ جو کہ کاملین، عالمین اور عارفین کی لڑی کا گوہرِ کمال ہیں' پر سیر حاصل مضامین قابلِ تحسین ہیں جو کہ تحقیق کے طلباء کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔ طلباء، دانشور اور قلمکاروں کے قلم نئے موضوعات کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ خصوصی گوشہ میں ڈاکٹر نذر خلیق کا انٹرویو خصوصیت کا حامل ہے اس میں نہ صرف سیّد محمد فاروق القادریؒ کی تصانیف کی فہرست مہیا کی گئی ہے بلکہ اُن کے خیالات سے شناسائی بھی حاصل ہوتی ہے۔

شمارے میں شامل مضامین فکر انگیز ہیں، زبان صاف اور خیالات واضح ہیں نیز تمام تحقیقی مضامین میں حوالہ جات شامل ہیں جو کہ نہایت خوش آئند ہے۔ امین بابر کی خوبصورت نعت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شعری کلام سے شاعر کے بنیادی رُجحان اور اس کے مزاج کو پرکھا جا سکتا ہے۔ کلاسیکی المیات کے احساس کے ساتھ نئے مشاہدے اور تجربے ہیں جن کی دل آویزی قارئین کو متاثر کرتی ہے۔ شمارے میں شامل نظمیں اور غزلیں فنی تکمیل کا احساس دلاتی ہیں اور یقیناً سخن شناسوں کے حلقے میں پسند کی جائیں گی۔ ''شعور و ادراک'' میں تبصروں کو ترتیب

دینے میں کافی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا گیا ہے۔ ان تبصروں اور آراء کے مطالعہ سے قاری کے ذہن میں نئے دریچے کھل جاتے ہیں اور اسے باوثوق اور پختہ اندازِ نظر حاصل ہوتا ہے۔

'شعور کا سفر' میں محترم یوسف وحید صاحب نے تجاویز کے ساتھ قارئین کیا پڑھنا چاہتے ہیں' کے حوالے سے بات کی ہے تو گزارش ہے کہ صوفی شعراء کے منتخب کلام کے ساتھ اُن کی شرح بھی شامل کر دی جائے کیونکہ ہمارے ہاں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو قدیم زبان اور لفظیات سے آشنا نہیں لہٰذا معنی و مفہوم کے ساتھ کلام کی گہرائی تک رسائی سے مطالعہ کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔ اس سے نوجوان نسل کی صوفی شعراء کے کلام میں دلچسپی بھی بڑھے گی اور ان سے عقیدت میں بھی اضافہ ہوگا۔ آخر میں اللہ ربّ العزت سے دُعا گو ہوں کہ ''شعور و ادراک'' کو مزید کامیابیوں سے ہمکنار کرے اور اسے عروج و بلندیاں عطا فرمائے۔ آمین

(صائمہ فردوس، گیریژن یونیورسٹی، لاہور)

محترم محمد یوسف وحید۔۔۔ مدیر: شعور و ادراک خان پور

''شعور و ادراک'' کے شمارہ 5 میں چھپنے والا معظمہ شمس تبریز کا مضمون میرے سامنے ہے۔ ان کا شکر گزار ہوں کہ اُنہوں نے میری افسانہ نگاری کو موضوع بنایا اور افسانوں کے ساتھ ساتھ میرے بارے میں بھی نیک جذبات اور توصیفی کلمات لکھے۔

مجھے اُمید ہے کہ وہ مستقبل میں اُردو اَدب کی اہم لکھاری بنیں گی۔ زیرِ نظر مضمون کے حوالے سے چند اُمور کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اس سے اُنہیں مزید بہتر لکھنے کی تحریک ہو سکتی ہے۔ مضمون میں کمپوزنگ کی اَغلاط بہت زیادہ ہیں۔ اپنی تحریر کی پروف ریڈنگ خود کرنی چاہیئے۔

معظمہ بی بی نے میرے افسانوں سے متعلق جو مجموعی تجزیے اور نتائج اخذ کیے ہیں۔ وہ زیادہ تر درست ہیں تاہم اپنے موقف کو واضح کرنے کے لئے افسانوں کے اقتباسات پیش کرنے چاہئیں تھے۔ اقتباسات کے بغیر اُن کے تجزیے اور نتائج ایک فریم کی طرح لگیں گے جن میں کسی بھی افسانہ نگار کو فٹ کیا جا سکتا ہے۔ اقتباسات درج کرنے سے زیرِ گفتگو افسانہ نگار کی پہچان واضح ہو سکے گی۔

ادب میں کسی کے بارے میں تھوڑے سے وقت میں بہت زیادہ جاننے کی کوشش آج کے زمانے کی رفتار کے مطابق درست ہو سکتی ہے لیکن علم و ادب کی دنیا میں توجہ کے ساتھ پڑھنا، اس پر غور کرنا اور پھر کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کرنا زیادہ بامعنی ہوگا۔

آپ کو جو مشورہ اچھا نہ لگے اُسے چھوڑ دیں۔ آپ کی کامیابی کے لئے دُعا گو ہوں۔

ایک بار پھر آپ کا شکریہ

حیدر قریشی (جرمنی)

☆☆☆

مدیر محترم محمد یوسف وحید۔۔۔ السلام علیکم!

یہ کتب و رسائل کی اہمیت کے زوال کا الم ناک دور ہے۔ آبادی کی فزونی کے ساتھ ساتھ اُردو کے لفظ و معنی

سے شناسا لوگ کم ہوتے جا رہے ہیں۔ افراد کی تعداد بڑھ رہی ہے لیکن زبان و اَدب کا ذوق ایک خطرناک نشیبی راہ سے دوچار ہے۔ اس کے علاوہ مادیت کے حرص میں مبتلا لوگوں کا معیارِ نظر بھی ہر نئے دن پست تر نظر آتا ہے۔

یہ کوئی ڈینگ ہرگز نہیں کہ سال بھر میں تین چار ایسے نئے رَسائل و جرائد کے لیے فون بھی آتے ہیں اور پھر وہ رَسائل مل بھی جاتے ہیں لیکن ان کا ملنا نہ ملنا برابر ہوتا ہے۔ اب ہمارے ہاں چھپنے والے اکثر رَسائل کا اہم ترین مقصد خدمتِ ادب کی بجائے کسی اور ہی بات کی پر دموشن ہوتا ہے۔ یوں رسالہ بے روح ہو جاتا ہے۔ ایسے میں جب کوئی اچھی کتاب یا اچھا رسالہ دستیاب ہو جائے تو یہ اَمر مجھ ایسے کم مایہ ادب شناس کے لیے باعثِ حیرت ہو جاتا ہے۔

کچھ وقت قبل خان پور کے محمد یوسف وحید نے کمال محبت سے از خود مجھ سے رابطہ کر کے بتایا کہ وہ اپنے ادبی جریدے ''شعور و ادراک'' کا تازہ شمارہ جنوری تا مارچ 2021ء مجھے ارسال کر رہے ہیں تو یقین کیجیے میں فون سننے کے بعد ایک بار بھی اس تجسس میں نہیں رہا کہ کوئی نیا رسالہ آنے والا ہے۔

رسالہ ملا تو سپاٹ سے رویے کے ساتھ ڈاکیا سے لیا کہ لو جی گھر میں کچھ اور ''رَدی'' آ گئی۔ پیکٹ وزنی تھا سو اس خیال نے بھی کوفت بڑھا دی کہ مدیر موصوف نے دو تین کاپیاں بھیج دی ہیں۔

لیکن۔۔۔رسالہ دیکھنے کے بعد میں اپنے تمام خیالات پر کچھ شرمندہ سا ہو گیا کہ یہ رسالہ ہرگز ہرگز موجودہ زمانہ کے روایتی رسائل سے بہت بہتر تھا۔ کم و بیش 400 صفحات کی عمدہ ادبی تخلیقات کا مرقع۔ پرنٹنگ، کاغذ اور معیارِ انتخاب سب عمدہ ہیں۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی اور محمد یوسف وحید اور اُن کی ٹیم کے لیے دُعا نکلی کہ اللہ اُن کے علم، محنت، اور مال میں برکت دے اور اس زبان و ادب کی خدمت کو اُن کے لیے ثمر بار فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر عاصم ثقلین (اسسٹنٹ پروفیسر آف اُردو) گورنمنٹ ایس ای کالج، بہاول پور

☆☆☆

مکرمی و محترمی۔ السلام علیکم!

آپ کی طرف سے ارسال کردہ سہ ماہی ''شعور و ادراک'' ڈائریکٹر جنرل کی وساطت سے لائبریری میں موصول ہوا۔ یقیناً یہ رسالہ طلبہ / محققین کے کاموں میں معاون ہوگا۔ اس تعاون کے لیے آپ کے شکر گزار ہیں۔ امید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔

(محمد انور، لائبریرین، ادارہ فروغِ قومی زبان، قومی ورثہ و ثقافت ڈویژن، اسلام آباد)

☆☆☆

مدیرِ محترم۔۔۔ السلام علیکم!

مجھے بچپن سے ڈاکٹر بننے' پائلٹ' انجینئر بننے کا شوق تھا۔ مگر میں نے معدودے چند لوگوں سے یہ جانا کہ انہیں بچپن سے ادب کا شوق تھا۔ ادبی حظ کا شوق تھا۔ ادب اکٹھا کرنے کا شوق تھا۔ ادبی اور تخلیقی جہتوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دینے کا شوق تھا۔ یہی شوق ''بچے من کے سچے'' کی صورت جو گزشتہ چودہ سالوں سے ہمارے

سامنے ہے جس کے چیف ایڈیٹر حفیظ شاہد تھے اہلیانِ خان پور کی علمی ادبی، سماجی، اساتذہ، صحافی، وکلاء، ڈاکٹرز اور دیگر سینکڑوں شخصیات سے تعارف کا سبب بنا۔ بچوں کی مختصر مگر اہم کاوشوں کو اکٹھا کرنے، حُسن و ترتیب کے خوبصورت رنگوں سے نکھارنے کا شوق محمد یوسف وحید کو ادبی دُنیا میں لے آیا۔

میں کم و بیش ۲۰ سالوں سے اس بات کی شاہد ہوں کہ محمد یوسف وحید کو ادبی دنیا میں ایک کے بعد ایک قدم بڑھاتے اور اندھیرے سے اُجالے کا سفر طے کرتے دیکھا ہے۔ ہمت، عزم و استقلال، جدو جہد اور لگن کو ساتھ لیے اور اسی شوق کی راہ میں حائل تمام مشکلات کو عبُور کرتے چلے جانا محمد یوسف وحید کا ہمیشہ سے شیوہ رہا ہے۔

علمی و ادبی تنظیم ''الوحید ادبی اکیڈمی'' کے پلیٹ فارم سے جہاں اس نے اپنے ذوق و شوق کی خوب آبیاری کی ہے وہاں اسے خوب سے خوب تر کے لیے گامزن رہنے کا ہمت و حوصلہ بھی فراہم کیا ہے۔

بلاشبہ محمد یوسف وحید اپنی مستقل مزاجی اور محنتِ شاقہ کی بدولت خان پور کی ادبی فضا کو بحال اور فعال کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ''شعور و ادراک'' ضلع رحیم یار خان کا علمی و ادبی اور ثقافتی مجلہ ہے جو بیک وقت تین زبانوں اُردو، پنجابی اور سرائیکی میں علمی، ادبی، تاریخی، ثقافتی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین، افسانے، نظم اور دیگر اَصنافِ سخن میں عمدہ تخلیقات شائع کر رہا ہے۔ ''شعور و ادراک'' میں خصوصی گوشہ ''قیس فریدی''، خاص نمبر ''حیدر قریشی گولڈن جوبلی نمبر'' اور حال ہی میں شائع ہونے والا شمارے میں شامل خصوصی گوشہ ''سیّد محمد فاروق القادری'' ادب میں منفرد اور اپنی نوعیت کا بھرپور علمی و تحقیقی کام ہے۔ جس پر میں مدیر محمد یوسف وحید اور جملہ ٹیم کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ علمی و ادبی شخصیات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا یہ عمل یقیناً لائقِ صد تحسین ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دَور میں جب کتاب سے رشتہ تقریباً ٹوٹ چکا ہے ایسے میں محمد یوسف وحید کا ادب سے والہانہ لگاؤ اور ترویجِ علم و ادب کے لیے کی جانے والی کاوشیں تعریف کے قابل ہیں۔

(نصرت جہاں۔ ماہرِ تعلیم۔ سابق پرنسپل گورنمنٹ ایلیمنٹری کالج خان پور)

☆☆☆

تبصرہ: صادق جاوید (گڑھی اختیار خان) — شعور و ادراک شمارہ نمبر ۵ پر تبصرہ

عمرانیاتِ روحانی اور رجال الخیر کا مثالی پیکر... محمد یوسف وحید

علمی و ادبی مجلہ ''شعور و ادراک'' ۔ کتاب نمبر 5 (جنوری تا مارچ 2021ء)
میں شامل خصوصی گوشہ ''سید محمد فاروق القادری'' پر تبصرہ

رازہائے طبق، انوار ہائے فلک، شہکار ہائے عشق اور بازگشتِ لاحاصل کا قلق ایسے حقائق ادق قلبِ آدم میں حیرت کدہ، عیاں اور تجسس ہائے نہاں قدرتِ کاملہ کے وہ کرشمے ہیں جو اس خاک کے پتلے کو و نفخت فیها من روحی کی دل آویز نوید باکمال سنا کر قبل از یک ثانیہ نہ صرف جمادات سے یک لخت الگ کر دیتے ہیں بلکہ علم الآدم اسماء کلها ایسی رمزِ دلفریب کے بل بوتے پر نہ صرف مسجودِ ملائکہ قرار دیے دیتے ہیں بلکہ حیرتِ حیراں کو بھی از خود جواب دیے دیتے ہیں۔

مفہوماً الانسان سری و انا سرله تو ایک عارف کو شرحِ حقائق کے لیے مندرجہ ذیل الفاظ کو افضل ترین شعور کی افضل ترین لڑی میں پرونے میں سہولت کار کا کردار بدرجہ احسن میسر آ جاتا ہے کہ

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

قارئین کرام! اس مرحلے پر ہم آپ کی خدمت میں عطائے ربّ کی اور قسمت کی یاوری کے اتصال کی پروردہ، احمد بلا میم (م) اور احد با میم (م) کی ذرہ نوازی پاک پنجتن کی اُتم غم سازی۔ھم و ھم سر من کنت مولا کی لاج داری، کلنا محمد سے قلبی ربط داری، رجال لا یحزنون کی ادائے داس داری، مریدی لاتخف کی خبرداری، خصوصاً مشائخ شاہ آباد شریف کی پاک نعلین برداری اور اپنے مرشدِ من کی من داری کی نسبت سے محصولہ زنبیلِ معمور اور تطلیقِ مامور سے اشغالِ روحانی سے ایک حرزِ یمینی و ذریمانی حوالہ سماعت کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔

عطا کی آرزوؤں کو آسانیاں اُچھال دیتا ہے
مت دیکھو کون کہہ رہا ہے؟ بس دیکھو کیا کہہ رہا ہے

مندرجہ بالا چند سطور اُصولِ آمادگی کے تحت آپ کی توجہ آمدہ اصلاحاتِ ثلاثہ پر مبذول کرانے کو معرضِ تحریر میں لائی گئی ہیں۔ جن کو نہ صرف بہ اذن ہائے دل حرز سماعت کرنے کی اشد ضرورت ہے بلکہ یہ باور کرانا بھی

مقصود ہے کہ اگر ہم سعی لاحاصل کے مرتکب ہوئے تو اپنے تمام خاکم بدہن نہ صرف نصف شی جنبش قلم اپنے تمام ترمحرکات سمیت اکارت جائے گی بلکہ ہاتھ لگیں گے وہی ڈھاک کے تین پات یعنی

خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

نہ صرف قاریِ ذی حشم بلکہ یہ خادمِ قلم بھی وہی راگ الاپنے کے سوا چارہ نہ پائے گا کہ

تم اک گورکھ دھندا ہو

قارئینِ ذی وقار! قسمت، یاوری اور آپ کی عقل سلیم کو فیصل مانتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ

تھی انا الحق مگر منصور کو کہنا نہ تھی
یار کی محفل سے باہر یار کی محفل کی بات

طشت از بام کیے دیتے ہیں کہ مذکورہ بالا اصلاحاتِ ثلاثہ بالترتیب ہیں

خیر بشرؐ......ابوالبشر......بشر

یاد رکھیں یہ اصلاحات سلسلہ در سلسلہ بلاشبہ فیوضِ اظہر و ابطن کی قاسم، قسیم و مقسوم ہیں۔

کہنے کو نعت سرورِ عالی وقار کی
منہ میں زبان چاہیے پروردگار کی

الغرض بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر، روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ فضائل ہم قسم کو لذت اسیریٔ سے نوازنے کے لیے مراقب حرا کرم فرمائے۔

از حد عظیم ذاتِ کریم اور یثرب کے دُرِ یتیم کے سوا کسی کی ذیشانی پہ راضی نہ زلف دگر کی اسیری وا یاری کو قبولتے ہیں۔ نہ چکا چوند عالم درخورِ اعتنا مانتے ہیں بلکہ قلبِ مضطرب کی کائناتی ہمنوائی میں زلف و اللیل کے اتم دلکش پیچوں کا قصیدہ فقط اس انداز میں سنانا جانتے ہیں کہ

واحسن منک ولم طرقط عینی
واجمل منک لم تلد النساء
خلقت مبرء امن کل عیب
کانک قد خلقت ماتشاء

معراج کمال پر فائز اس قطع کے بہت سے منظوم تراجم بھی فدایانِ جمال کے سہولت کار ثابت ہو چکے ہیں۔
ہم شاہد فاروق کا ترجمہ آپ کی نذر کرتے ہوئے تقدیم الی الخیر کی سعادت حاصل کیے جاتے ہیں۔

نہ دیکھا میری آنکھوں نے کوئی تم سا حسیں جاناں
صدف نے تم سا اگلا ہی نہیں دُرِ ثمیں جاناں
تمہیں پیدا کیا ہر عیب سے یوں پاک فرما کر
کہ جیسے اپنی مرضی سے بنے ہو نازنیں جاناں

وجہ وجودِ کائنات ، محبوب ذات فی ذات
اصلِ حیات و کل حیات مشکل کشائے ہر جہات

☆☆☆

نگینے بکھرتے رہے جس کے کل پرتو زمانی و مکانی
حدود و قیود سے بے نیاز مسابقت کے خواہاں ازلی رہے

☆☆☆

عرش است کی پائے ز ایوان محمدؐ
جبریل امیں خادم و دربان محمدؐ
(سعدیؒ)

☆☆☆

فدائے نقشِ نعلینت کنم جاں یا رسول اللہ
جو سر پہ رکھنے کو مل جائے نعل پاک حضورؐ
(حضرت جامیؒ)

☆☆☆

اتھاں میں مٹھڑی نت جاں بلب
اُتھاں خوش وسدا وِچ ملک عرب
(خواجہ غلام فریدؒ)

جس دن سے سے تیرے کوچے میں سویا ہوں خاک پر
میری ہے گویا عرش پہ بستر لگی ہوئی
تنہا فرید کو نہیں روح الامیں کو بھی
ہے خاک تیرے تلووں کی منہ پر لگی ہوئی
(خواجہ غلام فریدؒ)

ماسلطنت بکوچۂ جاناں فروختیم... مور حقیر راہ سلیمانی فروختیم
(خواجہ محمد یار فریدیؒ)

قسمت جو یاوری کرے بن جاؤں گردِ راہ
پھر قطب چومتا چلوں ان کی رکاب کو
(خواجہ قطب الدین فریدی)

مندرجہ بالاسطور میں ہم نے کشش عکس جمالِ حق کی جھلک پیش کرنے کی سعی سعادت فزا کی ہے۔
ورنہ الحمدللہ اتنی آشنائی ہے کہ

ذکرِ یار آخر نہ شد شب آخر شد

بلکہ ہمارا وجدان کہتا ہے کہ

عمر ہا آخر شد

عزیزانِ ذی وقار! مذکورہ اصطلاحی مثلث کے اشہب خیال کو مہمیز کرنے سے پہلے آپ کو حکم روحانیت کا یہ نکتہ آپ کو یاد دلانا قرینِ قلب معلوم ہوا ہے کہ

چشمِ اظہر کے لیے تو اس عالم بے ثبات کی چکا چوند پادشاہی اور بے وقعت کروفر کو درخورِ اعتنا لانے کی ہزاروں سبیلیں نکل سکتی ہیں۔ جس کے تمثیلی و عارضی خاکے کا منہ حضرتِ غالبؒ کچھ اس طرح منہ چڑانے میں کامیاب رہے ہیں اور خوب رہے ہیں کہ

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

ہاں مگر ایسا نہیں ہے کہ اس کا کوئی مثبت پہلو سرے سے ہے ہی نہیں بلکہ ہے اور یقینی ہے۔ مظفر وارثی نے یہ فرما کر فلسفہ اور روحانیتِ اتصال کی بہترین صورت میں داغ بیل ڈال دی ہے۔

کوئی تو ہے جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے وہی خدا ہے جو دن کو رات اور رات کو دن بنا رہا ہے وہی خدا ہے

حُبِ حضور تو شرطِ ایمانی ٹھہری آلِ اطہار کے صدقے میں اللہ والوں سے قلبی لگاؤ، مرشدِ کریم کی نظرِ کرم کا خصوصی تحفہ ملا ہے۔ تحدیثِ نعمت کے فریضۂ برتریں کی ادائیگی کے تقاضے نبھاتے ہوئے آپ کے سامنے حرزِ جان بنانے کے لائق الفاظ آپ کی نذر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اس آگاہی کے ساتھ کہ

جے یار فرید قبول کرے سرکار وی توں سلطان وی توں

نتاں کہتر، کمتر، احقر، ادنیٰ لاشے لا امکان وی توں

ایک وقت میں ساری دنیا میں غوث۔ ایک، قطب۔ چار، اوتار۔ چھ، ابدال۔ چالیس اور اولیائے کرام تین صد رہتے ہیں۔ دنیا کا سارا انتظام و انصرام ان ہی کے حوالے رہتا ہے۔ جن کا منشور کل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین ہوتا ہے، جس سے وہ نہ ذرا برابر ہٹتے ہیں، نہ گھٹتے ہیں۔ یہی وہ نفوسِ قدسیہ ہیں خیر بشر کے معنوی تسلسل ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہی نورانی تسلسل جس کے ڈانڈے صفہ کے نظامِ فیض رساں سے ملتے ہیں جس کے حصار میں چہار دانگ عالم کی صدری، قولی و عملی تربیت ایسے چراغ روشن ہوئے جن کی ایمان افروز کرنیں عرب و عجم کے ساتھ ساتھ دنیا کے ہر کونے میں آباد افرادِ عالم کے سینوں کو لگاتار منور کرتی چلی گئیں۔ جو قرنوں سے جہالت کی شب تیرگی میں گم کرتا رہا اور اپنی مقسومی زبوں حالی کا نوحہ یوں پڑھ چکے تھے۔

چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسیٰ ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا

ابتداء میں متذکرہ عمرانی و روحانی مثلث کے کردارِ ثانی ابو البشر کی جملہ کہانی۔ اثبات اور نفی، خیر اور شر الغرض۔ ادب و آداب، تسلیم و رضا، حاصل و لا حاصل سے عبارت اس انقلابی و اصلاحی قصے میں وجودِ شہر اور احساسِ زیاں کے ذریعے اصلاحِ احوال کا درس موجود ہے۔ جس میں پچھلی قومیں اکثر ناکام رہیں لیکن ملتِ مسلم

کی باری آئی تو اس شعر کے مصداق کایا پلٹ ہوگئی کہ

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا جو نکتہ وروں سے حل نہ ہوا وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

ازل سے ابد تک میں سے وہ تریسٹھ (63) برس جنہیں نبی اکرم کی نسبت سے بہترین دَور قرار دیا گیا ہے۔ حیاتِ مبارکہ کی ظاہری تکمیل کے بعد نبوت کا سلسلہ رک گیا لیکن اصلاح احوال کا مشن آئمہ، اصحاب عظام سے ہوتا ہوا اولیائے کرام اور صوفیا حضرات تک پہنچا۔ جسے ستاروں سے منور و مزین کہکشاں کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ جس کے نورانی فیض سے ارض خدا کا چپہ چپہ ضیا بار رہا۔

عرب، عجم، ہند، سندھ، پورب، پچھم، اتر، دکن میں جہاں جہاں نمود پائی وہ مقام اللہ والوں کے قدموں کی برکت سے عیون نور قرار پائے اور وہ برگزیدہ ہستیاں روحانی طبیب ثابت ہوئیں جنہوں نے ابوالبشر کے تسلسل دمن منشرہ کے پروردہ، قلب آزردہ کے غم اندوہ کو دستِ شفقت اور نظرِ کرم کی اثر آفرینی سے پل بھر میں کافور کر دیا۔ بارانِ نور کے یہ سلاسل صوفیا سے موسوم ہوئے اور دوائے دل بانٹتے ہوئے وہ طبیب کے اسمائے گرامی سے موسوم ہوئے۔

سلسلہ عالیہ قادریہ بلاشبہ منفرد واضح اور قانع مقام و منشور رکھتا ہے۔ جس میں اصلاحِ باطن سمیت مجموعی و اخروی فلاحِ انسانیت کو فوقیت حاصل ہے۔ جس میں اعمال و اشغال تزکیہ کے اطوار کڑے ضرور ہیں مگر قرب و قبول کی خاصیت نہایت واضح اور بدرجہ اتم رکھتے۔ جس میں مریدی لاتخف کا مژدہ جاں فزا کی افادیت موج سل سبیل سے کسی طور کم نہیں ہے۔

عظیم روحانی آبشار کے ایک دھارے نے ضلع رحیم یار خان تحصیل خانپور کے مغرب میں تقریباً پندرہ کلومیٹر پر موجود تاریخی مگر عرصہ دراز سے سامراجی قوتوں کے نرغے میں خود غرضی کی عفریت عفریتی پاٹوں میں پسے قصبے گڑھی اختیار خان سے اٹھتی صدائے العطش کو شرف قبولت بخشا۔

دل کی دنیا کو حسن اخلاق صدری قوت اور وصفِ کرم کی معجزہ نمائی سے بدل کر رکھ دینے اور چشمِ عنایت کی وردانی تاثیر سے قلوب واذہان کی کایا پلٹ ماہر اعظم اس وردانی و روحانی دھارے کو مشائخ شاہ آباد شریف کے نام نامی اسم گرامی سے جانتی ہے۔ شاہ آباد شریف گڑھی اختیار خان سے مغربی سمت تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر پر موجود اللہ والوں کی بستی کا نام ہے جس میں اس شعر کو پیکر تمثیل و تسلیم میں ڈھالنے میں اپنے حصے کا کردار نہایت رمزیت، دلیری اور خوش اسلوبی سے ادا کیا کہ

نگاہِ ولی میں وہ تاثیر دیکھی بدلتی ہزاروں کی تقدیر دیکھی

راقم الحروف کا وجدان کہتا ہے گڑھی اختیار خان روحانی طور پر کبھی بھی بے فیض نہیں رہا ہوگا اس کا نام ہی نہایت خدا رسیدہ اور اپنے وقت کے الٰہی طبقے کے سرخیل حاجی اختیار خانؒ سے منسوب ہے جو ظاہراً ملتِ عباسیہ مگر باطناً ملت لاصفیا کے مشاہیر و سفیران میں نہایت چمکتے دمکتے ستارے کی مانند ہیں۔

گڑھی اختیار خان یونین کونسل میں سلسلہ سہروردیہ کے مشہور عالم بزرگ حضرت شیخ عبدالستارؒ کا مزار مبارک بھی صدیوں سے اخفا و اظہر حوالوں سے سکون قلب کے متلاشیوں کا مقام مطلوبہ بنا ہوا ہے۔ گیارہ شہید ولی کامل

حضرت شاہ محمد فقیرؒ کے مزار مبارک سمیت کئی دیگر مقدس مزارات بھی اسی کی حدود میں روحانی مطب کا کردار ادا کررہے ہیں۔

حاجی اختیار خانؒ کا مزار بھی اپنی مثال آپ ہے۔ ساتھ ہی بلبلِ باغ فرید حضرت خواجہ محمد یار فریدیؒ ایسے عاشقِ رسولؐ، خطیبِ محبت، صوفی شاعر اور حضرت خواجہ غلام نازک کریم کے مزارات مبارک یادالٰہی کے مسلم مرکز مانے جاتے ہیں جسے حضرت خواجہ غلام قطب الدین فریدی کی دوراندیشی، محنت نے تصوف کا عالمی مرکز منوانے میں اپنا کردار خوب نبھایا ہے۔

مگر علم وفضل، تقریر وتحریر، رشد وہدی، درس وتدریس، افکار واشغال کو قلبی فتوحات کا ذریعہ بنا کر تسخیرِ قلوب کے جو کرشمے شہرہ آفاق کے جو کارنامے مشائخ شاہ آباد کی فہم وفراست، باطنی توانائی، کامل وجاہت اور حسنِ اخلاق نے نہ صرف مقامی وملکی بلکہ بین الاقوامی سطح پر کردار سازی و نیک نامی کے جھنڈے گاڑھے ہیں وہ رہتی دنیا تک خراج تبریک وصولتے رہیں گے۔ دوائے دل کے نسخہ ہائے کیمیا کے موجودہ محافظ اس طائفہ روحانیہ نے دینِ متین کی خدمت اور ساغر صدیقی کے قلم سے تڑپتی روحوں کی ترجمانی میں اٹھی ہوئی اس قرینِ حقائق صدائے دلخراش کی دادرسی کے لیے ازعرب سوئے عجم رختِ سفر باندھا کہ

پلا ساقیا کوئی جام غزالی بھٹکتی بصیرت لہو رو رہی ہے

اس فیض رساں بابرکت سفر میں نمایاں سنگ ہائے میل بخارا، اچ شریف، گجرات، لاہور، ملتان، ہندوستان اور شکار پور میں گڑھی اختیار خان سے قبل ڈیرہ گبولہ بھی قابل ذکر ہے۔

قسامِ دولتِ درد، شرارۂ عشق کے اشارہ کناں اور طبیبانِ روحانی سے بھی اس کہکشاں کے تابندہ ستاروں کے اسمائے گرامی ہیں۔

جنیدِ زماں، سید العارفین حضرت مخدوم سید جلال الدین سرخ پوش بخاریؒ، آپؒ کے لختِ جگر حضرت مخدوم سید احمد کبیر بخاریؒ، ان کے فرزند ارجمند حضرت مخدوم سید جلال جہانیاں جہاں گشت اور ان کے فرزند ثانی حضرت مخدوم سید صدر الدین راجو قتالؒ۔ حضرت سید محی الدین عبید القادریؒ، آپؒ کے فرزند قدوۃ الاولیاء حضرت سید جعفر شاہ بخاری سہروردی قادری جو مشائخ شاہ آباد شریف میں فردِ اوّل واعظم ہیں۔ آپؒ کے بعد آپؒ کے فرزندِ ارجمند نامور عالم دین برہان الدین حضرت سید سردار احمد القادریؒ آپ کے فرزندِ ارجمند، عربی، فارسی اور اُردو کے عظیم صوفی شاعر، جس کے روحانی عطاروں میں صوفی شاعر اور عالمِ دین حضرت پیر الحاج سیّد محمد سیف الدین مغفور القادریؒ، حضرت پیر سیّد بہار علی شاہ القادری، حضرت علامہ پیر سیّد مظفر علی شاہ القادری کے ساتھ ساتھ ایک ایسی علمی روحانی وادبی شخصیت جو کسی تعارف کی محتاج نہیں بلکہ ایک لحاظ سے یہ پورا خانوادہ ہمیشہ کے لیے اسی شخصیت کے نام اور کام سے پہچانا جائے گا۔ اس کارِ سعادت میں پیش پیش ہیں۔ مری مراد آبروئے قلم، موقرا لمحققین اور جانبازِ سادات حضرت علامہ پیر سیّد محمد فاروق القادریؒ ہیں۔

نیز خان دانِ کوریجہ کے مقبول بارگاہ بزرگوں کا مسکن ہونے کا شرف بھی گڑھی اختیار خان کو حاصل رہا ہے۔ حضرت خواجہ نُور محمد کوریجہ جنہیں عوام ''حضرت نُور پاکؒ'' کے نامِ نامی سے یاد کرتی ہے۔ حضرت خواجہ گل محمد سمیں

المعروف بدھن سئیں کوریجہ کے علاوہ ہم نے بزرگوں سے دیگر بہت سے بزرگوں کے دم قدم سے مقبولانِ بارگاہ اُولیائے کرام کے بارے میں سُنا ہے جن کے دم قدم سے رونما ہونے والے فیوض و برکات کے تذکرے زبانِ زدِ عام ملتے ہیں۔ حضرت خواجہ دُرِ محمد کوریجہ، حضرت خواجہ محمد یار فریدی، حضرت خواجہ غلام نازک کریم نے جس فیضانِ کرم کی ترسیل کا حق اُدا کیا ہے۔ اس کی تاریخ بہت قدیم ہے جب کہ بہارِ چشت کے فاضل مصنف نے حضرت خواجہ محمد یار فریدیؒ کی آمد سے پہلے اس سرزمین کو بے آب وگیاہ کیوں لکھا؟ جواب تو شاید دبا ید مگر بہت سے سوال جنم لینے کو بے تاب نظر آتے ہیں۔ بہر حال گڑھی اختیار خان کی فضائیں جن شخصیات کے احسانات کو اُتارنا تو در کنا شمار کرنا بھی ناممکن پائیں گی ان ہی میں سے ایک سیّد محمد فاروق القادریؒ بھی ہے اور نام بھی کافی ہے۔

آپ نے علوم کو حق الیقین سے ہمکنار کر کے تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کیا تو محققینِ عالم نے اپنی راہیں متعین کرنے کا جواز تلاش لیا۔ تقریر و تحریر کا میدان ہو یا فکری مباحث کی محافل آپ کی رائے ہمیشہ حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ آپ نہایت حلیم الطبع مگر جلالی کیفیات سے وقارِ سادات کے امین نظر آتے تھے۔ باتوں سے دل موہ لینے میں بھی ماہر اور ضروری تجر میں بھی تیز گام رہتے تھے۔

مگر تبلیغی مقاصد کے لیے بندگانِ خدا کو کشش کرنے میں بھی لاثانی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ہاں مگر تصرفِ روحانی سے سیکنڈ سے بھی قبل فیصلہ فرما لیتے تھے کہ جوہرِ مطلوبہ سے محروم اَفراد جاتے نہ دِکھتے تھے۔

سیرت و اَخلاق آپ کا من پسند موضوع رہا ہے اور مقالہ نویسی میں جو مقام آپ نے حاصل کیا اس کو بڑے بڑے فکری ڈاکٹر بھی ترستے رہ جاتے ہیں۔

اس کریم گھرانے سے محبت کرنے والوں کی بے شمار تعداد میں راقم الحروف کے دادا دادی، نانا نانی، والد اور والدہ کی والہانہ محبت بھی دیدنی رہی ہے اور قابلِ ذکر ہے یہ ناچیز گلزارِ محمدی کے اس وردہ یگانہ کی اُلفت کا اَسیر بھی ہے اور شرفِ ارادت سے امیر بھی ہے۔

سادگی میں کمال رکھنے والے اس فخرِ سادات مرشدِ کریم کی عوام الناس سے مثالی شفقت دیکھ کر اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ مردِ درویش فتوحاتِ ملکیہ ایسی اُدق علمی سلطنت کو طشتِ ازبام کرنے پہ تلے گا تو شارحینِ اَسلاف کو ورطہ حیرت میں ڈال دے گا۔ ملک عزیز کی زبوں حالی کو ”اَصل مسئلہ معاشی ہے“ کا نادر نمونہ دان کر دے گا۔

معرفت کے تار چھیڑے گا تو انفاس العارفین کو دامانِ عافیت نصیب ہو جائے گا۔

چمن میں دیدہ ور کا تصور کرے گا تو ایسے علمی جواہر پارے قرطاس وقلم کی جادوگری کے پلڑے میں ڈال دے گا کہ جس پر مقامی ملکی اور بین الاقوامی اداروں کی حل من مزید کو قرار ملے گا حتیٰ کہ جامعتہ الازہر مصر کو بھی آپ کی کتابوں کو شاملِ نصاب کرتے ہوئے فخر و انبساط کا اُحساس ہو گا۔ عالمی شہرت یافتہ صوفی اسکالر حضرت خواجہ غلام قطب الدین فریدی فرماتے ہیں کہ میں جب جامعتہ الازہر مصر میں لیکچر کی غرض سے پہنچا تو دل میں ایک مُسرّت محسوس کر رہا تھا اور یہ مسّرت اس وقت مزید بڑھ گئی جب سیّد محمد فاروقؒ القادری کی کتابیں اور عقیدت مند مجھ سے پہلے وہاں موجود ملے اور میری توقیر میں بھی اضافہ ہوا کہ میں آپ کے قصبے سے آیا تھا۔

حضرت پیر علامہ سید محمد فاروق القادریؒ کی قلمی وقلبی فتوحات نے علمی، ادبی، روحانی، معاشی حوالے سے نہ

صرف نا قابلِ فراموش تاریخ رقم کر دی ہے بلکہ روحانی وعصری تعلیم کے تمام تر تقاضے نبھاتے ہوئے ایک عظیم الشان ادارہ تعلیماتِ اسلامیہ اور منظم ترین خانقاہی نظام کے ساتھ ساتھ اپنی دُور اندیشی کو مزید دُور رس کرنے کے لیے نہ صرف رسم باقی باللہ گری ادا کر دی بلکہ راقم الحروف کے ایک قلبی واردات کے نتیجے میں برآمد ہونے کا اعزاز بخش دیا۔ یہ الفاظ حضرت خواجہ محمد یار فریدی کمپلیکس میں تصوف کے حوالے سے ایک عظیم الشان محفل میں اس ناچیز کی تقریر کے دوران ملنے والی پرچی کے جواب میں بے اختیار برآمد ہوئے تھے۔

جی صاحب تاریخ میں کن ابی فذو اور باقی باللہ بنانے کی رسم بھی محفوظ ہے۔ مرے مرشد کریم (حضرت سید محمد فاروقؒ القادری) کے پاس یہ قوت اختیار ہے جب بھی چاہیں گے یہ حق استعمال فرمالیں گے۔ الحمدللہ تینوں مرشدزادے امین امانت اور فخر اسلاف ہیں مگر اس ناچیز کے وجدان کے مطابق مرشد کریم نے حضرت پیر سید صبغت اللہ سہروردی پر رسم باقی باللہ گری کا نہایت کامیاب تجربہ فرمایا ہے۔

کسے کہ حسن رخِ دوست در نظر دارد — محقق است کہ او حاصلِ عمر دارد

متذکرہ بالا روحانی ہستیوں سے حسبی، نسبی، قلبی و کسبی ربط کا شرفِ اعزاز پانے والوں کو رجال الخیر کہا جاتا ہے۔ جن کا ایک مثالی پیکر محمد یوسف وحید ہے جو شعور وادراک کی شمع جلائے اس کی کرنوں کی ترسیل کے لیے نہ صرف مقامِ مطلوبہ تلاشنے بلکہ دیپ سے دیپ جلانے میں ہمہ وقت مصروف نظر آتا ہے۔

اصلاحِ احوال کے مشن میں آقائے نامدارؐ کے نعلین مبارک کا لہو سے بھر جانا اس سفر کی کٹھنائیوں کی بہترین مثال ہے اور دیگر بھی کئی ایک ہیں مگر یہ تو آپ بہتر جانتے ہیں کہ یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہر کوئی ایک کردار ہے۔ عالمِ کردار کا یوسف کب اور کیونکر لیلائے ادب کا قیس بن گیا اس راز کو ہم بعد میں طشت از بام کریں گے تا کہ اس میدان میں نوواردوں کو ایک سچے اور کھرے رول ماڈل سے آشنا کر دیں۔ اس سے قبل تمام علمی، ادبی اور روحانی برادری کی ترجمانی کرتے ہوئے اس یوسفِ کردار اور قیسِ ادب کی خدمت میں نہایت خلوص کے ساتھ ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں کہ جس نے حضرت قبلہ علامہ پیر سید محمد فاروق القادریؒ ایسی عبقری زماں شخصیت کی علمی، ادبی اور روحانی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا نہ صرف احسن فیصلہ کیا بلکہ نہایت جانفشانی سے موسم کی شدت، سورج کی تلخی اور خصوصاً کرونا ایسی آسمانی آفت کے ہوتے کہ جس نے نہ صرف دورِ حاضر کی سب سے بڑی حقیقت قحط الرجال کو نہ صرف قحط العوام میں بدل کر رکھ دیا ہے بلکہ ہماری سماجی وثقافتی سرگرمیوں کے سارے حسن کو ماند کر کے رکھ دیا ہے۔ الغرض گونا گوں مشکلات کا سامنا کیا اور ادب کی خدمت کو فوقیت دی۔ اللہ کریم نے بھی اپنے پیاروں کے طفیل محمد یوسف وحید کو ہزاروں پر فوقیت دی اور وہ اس طرح کے ایک ولی کامل کے تذکرے سے مزین خصوصی گوشے کو اپنے اندر سموئے ہوئے ''شعور وادراک'' کے اس خزینے کا نمبر ہے 5 اور آپ جانتے ہیں جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ اصل میں کائنات کا انتظام وانصرام روحانی ہستیوں کے دم قدم سے چل رہا ہے تو یقیناً اس فخر سادات کے تذکرے اور اس کے ذریعے ترسیلِ پیغام کے لیے سہولت کاری کی توفیق پر محمد یوسف وحید کو انعام وفیض ملے گا کیونکہ

جہانِ فیض میں حاصل اسی کو پھول ہر دم ہیں — کہ بندے جو بھی خدمت میں سراپا دھول ہر دم ہیں

بہر طور یہ ایک مشکل امر تھا جو اللہ کے کرم اللہ والوں کے تصرف اور خلوص و جانفشانی سے نہ صرف مشرف بہ تکمیل ہوا بلکہ ایک عظیم ادبی و روحانی پروجیکٹ کی داغ بیل بھی ڈال گیا جس کی نوید اسی گوشے کے دوسرے مضمون ''صحبتِ یار آخر شد'' میں حضرت سید صبغت اللہ سہروردی سنا چکے ہیں۔ گوشے کے حسنِ ترتیب اور افادیت پر بات کی جائے تو نہایت خوشگوار مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ جس میں اوّلیت اس حقیقت کو ہے۔ جس میں دُھن کے پکے محمد یوسف وحید نے نہ صرف اس نعرۂ مستانہ کو حقیقت میں ڈھال دیا کہ

رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی

بلکہ کچھ ایسی ادبی خدمت بھی کر لی جو ناممکنات میں شامل رہی تھی۔ اس کا ایک پہلو نئے لکھاریوں کی تلاش ،ملاقات اور حاصلات کا مرحلہ خوش اسلوبی سے طے کر لینا ہے۔ یقیناً اس گوشے میں بڑے جلیل القدر، رجال الخیر کے قلمی کارنامے موجود ہیں مگر پروفیسر سراج احمد قریشی صاحب، استاد محترم جناب فیاض احمد صاحب، استاد محترم جناب محمد رمضان صاحب اور راقم الحروف کے دیرینہ دوست جناب محمد مزمل خان صاحب سے تحریریں لکھوا لینا اس قیسِ ادب کا ہی امتیاز ہے کیونکہ یہ حضرت اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت کے سبب وقت ہی نہیں نکال پاتے ہیں۔ جس تک قارئین کی رسائی محمد یوسف وحید کے ذریعے ہوئی ہے۔ یہی بنیاد بنے گا اور یہ صدقہ جاریہ جاری رہے گا اور وقت کے مؤرخ کو ماننا پڑے گا کہ

جب کبھی راستہ حالات کا دھندلایا ہے کام آئی ہے زمانے میں ضیائے درویش

مجموعی طور پر علمی و ادبی مجلّہ ''شعور و ادراک'' کا سلسلہ اشاعت نمبر 5 'دستور سے بڑھ کر بھانت بھانت کے سبق آموز ادبی، علمی اور روحانی نگینوں سے سجی ہے۔ جو برکت ہے عدد پانچ کی جس کی روحانی نسبتوں اور برکتوں سے انکار گویا کتاب ناممکنات کا سرنامہ ہے۔ اہلِ فن حضرات خوب جانتے ہیں کہ غزل کی ردیف میں شاعر کے اندر سے انسان کا ایک روپ کارفرما نظر آرہا ہوتا ہے جو کہ اس کی حساسیت اور قوتِ مشاہدہ کی بدولت سیرانی جہاں بن کر اپنے باطنی سفر کی داستانوں کے الگ الگ عنوانات کو الگ الگ ردیف میں پروتا جاتا ہے مثلاً کسی غزل کی ردیف دل ہے تو ہمیں یہ سمجھنے میں بالکل دیر نہ لگے گی کہ اس میں شاعر نے دل والوں کی بستی کے احوال و آثار کی کہانی سنائی ہے۔ جس کا ہر شعر دل کی مخصوص واردات کے استحضار کا بہترین نمونہ لیے ہوئے ہے۔ بعینہ ایک نثر نویس حسنِ ترتیب میں عنوان بندی سے ردیف والا ہی کام لیتا ہے۔ ایک مہا عنوان کے تحت اس سے متعلق عنوانات پھر ہر عنوان پر مختلف مضامین، مصنفین کے حفظ و مراتب کے تقاضوں کو نبھانے کی پوری کوشش کرتا ہے اور اگر وہ لیلائے ادب کے قیس بے مثال محمد یوسف وحید کی طرح تسخیر قلوب کا منتظر پڑھ چکا ہوتا ہے جس کی تاثیر فہرست پر پڑی نظروں کو اس جہانِ خاص کی سیر کروا کے ہی دم لیتی ہے جس سے آج تک وہ گزرا تو ہوتا ہے مگر دیکھ نہیں پایا ہوتا۔

راہ گزر کے چراغ ہیں ہم لوگ آپ اپنا سراغ ہیں ہم لوگ

ہم نے اپنے آج کے ممدوح محترم قیسِ ادب مدیر مجلّہ ''شعور و ادراک'' محمد یوسف وحید کی ادبی فتوحات پر تمام ترجمان ادب کی ترجمانی کرتے ہوئے کھلے دل سے ہدیۂ تبریک پیش کرنے اور خود چنے کام کی کٹھنائیوں

کے سامنے عرق ریزی، جانفشانی، خودفراموشی اور اپنے آپ کو وقف پراپرٹی سمجھ لینے والی اس کی اداؤں کو خراج تحسین پیش کرنے کی مقدور بھر جسارت کا تانا بانا ہی "خیر" کے تارلازوال سے بُنا ہے' اخلاص کو امام مان کر حسنِ عمل دمکتے موتیوں میں پروتے گئے ہیں۔

ہم الرجال الخیر کی تسبیح کس حدتک مکمل کرنے میں کامیاب ہوئے اس کا فیصلہ آپ پر ہے۔ آپ کی سہولت کے لیے کتاب نمبر 5 میں "شعور وادراک" کا ایک پرتو دکھائے دیتے ہیں۔ آپ دیکھیں کہ فلاح انس واجب کے کتنے پہلو کتنی نفاست سے پروئے گئے ہیں اور کتنا وسیع ترعلمی، ادبی وروحانی معلومات کو ابلاغ کی سہولت دان ہوتی چلی جارہی ہے۔ القصہ محمد یوسف وحید الرجال الخیر میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

حسن ترتیب خصوصی گوشہ سید محمد فاروق القادریؒ

فہرست ...گوشہ سیّد محمد فاروق القادریؒ

☆☆☆

تبصرہ: رئیس نذیر احمد (رحیم یار خان) **شعور و ادراک شمارہ نمبر ۵ پر تبصرہ**

محنت اور محبت کا استعارہ

محمد یوسف وحید اور ''شعور و ادراک''

ملک کے بڑے علمی مراکز بہاول پور، ملتان، کراچی اور لاہور سے دُور سندھ اور بلوچستان کے سنگم پر واقع ضلع رحیم یار خان کی چھوٹی سی مگر علم و عرفان سے زرخیز دھرتی تحصیل خان پور' ادبی اعتبار سے بڑے بڑے مراکزِ علم و ادب سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔ یہاں علم و ادب کے ساتھ ہدایت کے بھی ایسے چشمے پھوٹے جنھوں نے علمی اور رُوحانی اعتبار سے دُور دراز تک کے علاقوں کو اپنے فیض سے سیراب کیا۔

محمد یوسف وحید کا تعلق تحصیل خان پور سے ہے۔ ادب سے گہرا تعلق ہونے کے ناطے ''خان پور کا ادب'' لکھ کر ادبی حلقوں سے داد وصول کر چکے ہیں۔ اس کم عمری میں علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں پر مشتمل کتابی سلسلے ''شعور و ادراک'' کے پلیٹ فارم سے اتنا پختہ ادب تخلیق کرنے پر تحسین اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ہر شخص کے اندر چھپی ہوئی کچھ صلاحیتیں ہوتی ہیں جو ہماری زندگی میں مثبت تبدیلی کا باعث بننے کی رکھتی ہیں ۔محمد یوسف وحید کی شخصیت کے تمام پہلوؤں اور ''شعور و ادراک'' کے گوشوں کو چند اوراق میں سمیٹنا اگرچہ مشکل کام ہے۔ تاہم ان کے افکارِ تازہ کی مختلف جہتوں پر روشنی ڈالنے کی یہ سعیٔ ناتمام جو مجھے اپنی کم علمی کا احساس دلا رہی ہے' اگر میرے یہ منتشر خیالات ''شعور و ادراک'' کے قد میں کسی طرح اضافے کا سبب بن سکیں گے تو میرے لئے حوصلہ افزائی کا باعث ہوں گے۔

محمد یوسف وحید اپنے اندر کے چھپے جوہر کو تابدار موتیوں کی طرح منصۂ شہود پر لانے کی سعیٔ بلیغ جس خلوصِ نیت سے کر رہے ہیں' یقیناً ایک دن ان کا ''شعور و ادراک'' مثبت ادب کے آسمان کی بلندیوں پر ضوفشاں ہوگا۔ قحط الرجال اور کور ذوقی کے دَور میں جہاں مضبوط ساکھ رکھنے والے مجلّے اور میگزین دم توڑ اور آخری ہچکیاں لے رہے ہوں' وہاں ایک نئے معیاری مجلّے کا اجرا' تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوا ہے۔ دورِ حاضر میں جذبۂ صادق سے تحریک پانے والا یہ رُجحان ساز قدم ان کے شخصی خصائص کا مرہونِ منت ہے۔

سوچ اور فکر کے متنوع زاویے' مثبت ادب کی تخلیق کا سبب بنتے ہیں۔ محمد یوسف وحید گزشتہ سال ۲۰۲۰ء سے ''شعور و ادراک'' کے فروغ کے لئے ہمہ قسم کوششیں جو کسی رکاوٹ اور تعطل کے بغیر جاری رکھے ہوئے ہیں' اس کی سب سے بڑی وجہ اپنے مقصد کی عظمت سے متعلق ان کا کامل یقین اور تخلیقی و فکری نوعیت کی وابستگی کا عمل دخل ہونا ہے۔ جس کی مثال یہ ہے کہ انہوں نے بہت کم عرصے میں مختلف نقطہ ہائے فکر و نظر اور مزاج کے لوگوں کو ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا ہے۔

''شعور و ادراک'' شمارہ نمبر ۵، جنوری تا مارچ ۲۰۲۱ء کے دھنک رنگ پہلوؤں نے اپنا کمال کچھ اس طرح

دکھایا ہے کہ اس کے دس ابواب میں سے پہلے باب میں ۶ شعرا کی حمد و نعت کے بعد ''اپنی بات'' مضامین کے ذیل میں ۴، تیسرے باب ''افسانے/خاکے/انشایئے'' میں ۵، چوتھے باب ''فن و شخصیت'' میں ۵، پانچویں باب ''فریدیات'' میں ۲، چھٹے باب ''خصوصی مطالعہ'' (تحقیق/تنقید) میں ۱۱، ساتویں باب ''تاریخ'' میں ۲، آٹھویں باب ''تبصرے (شخصیات/کتب، گفت گو) میں ۲ ''خان پور کا ادب'' کے ذیل میں ۶ تبصرے بھی اس کا حصہ ہیں' نویں باب ''شاعری (غزلیں، نظمیں، ماہیے، رُباعیات) میں ۴۰ شعرا کے منظومات اور دسویں باب'' خصوصی گوشہ (سیّد محمد فاروق القادری) میں اہلِ قلم کے مضامین بھی شاملِ کتاب ہیں۔ اُمید ہے دیگر مضامین کے ساتھ ساتھ یہ خصوصی گوشہ قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں خوب کامیاب ہوا ہوگا۔

''شعور و ادراک'' کو کون کون سی' کتنی اور کہاں کہاں رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہوگا' اس کا ادراک تو محمد یوسف وحید کو ہو چکا ہوگا۔ آج کے اس ترقی یافتہ عصرِ حاضر میں نسلِ نو میں مطالعے کے فقدان کے ماحول میں زرِ کثیر صرف کر کے مجلّہ نکالنا جان جوکھوں کا کام ہے' اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں ہے۔ لیکن محمد یوسف وحید ہیں کہ اس کو سہ ماہی سے ماہانہ کی بنیاد پر چھاپنے کا عزم رکھتے ہیں۔ آج کے الیکٹرونک دَور میں نسلِ نو'' شعور و ادراک'' حاصل کرلے گی تو اس کو تعلق بالکتاب پیدا ہو جائے گا۔ پروفیسر غازی علم الدین کی کتاب'' میزانِ انتقاد و فکر'' سے ایک اقتباس خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو قارئین کی خدمت میں پیش ہے:

''تعلق بالکتاب کو مضبوط کرنے کے لئے کتاب کے معیار کو برقرار رکھنا ناگزیر ہے''۔

جس کا محمد یوسف وحید کا مجلّہ ''شعور و ادراک'' شاہد ہے۔ دُعا ہے اللہ تعالیٰ اُن کے عزم' حوصلہ' ثابت قدمی' اولوالعزمی اور استقامت کو دوام بخشے۔

محمد یوسف وحید کو لفظوں کے ہیر پھیر سے ''محبت'' اور ''محنت'' کا استعارہ قرار دیا جائے تو اس کی متحرک اور فعال طبیعت پر سو فی صد صادر آتا ہے۔ عزم و ہمت کا کوہِ گراں تنِ تنہا ایک ادارے کا کام اپنے ناتواں کندھوں پر ڈالے ہوئے سوئے منزل رَواں دَواں ہے۔ حالاں کہ ایسے کام اداروں کے کرنے کے ہوتے ہیں جو وہ اکیلا انسان کر رہا ہے۔ لایعنی اور فرسودہ ادب کے مقابلے میں بامعنیٰ' بامقصد ادب تخلیق کرنے کی سعی پیہم میں'' خلوصِ نیت'' شامل ہو جائے تو منزل قریب تر ہو جاتی ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے: رکاوٹیں ترقی کا زینہ ہوتی ہیں جو دراصل کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔ انتقاد کا عمل اگر مفقود ہو جائے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قارئین نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے یا پھر معیاری ادب تخلیق ہونے کے دَر بند ہو گئے ہیں۔ مثبت تنقید اور رائے ثروت مند ادب تخلیق کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تنقید کا ایک مقصد ادب کو اعلیٰ معیارات عطا کرنا ہوتا ہے۔ دورانِ مطالعہ پروف کی اَغلاط طبیعت میں انقباض کا باعث بنتی رہیں۔ آئندہ مجلّے میں اس کی پروف کا خاطر انتظام بہر حال ہونا چاہئے۔ یہ کام جس دِقتِ نظری کا متقاضی ہے' راقم السطور اس سے خوب واقف ہے۔ معیاری ادب تخلیق کرنے کے لئے صرف سَرمایے کا وافر مقدار میں ہونا ہی کافی نہیں بلکہ مستند اور معیاری ماخذ اور لوازمات کا ہونا از بس ضروری ہوتا ہے' تصحیح متن و اصلاحِ املا اس پر مستزاد ہیں۔

اُمید ہے محمد یوسف وحید کی سیمابی طبیعت مستقبل قریب میں توانا ادب تخلیق کرنے کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ بامقصد زندگی کا لوازمہ اور ارفع ادب کی تخلیق، مثبت سوچ میں مضمر ہے۔ ''شعور و ادراک'' کس حد تک اپنی کاوش میں کامیاب ہو سکا ہے، اس کے لیے ہمیں مجلّے کے اَوراق کو عصبیت کی عینک اُتار کر پڑھنا ہوگا۔ یہ مجلّہ جہاں ایک طرف تخلیقی شعور حوالے کا کردار ادا کرے گا وہاں مثبت دانش کی مقناطیسی قوت، اہلِ قلم، اہلِ فکر و نظر کی ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں بھی کامیاب ہوگا۔

☆☆☆

تبصرہ: معظمہ شمس تبریز (رحیم یار خان) **شعور و ادراک شمارہ نمبر ۵ پر تبصرہ**

محمد یوسف وحید کی ادبی فتوحات

علمی و ادبی مجلہ ''شعور و ادراک'' ۔ کتاب نمبر 5
(جنوری تا مارچ 2021ء)
میں شامل خصوصی گوشہ ''سید محمد فاروق القادری'' پر تبصرہ

دیکھیے ساغر کی آشفتہ نگاہی کا کمال
مستیاں چھلکا رہا ہے ایک دیوانے کا نام

اس شعر کے مصرعہ اولی میں ساغر کی جگہ شاہد رکھ لیں تو حسب حال ہو جائے گا اور ہمارے ممدوح محترم کی ادبی فتوحات کا عکاس بھی ہو جائے گا۔ حفیظ شاہد ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک دبستان ادب کا نام ہے۔ جس کے دائرہ فیض رسا میں کربل ادب میں العطش پکارتے متعدد ادیبوں، شاعروں اور قلم کاروں کو نہ صرف جام جاں فزا نصیب ہو جاتا ہے بلکہ حل من مزیدی کو بھی رخت قرار دان ہو جاتا ہے اور علمی، ادبی اور شعری تڑپ کو یہ مژدہ جان فزا بھی میسر آتا ہے کہ

''آج ہیں وہ مائل بعطا اور بھی کچھ مانگ''

قرآن مجید فرقان حمید کی آیات کے شان نزول اور احادیث مبارکہ کے مقامی پس منظر پر غور کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اقوال اور افعال کی اہمیت ان کے وقوع کے حالات حاضرہ کے مطابق اہمیت کے گراف میں بلندی پاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح محمد یوسف وحید کی پے در پے ادبی فتوحات کے بیک پر جو خلوص اور خود وقتی کا جو جذبہ کار فرما ہے اس کو بھی کرونا ایسی قدرتی آفت کے ہوتے ہوئے سورج کی اجلی تمازت اور عوام کی سرد مہری کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ صرف ایک کام نہیں بلکہ ''مہا کار'' ہے۔ صرف ادب کی دھن نہیں، ''ادب سے عشق'' کی معجزہ نمائی ہے۔ ہم ابھی ''شعور و ادراک'' کی کتاب نمبر 5 میں محقق العصر، آبروئے قلم، فخر سادات، طبیب روحانی اور عالمی سطح کے مصلح حضرت علامہ پیر سید محمد فاروق القادری کی ادبی فتوحات کو خراج تحسین پر مبنی خصوصی گوشے کی اشاعت پر محمد یوسف وحید کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرنے کی نیت سے الفاظ جنار ہے تھے کہ خبر ملی کہ کام کے اس جو یائے آسمان ادب کے نہایت تخی سورج حفیظ شاہد کے فنی سفر کے بارے میں مخصوص گوشے پر کام کا آغاز کر دیا ہے۔ آج 28 جولائی 2021ء ہے اور 30 جولائی کو ہمارے فائنل ائیر کے پیپرز شروع ہیں لیکن ہم نے بابا جانی کے تکیہ کلام

''ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں''

کے زیرِ اثر حفیظ شاہد کے قلمی کارناموں اور محمد یوسف وحید کی ادبی خدمات کے لیے وقت نکال لینے کا فیصلہ کیا اور کامیاب رہے۔ بات چانس کی ہے اور صنفِ نازک کو ہانڈی چولہے تک محدود رکھنے کی دقیانوسی رسم اور صدیوں پرانے رواج کے ہوتے ہوئے محمد یوسف وحید ایسے افراد نے جس طرح راہیں نکالنے کی داغ بیل ڈالی ہے اور گوشۂ نشیں ٹیلنٹ کو پروان کے مواقع فراہم کرنے کا عملِ خیر دامیں، درمیں، سخنیں جاری رکھنے کا قصد کیا ہے تو ہم نے بھی پیغامِ امن اور آشا کی برقراری کے اس قاصد کی آواز پر لبیک کہنے میں فخر محسوس کیا ہے کہ جس نے حفیظ شاہد ایسے کہنہ مشق اُستاد الشعراء اور وسیب کا دَرد رکھنے والے قلبِ بے دار اور دیدہ وا کے حامل فردِ درویش کے پیغام کی تفہیم و تبلیغ کا بیڑا اُٹھایا ہے، لازم ہے کہ اتنے بڑے انسان کے تذکرے کی کاوش ہماری جستجو کے کشکول میں بھی جواہراتِ روانیہ کا اضافہ کرے گی اور ہم بھی چانس ملنے اور اس کو Avail کرنے کے فرض سے سبکدوش قرار پائیں گے ورنہ ہم نے دیکھا ہے کہ عوامی اذہان میں سمایا جہالت کا لٹو کبھی بھی گھوم سکتا ہے اور لڑکیوں کی آزادی کے سارے نعرے کھوکھلے لگنے لگتے ہیں۔ یادرہے کہ آزادی سے ہماری مراد ٹیلنٹ کے اظہار اور نکھار کے مواقع کی فراہمی کی آزادی ہے۔ صد شکر کہ ہم اس عظیم بابا جانی کی بیٹی ہیں جن کی حیات اعتبار سے عبارت ہے اور ان کا یہ قول جو ہمیں پانچویں جماعت میں بالکل سمجھ نہ آیا تھا آج بخوبی ہم دوسروں کے سامنے رکھ سکتے ہیں۔ بابا جانی کا قول ہے۔

"جس کو اپنی بیٹی پر اعتبار ہو وہ کتے نہیں پالا کرتا۔"

"ہاتھی دانت" کی طب میں بڑی اہمیت ہے مگر "ہاتھی دانت" صرف محاورہ ہی نہیں جو کھانے کے اور دکھانے کے اور ہوا کرتے ہیں۔

ہم نے فروغِ تعلیم کا ناٹک کرنے والے ایسے نامہرباں بھی دیکھے ہیں، مسابقت کے خیال سے اپنی بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے بعد ان کی مزید تعلیم کے بھی خلاف حتیٰ کہ حاصل کردہ تعلیم کے لیے مدرس کے کردار کے بھی خلاف الغرض وہ بیٹیاں محفل میں شہزادیاں اور تنہائی میں پتھر کے دور کی مورتیاں ہیں جن کی سانسوں کو بھی مجبوراً برداشت کیا جاتا ہے۔ ہماری چند عزیزائیں زندگی کے اس کربناک سچ کا سامنا کر رہی ہیں اور ہم اپنے امتحان سے فراغت پاتے ہی ان کے حوالے سے "سسکتی سانسیں" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس میں بھی اسی چانس، حوصلہ افزائی اور جستجو کا کردار ہوگا جو محمد یوسف وحید کی ادب شناسی اور حق نگاری ہم جیسے کئی گم نام والے قلم کاروں، ادیبوں اور ٹیلنٹڈ پرسنز کے دم قدم سے حاصل ہوئی ہے۔ وقت کے دامن میں وُسعت ہوتی تو ہم اس کارِ خیر میں اپنے حصے کا کردار نبھاتے کیونکہ ادبی خدمت کی وجہ سے ہمارے اندر کے انسان نے ایک جرأت کا احساس اُجاگر کر لیا ہے اور جب کبھی ہم ادبی بے ادبیوں اور اسی قبیل کی زبوں حالیوں کے گواہ ہوتے ہیں تو پھر محمد یوسف وحید جیسے کرداروں کا خیال اس شعر میں ڈھل کر قرطاسِ ذہن پر نمایاں ہو جاتا ہے۔

کہہ رہے ہیں چند بچھڑے رہبروں کے نقشِ پا
ہم کریں گے انقلابِ جستجو کا اہتمام

حفیظ شاہد کی شاعری مقامِ پیغمبری کے تمام تر تقاضے بطریقِ احسن نبھاتے ہوئے ملتی ہے۔ فنی پختہ کاری سے

تبلیغ کے تمام تر پہلو جمع کر کے اصلاح احوال کی بہترین تبلیل کر لی گئی ہے اور معنویت کے لحاظ سے ہر شعر ایک الگ ملک کی سیر اور تخلیق کار کے قلمی عروج کا بالکل اسی طرح بین ثبوت فراہم کرتا ہے جس طرح حضرت پیر علامہ سید محمد فاروق القادری کی شہرہ آفاق تصنیف ''اصل مسئلہ معاشی ہے'' پڑھنے کے بعد اس عظیم محقق اور رمز شناس انشاپرداز کے عالم علوم میں بس ہر فن مولا ہونے کا بین ثبوت فراہم ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے موقف کی تائید کے لیے یہ اشعار آپ کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں اور آپ کو فیصل قرار دیتے ہیں۔ آپ دیکھیے کہ ان کی قوتِ مشاہدہ، فکری پرواز، مطالعہ کی کرشمہ سازی اور قلم کا جادو کس طرح سرچڑھ کر بولنے پر ہر آن آمادہ ملتا ہے۔

کچھ نہیں رکھتے ہیں اپنے آپ کی پہچان بھی
ہیں ابھی تک مبتلا ایک فخر آبائی میں ہم

☆

ہماری فکر تم چھوڑو ہمیں یہ کام آتا ہے
اندھیروں میں بسر کرنا نظر میں کہکشاں رکھنا

☆

گلوں کی بات اگر باغبان نہیں کرتا
تو پھر جہاں میں کوئی ترجمان تلاش کروں

ان تین اشعار کے احاطے میں شاعر نے دشتِ عشق میں خود فراموشی اور پدرم سلطان بود کے سماجی ہتھکنڈے کا خوب بیان کیا ہے۔ پھر دوسرے منظر میں کسی بھی حال میں زندگی کر کے مثبت روی کو رواج دینے کا درس دیا جا رہا ہے اور پھر احبابِ اختیار اور عائلی زندگی میں ذمہ داری سے انکار پر احتجاج خوب صورت اور مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

الغرض حفیظ شاہد کی شاعری میں عام فہم الفاظ کے جادو سے اثر پذیری کے عمل کو معراج کرنے کا پورا پورا انتظام موجود ہے۔ تسلسل اور سلاست کا حسن تو گویا کوئی ان سے سیکھے۔ شعور انسان کی وہ دولت ہے جو ودانِ خداوندی ہے اور اسی کی وجہ سے وہ مسجودِ ملائکہ بھی قرار پایا ہے لیکن ادراک نہایت ضروری ہے ورنہ امرت سرہانے ہوتے ہوئے بھی زہر کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔ ''شعور و ادراک'' کا کتابی سلسلہ جتنا تعریف و توصیف کا متقاضی ہے امتحانات کی وجہ سے ہم وقت کے دامن میں تنگی محسوس کرتے ہوئے ایک اعتراف آپ کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں جو بعد میں حاضر کے منکرین اور معترضین کے زباں و دل پر بھی ضرور ظاہر ہوگا کہ ''شعور و ادراک'' کا مزید سفر مشقت اور ولولے کے بل بوتے پر گوہر شناس بھی ہو چکا ہے اور سلیقے سے مالا پرونے کا ہنر بھی سیکھ چکا ہے۔ جس کا ثبوت ''شعور و ادراک'' کا فنی ارتقاء اور لحہ لحہ بڑھتی ہوئی ہر دلعزیزی ہے۔ مزید خوشی یہ ہے کہ محمد یوسف وحید نے صنفِ نازک سے جڑے ادب کو تلاش کر کے ادب کو نزاکت آفریں کر دیا ہے۔ نئے لکھاریوں کی جستجو بھی بدستور جاری ہے ورنہ ادب اور ادیب یوں نوحہ کناں پائے جاتے تھے کہ

کسی کو بھی کچھ حسب آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا

صنفِ نازک کی حوصلہ افزائی دراصل حوا کی بیٹی کے لیے آکسیجن کی فراہمی کا درجہ رکھتا ہے جس کے لیے "شعور وادراک" کے مدیر: محمد یوسف وحید مبارک باد کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ ورنہ حال تو یوں تھا

دفنا دیا گیا مجھے چاندی کی قبر میں
میں جس کو چاہتی تھی وہ لڑکا غریب تھا

آخر میں ہم بصد مسرت برمحل اعتراف کرتے ہیں اور اہلِ دل، اہل ذوق ادب کے محقق اور تاریخ نویس کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ محمد یوسف وحید بطورِ خوگرِ عمل اور پیکرِ اخلاص، الرجال الخیر میں اپنا نام سنہری حروف سے لکھ چکے ہیں۔

ہم لیلائے ادب کے قیس بے مثال محمد یوسف وحید کو تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ جس نے اس مشکل گھڑی میں بھی ادب کی خدمت سے روگردانی ہرگز نہیں کی جب کرونا کی آڑ میں بہت سے سہل پسند شعراء، ادیبوں اور قرطاس وقلم کے خدائی فوجداروں کو آرام گاہ بھی میسر آئی تھی اور فرصتِ مطلوبہ بھی مہیا رہی تھی۔

"شعور وادراک" کا لفظ ہی ان کی شخصیت کی مخفی بلندی کا پتہ دیتا ہے۔ خصوصاً مختلف نامور اہل فن حضرات کے لیے مخصوص گوشے کا اہتمام ان کے لیے ہر دلعزیزی اور عمل سے سونا بننے کا انتظام واعلان ثابت ہو چلا ہے۔

یوسف وحید نے بچے بن کر بچے کے ساتھ ساتھ چھوٹے بڑے کئی کتابچے ان کی بیدار مغزی کا قصیدہ قارئین کے سامنے رکھنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ نامور ادیب حیدر قریشی کے حوالے سے "شعور وادراک" کتاب نمبر 4 میں "حیدر قریشی گولڈن جوبلی نمبر" کی اشاعت اور پھر "شعور وادراک" کتاب نمبر 5 میں عالمی شہرت یافتہ محقق، ادیب، عالم، کالم نویس، مقالہ نگار، فاضل اور شاعر حضرت علامہ پیر سید محمد فاروق القادری آف شاہ آباد شریف کی علمی ادبی فتوحات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے خصوصی گوشے کی اشاعت جہاں بے مثال ادبی کارنامے ہیں وہاں دھرتی سے محبت اور جرأت کی بھی بہترین کاوش ہے۔

اسی تسلسل میں حفیظ شاہد کے حوالے سے مخصوص گوشہ بھی ان کی سابقہ کامرانیوں میں مزید بہتری کا اضافہ کرے گا۔ باتیں اور کام دونوں ہونے کے لیے ہوتے ہیں، ہوتے رہے ہیں، ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ کام زندہ رہتا ہے اور زندہ رکھتا بھی ہے۔ اُمید ہے محنت سے نکھار آئے گا اور نکھار سے انکار اقرار میں بدل جائے گا کہ یوسف نام کا ہی نہیں کام بھی یوسف ہے اور ہمارے دلوں میں ادب کی اقبالی محبت سے پیدا ہو جائے گی۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
جو ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

☆☆☆

تبصرہ: مجاہد حسین (گڑھی اختیار خان) — شعور و ادراک شمارہ نمبر ۵ پر تبصرہ

اقلیمِ ادب کا یوسف... محمد یوسف وحید

اس نجم فلک سے ہے یہ نجم ادب اعلیٰ
کہ جس سے محبت کا ہے بول ہوا بالا

''اپنا وطن کشمیر'' اور ''اپنا گھر جنت'' میں ایک ایسی سچی مسرت پوشیدہ ہے، جس کی تاثیر سے انکار ممکن نہیں اور ہر گز نہیں۔ گھر ایک سے بڑھ کر ایک تو ہو سکتے ہیں مگر ''ایک سے'' نہیں ہو سکتے پھر کیوں ایسا ہے کہ امیر سے امیر تر اور غریب سے غریب تر ہر انسان اپنے گھر کا ذکر پیغام نوید کی طرح کرتا ہے حتیٰ کہ کہنے والوں نے اتنا بھی کہہ دیا کہ

یارانِ جہاں کہتے ہیں کشمیر ہے جب
جنت کسی کافر کو ملی ہے نہ ملے گی

جب ہم اس پیغام کی تہہ میں اترنے کی سعی کرتے ہیں تو یہ بات قرین قیاس لگتی ہے اور پھر تو صحیح بھی خود کار طریقے سے ہوتی چلی جاتی ہے کیونکہ انسا نحسن کا عامل اور مرقع ہے اسی لیے اسے سماجی جانور کہا جاتا ہے۔ خیال رہے کہ جانور ہم نے فقط سائنسی اصطلاح کے تحت کہا ہے۔ بہر حال ''گھر'' میں جاذبیت اور کشش اردگرد کے ماحول سے مانوسیت اور احساس اپنائیت کی وجہ سے ہے۔ اس سے بڑی حقیقت یہ بھی ہے کہ صرف احساس کے بل بوتے پر کسی شخص، جگہ یا چیز کی فرویت کو منوایا نہیں جا سکتا اس کے لیے کوئی ناقابل تردید برتری یا برتری محصولہ سے نسبت نہایت ضروری ہے۔ اس کے بعد صرف تسلیم و رضا، قلب سلیم اور محبت کی نظر درکار ہے۔ جس طرح کسی محبت کے پیامی نے کہا ہے،

''ساری دنیا اپنا گھر ہے مل کر اسے سجاؤ''

بالکل اسی طرح ہم گڑھی اختیار خان کو اپنا گھر مانتے ہیں اور فخر کرتے ہیں اور اس میں وہ جاندار حوالہ جس کا ہم سطور بالا میں تذکرہ کر آئے ہیں۔ وہ ہے اس کی روحانی فضا جو اللہ والوں کے قدم کی برکت سے میسر آتی ہے۔ تصوف کا عالمی مرکز گڑھی اختیار خان بندگان خدا کے اظہر و اخفا شیت کارناموں میں معجزہ نما اور جہان فانی کی داستانیں اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔

اظہر کی بات کی جائے تو حضرت خواجہ محمد یار فریدی، حضرت خواجہ غلام نازک کریم اور خواجہ غلام قطب الدین فریدی کی تصوف کی ترویج کے لیے خدمات ناقابل فراموش اور قابل ستائش ہیں۔ اگر اخفا کے حوالے سے تصوف کی بے ریا پاسداری کے حوالے سے دیکھا جائے تو مشائخ شاہ آباد شریف کا کردار سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ انہیں مقبولان خدا میں سے ایک اسم گرامی حضرت پیر علامہ فاروق القادری شاہ صاحب کا

ہے جنہوں نے میدان تحقیق میں قدم رکھ کر اہل تحقیق حضرات کو اپنی سمت متعین کرنے کا گویا روحانی قطب نما فراہم فرمادیا۔ آپ نے ربط یا بے ربطی کی بنیاد صرف اور صرف رضائے الٰہی پر رکھی مگر خلق خدا کی دادرسی اور روحانی اصلاح کے حوالے سے جو مقام حاصل کیا وہ صدیوں میں کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ گویا یہ شعر تو کہا ہی آپ کے لیے گیا تھا

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پے روئی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ہم اس حوالے سے بڑے خوش نصیب ہیں کہ ہمیں علامہ سید فاروق القادری ایسے عبقری زماں، عالم، فاضل، محقق، مقرر، خطیب اور ادیب کا زمانہ اور زیارت نصیب رہی ہے۔ اہلِ علاقہ کے لیے آپ کی شفقت اور ذاتی تجربات کا ذکر کروں تو مجھے ضرور یہ خوبصورت شعر لینا ہوگا

نگاہ ولی میں وہ تاثیر دیکھی
بدلتی ہزاروں کی تقدیر دیکھی

ہمارے بزرگوں نے سادات کرام کی محبت گویا ہماری گھٹی میں ڈالی ہے اور یہ فیضان کرم اور باطنی ترتیب کے اس بے مثال مرکز سے مربوط ہے جو راس الاصفیا، زبدۃ الکاملین حضرت پیر سید جعفر شاہ القادریؒ کے دم قدم سے گڑھی اختیار خان کو حقیقی معنوں میں مرکز تصوف ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

مشائخ شاہ آباد شریف اور خصوصاً سید محمد فاروق القادریؒ کے ذکر خیر سے اپنے ذہن، قلم اور ڈائری کو مشرف، منور اور سعید کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان شاء اللہ جلد یہ سعادت حاصل کرنے کی سعی کریں گے۔ فی الوقت شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں جناب محمد یوسف وحید صاحب کا جنہوں نے انتہائی مشکل حالات میں بھی ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ تمام تر کاوشوں اور فروغ ادب کے لیے نئی راہیں تراشنا اور تحقیقی میدان میں کمرہ جاتی تحقیق کی بجائے Door to door، Face to face، Place to place اور Know before you convey، کے عملی تحقیقی روایت کی بحالی کی داغ بیل ڈالی ہے۔

جسے جگ نے سمجھ آساں کیا نام ہے نسیاں کے
وہی پہلو اجاگر کر کے رکھا ہے جہاں آگے
مرے یوسف تجھے ہم نے بڑی تحقیق سے سمجھا
کبھی بھی جا نہیں سکتا ارے تجھ سے زماں آگے

مقدار کی بجائے معیار پر نظر رکھنا محمد یوسف وحید کی وہ خوبی ہے جس نے اسے روایتی ادیبوں سے الگ تھلگ مقام دلانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ''شعور و ادراک'' میں مختلف نامور ادیبوں کے لیے گوشے کا اہتمام ان کی اعلیٰ ادبی سوچ کا نہ صرف ثبوت ہے بلکہ مشعل راہ بھی ہے۔

خدا جب حسن دیتا ہے
نزاکت آ ہی جاتی ہے

بالکل اسی طرح شعور وادراک کتاب نمبر 5 میں تصوف روحانیت اور علم وفضل کے حوالے سے عالمی شہرت رکھنے والے فخرِ سادات طبیب روحانی حضرت علامہ پیر سید فاروق القادریؒ کے حوالے سے مخصوص گوشے کا اہتمام کسی روحانی فیض رسانی کی قدرتی تنظیم کی کرشمہ سازی بھی مانی جاسکتی ہے کیونکہ اسلام کی بنیاد بھی پانچ پر ہے مخلوق کی خالق کے حضور حاضریوں کی تعداد بھی پانچ ہے۔ نسبت حق کی امین ہستیاں بھی پانچ ہیں۔ لفظ بروزن فعولن کے حروف بھی پانچ ہیں۔ سید شہنشاہ ہوتا ہے اور اگر آپ کی کوئی خدمت قبول ہو جاتی ہے تو بڑی بات ہے۔ یقین ہے کہ یہ کتاب نمبر 5 گوشہ تمام تر روحانی نوازشات کا پیش خیمہ ثابت ہوگا اور سادات کرام کی باطنی سخاوت محمد یوسف وحید کے لیے مثبت روی اور حق شناسی کا مزید سامان کردے گی کیونکہ

لج پال پریت نوں توڑ دے نئیں

جیدی بانہہ پھڑدے اونوں چھوڑدے نئیں

شعور وادراک کی محض تین کتابیں کتاب نمبر 4، کتاب نمبر 5 اور کتاب نمبر 6 کو ہی دیکھ لیا جائے تو صرف اور صرف مخصوص گوشوں میں ہی اعلیٰ ادبی عمرانیات کا بہترین خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

کتاب نمبر 4 حیدر قریشی کے حوالے سے مخصوص گولڈن جوبلی نمبر پر مبنی ہے جس میں وطن سے محبت مٹی کا مدھرپن اور مونجھ کی کرشمہ سازیاں پوری کتاب میں جگہ جگہ بکھرتی چلی جارہی ہیں۔

کتاب نمبر 5 میں زبدۃ المحققین حضرت علامہ پیر سید محمد فاروق القادریؒ کی علمی، ادبی، قلبی اور روحانی کرم فرمائیوں پر مبنی اس کتاب کی حقیقت بلاشبہ منفرد اور مثالی ہے۔

کتاب نمبر 6 میں ادب کے شمس وقمر حفیظ شاہد کی ادبی خدمات کے حوالے سے گوشہ مخصوص کیا جارہا ہے اور جب یہ اہتمام مکمل ہوتا ہے تو ادب کی جھولی میں کتنے نئے موتیوں کا اضافہ ہو جاتا ہے اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں کیونکہ

آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

ہم آخر میں ایک بار پھر خلوص دل سے معتبر نوخیز ادیب محمد یوسف وحید کی خدمت میں سلام پیش کرتے ہیں اور تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جس نے نہ صرف ادب میں نئے افق تلاش کیے ہیں بلکہ ان میں مدھم پن مدھم ستاروں کو واضح کرنے میں بھی مثالی کردار ادا کیا ہے۔ اس شعر میں دشواریوں کا مردانہ وار مقابلہ کر کے نئے آنے والے طبقے کی ڈھارس بندھانے کی عملی اور کامیاب کاوش کی ہے، گویا

اب جس کو چاہیے وہ لے لے روشنی　　ہم نے تو دل جلا کے سرعام رکھ دیا

(صادق جاوید)

ساتھ ہی ساتھ محمد یوسف وحید نے ذاتی آرام اور حقِ راحت کو ثانوی قرار دے کر ادب کے آسمان پر نئے ستارے نمایاں کر کے اس شعر کو حقیقت میں بدل دیا ہے۔

اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں　　ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

☆☆☆

تبصرہ: حبیب اللہ خیال (خان پور)
مدیر محمد یوسف وحید کی تحقیقی کتاب پر تبصرہ

''خان پور کا اَدب''... ایک جائزہ

خان پور ایک مردم خیز دھرتی ہے، یہاں ادب وثقافت کے پھول ہر سُو پھلتے، پھولتے اور مہکتے نظر آتے ہیں۔ خان پور میں ۹۰۔۱۹۸۰ء کی دہائی میں مختلف ادبی تنظیمیں فعال تھیں اور آئے روز ادبی محافل برپا ہوتی تھیں۔ ۱۹۸۳ء میں بزمِ فرید جسے حکیم غلام رسول سُندر کی سرپرستی حاصل تھی، فعال ادبی تنظیموں میں شمار ہوتی تھی۔ بعد ازاں اس کے علاوہ بزمِ معارف، خان پور ڈرامہ فورم، سانول سنگت، چولستان آرٹس کونسل، ارشد ادبی سنگت، الوحید ادبی اکیڈمی، بزمِ ادراک، عالم ادبی فورم، تانگھ ادبی سنگت اور بزمِ راز دیگر نے بھی اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ ۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۵ء تک بے شمار ادبی پروگرامز ہوئے جن میں ملک بھر کے شعراء، اُدباء اور دانشوروں کو اکٹھے ہونے کا موقع ملا مگر وقت کی گردش، جدید ٹیکنالوجی اور موبائل فون آنے کے بعد ادبی پروگرامز کا انعقاد کم ہونے لگا۔

۲۰۰۴ء سے خان پور کے ادبی منظر نامے میں ایک نوجوان کا خوب صورت اضافہ ہوا جس کا نام محمد یوسف وحید ہے۔ محمد یوسف وحید نے اپنا تخلیقی سفر روز نامہ جنگ ملتان سے کیا۔ ۲۰۰۷ء سے بچوں اور بڑوں میں مقبول رسالہ ''بچے من کے سچے'' جاری کیا جو گذشتہ ۱۴ سالوں سے شائع ہو رہا ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس نوجوان کی علمی، ادبی اور تخلیقی صلاحیتوں میں خوب اضافہ ہوتا گیا۔ حال ہی میں اُن کی نئی کتاب ''خان پور کا اَدب'' شائع ہوئی ہے جو خان پور کی ۱۲۰ سالہ علمی، ادبی اور ثقافتی تاریخ پر مشتمل منفرد اور جامع معلومات سے بھرپور ایک ایسی کتاب ہے، جو اپنی مثال آپ ہے۔ واضح رہے کہ محمد یوسف وحید نے یہ کتاب کسی حکومتی ادارے یا شخصیت کے تعاون سے یہ کتاب شائع نہیں کرائی اور نہ ہی کسی اشاعتی ادارے نے اسے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب انہوں نے اپنے ذاتی خرچے سے شائع کرائی ہے۔

''خان پور کا ادب'' کی خاص بات یہ ہے کہ اس کتاب میں اُنہوں نے بڑی محنت سے نئے اور پرانے اُدباو شعرا، دانشوروں، صحافیوں کے بارے معلومات اکٹھی کی ہیں اور اُنہیں اس کتاب میں شائع کیا ہے۔ ۲۲۴ صفحات پر مشتمل اس ادبی کتاب میں ۴۷ شخصیات کے تعارف شامل کیے گئے ہیں۔ متعدد شخصیات اس دنیا سے کوچ کر گئیں ہیں۔ لیکن اُن کے ادبی اور تخلیقی سفر کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ کتاب میں مختلف شخصیات کے تعارف کے علاوہ خان پور کا تاریخی پسِ منظر بھی شامل ہے۔ شعراء کے تعارف کے ساتھ نمونہ کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔

کتاب کے سرورق پر خواجہ غلام فریدؒ، خواجہ محمد یار فریدی، امان اللہ ارشد، حفیظ شاہد، مجاہد جتوئی، زاہد شمسی کی تصاویر شائع کی گئی ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ محمد یوسف وحید نے لفظ مصنف کی جگہ کتاب کے سرورق پر تحقیق وتالیف لکھا ہے جو ان کی علمی دانش مندی کا عملی ثبوت ہے۔ اس سے بڑی بات یہ ہے کہ اُنہوں نے فہرست مرتب کرتے ہوئے

الف بائی ترتیب کو سامنے رکھا ہے۔ کتاب میں سینکڑوں نامور اہلِ قلم جن میں بالخصوص اہم شخصیات آسی خان پوری، حفیظ شاہد، سید محمد فاروق القادری، ڈاکٹر اجمل بھٹی، ارشاد امین، اظہر عروج، اظہر مراد، امان اللہ ارشد، انیس دین پوری، ایوب ندیم، حیدر قریشی، خورشید احمد ٹمی، رفیق احمد صدیقی، شیر محمد خیال، شمسہ اختر ضیاء، ظفر اقبال ماچے توڑ، خواجہ عالم کوریجہ، قاصر جمالی، قیس فریدی، کریم بخش شعیب، مسعود اشعر صدیقی، نزدوش ترابی، نذر خلیق، نسیم بلوچ، نذیر احمد بزمی، صوفی محمد یار بے رنگ اور یاور عظیم شامل ہیں۔

کتاب ''خان پور کا اَدب'' میں صفحہ نمبر ۲۰۹ تا ۲۱۲ تک اہم ادیبوں، دانشوروں کے ٹیلی فون نمبرز پر مشتمل ڈائریکٹری شامل ہے' جو نہایت باریک بینی کا اہم کام ہے۔ اس سے ادیبوں اور دانشوروں سے رابطہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ ''خان پور کا اَدب'' کو ترتیب دینے میں مختلف علمی، ادبی، تاریخی اور سماجی موضوعات پر لکھی گئیں کتب، رسائل اور دیگر مواد سے بھی رہنمائی لی گئی ہے۔ اہلِ قلم کی مطلوبہ معلومات کو زیادہ سے زیادہ ذرائع سے حاصل کرنا ایک مشکل ترین لیکن مستحسن اور بڑا کام ہے۔ جسے صاحبِ کتاب محمد یوسف وحید نے ممکن کر کے دکھایا ہے۔ کتاب میں معلومات اور پروف ریڈنگ کی اَغلاط بہت کم ہیں۔ ۲۲۴ صفحات میں اتنی کم غلطیاں ہونا بھی مصنف کی تعریف میں جاتا ہے مگر چند ایک مقام پر کچھ اقتباسات کی اشاعت دو مرتبہ ہوگئی ہے۔ ''خان پور کا اَدب'' کے بارے میں جن افراد نے اپنے تاثرات اور آراء کا اظہار کیا ہے' وہ نسبتاً زیادہ ہیں۔ بہر حال کتاب'' خان پور کا اَدب'' مجموعی طور پر ضلع رحیم یار خان کے ادب اور ادبی حلقوں کے لیے ایک خوب صورت اضافہ ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ کریم مستقبل میں محمد یوسف وحید کے علم، عمل اور قلم میں مزید نکھار عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

تحقیق و ترتیب: سعدیہ وحید

حفیظ شاہد... فکر و فن

حفیظ شاہد کے فن و شخصیت کے حوالے سے مختصر مختصر اقتباسات

''چراغِ حرف'' اور دو تحقیقی مسئلے

حفیظ شاہد (مرحوم) کی یہ کتاب ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا واحد ایڈیشن اب نایاب ہے۔ آج سے قریباً دس سال پہلے مجھے اس کا ایک نسخہ اُستاد (مرحوم) نے عطا کیا تھا جو میں اپنے دگرگوں حالات میں محفوظ نہیں رکھ سکا۔ اسی کتاب کے مزید دو چار نسخے اس وقت اُن کے گھر دیکھے تھے، وہ اب وہاں موجود نہیں۔ حفیظ شاہد کے کلیات ''ختم سفر سے پہلے'' (۲۰۱۰ء) کی اشاعت ہونے سے اُن کی دیگر پانچ کتابوں کی طرح کتاب ''چراغِ حرف'' کی غزلیں اور اس میں شامل ڈاکٹر وحید قریشی کا مقدمہ محفوظ ہو گیا۔ مگر اس کتاب کے حوالے سے حفیظ شاہد پر تحقیق کرنے والوں کے ذہن میں دو سوال ضرور پیدا ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے

۱۔ کیا ''چراغِ حرف'' کے اندرونی فلیپوں پر اہلِ نقد کی آرا شامل تھیں؟

جہاں تک بیک کور پر موجود کسی رائے کا سوال ہے تو پروفیسر سہیل اختر نے حفیظ شاہد کی پانچویں کتاب ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' میں اپنے طویل دیباچے میں ''چراغِ حرف'' کے بیک کور پر موجود یزدانی جالندھری کی رائے کے ایک حصے کو شامل کیا تھا۔ لیکن یہ سوال اپنی جگہ ضرور اہمیت رکھتا ہے کہ

۲۔ ''چراغِ حرف'' کے بیک کور پر یزدانی جالندھری کی مکمل رائے کیا تھی؟

حفیظ شاہد پر تحقیق کرنے والوں کے لئے عموماً اور ''چراغِ حرف'' پر کسی نوعیت کا تحقیقی، تنقیدی، اشاعتی، کام کرنے والوں کے لئے خصوصاً، اِن دو سوالوں کے جواب تلاش کرنا ضروری ہیں۔ اس سلسلے میں پہلا، مستند اور معروف طریقہ تو یہی ہے کہ ''چراغِ حرف'' کے ۱۹۸۹ء میں شائع ہونے والے ایڈیشن کا کوئی نسخہ تلاش کیا جائے، جو اُن کے کسی دوست یا رشتے دار کے پاس، یا کسی دکان یا لائبریری میں ہو سکتا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ''حفیظ شاہد۔ فن و شخصیت'' تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم فل ۲۰۰۵ء کے مقالہ نگار مظہر عباس سے رابطہ کیا جائے یا اس مقالے کو از خود کھنگالا جائے۔ ہو سکتا ہے اس مقالے میں چراغِ حرف سے متعلق ان مسائل کے متعلق کوئی حل حوالہ ملے۔

ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے کہ کہیں انٹرنیٹ، موبائل، یا کسی کے پاس کاغذی شکل میں موجود ٹائٹل یا اس کی فوٹو کاپی کو تلاش کیا جائے۔ اگرچہ اس کے امکانات کم نظر آتے ہیں۔ دوستوں سے ممکنہ تعاون کی اپیل ہے۔

(یاور عظیم کی فیس بک Time Line سے ایک پوسٹ کا اقتباس)

☆محترم اس کتاب کی پی ڈی ایف فائل ہمارے پاس ریکارڈ میں موجود ہے۔

☆☆☆

حفیظ شاہد کی شاعری

شاعری اور موسیقی کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ شاعری میں جس چیز کو شعریت کہا جاتا ہے۔ وہ دراصل وہ داخلی موسیقیت ہوتی ہے جو دل و دماغ اور روح پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ خارجی سطح پر اس تاثر کی لطافت اور شگفتگی کو محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن شاید صحیح طور پر لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ میں اس بات کی وضاحت یوں کرتا ہوں کہ ایک اچھا شعر جب ہمیں متاثر کرتا ہے تو اس کا صحیح لطف ہم داخلی طور پر ہی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اپنے خارجی محسوسات کی بنیاد پر اس شعر کی تشریح کر دیں تو نہ صرف اس شعر کی ساری شعریت مجروح ہو جائے گی بلکہ ان لطیف محسوسات کو بھی سخت صدمہ پہنچے گا جو ہمیں داخلی طور پر حاصل ہوئے تھے۔ موسیقیت سے لبریز شاعری موسیقی کے تاروں کی طرح ہمارے دل و دماغ سے لے کر روح تک اثر انداز ہوتی ہے۔

حفیظ شاہد کی شاعری میں موسیقیت کا احساس بہت گہرا ہے۔ اپنی غزلوں کے لئے بحروں کا انتخاب کرتے وقت غالباً وہ خصوصی اہتمام کرتے ہیں کیونکہ ان میں ایسی خوبصورت روانی ہوتی ہے جو ترنم سے عبارت ہے۔ اپنے شعروں میں حفیظ شاہد لفظوں کے تاروں سے کھیلتے نظر آتے ہیں جن سے ایسی نغمگی پھوٹتی ہے جو ادبی شگفتگی اور تازگی کا احساس بخشتی ہے۔ اور زندگی سے بھرپور جذبوں کی سچی عکاسی کرتی ہے۔

(شفق رنگ۔ مرتب: حیدر قریشی، ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز خان پور۔
اشاعت: ۱۹۷۹ء۔ ص: ۷۲)

☆☆☆

قطعاتِ تاریخ گوئی

ڈاکٹر شفیق احمد لکھتے ہیں:

میں نے حفیظ شاہد کا جس قدر کلام دیکھا ہے اور اُن کے جتنے مجموعے میری نظر سے گزرے ہیں ان کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے ہاں نہ اسلوب کے حوالے سے کوئی مشکل پسندی ہے اور نہ ہی خیالات کے حوالے سے الجھن پیدا کرنے والی کوئی ایسی بات جو قاری کے لئے لا ینحل ہو۔ حفیظ شاہد مختصر اور لمبی دونوں طرح کی بحروں میں کامیابی سے غزلیں کہتے ہیں۔ مثال کے

طور پر درج ذیل غزلیں ملاحظہ فرمائیں:

بارِ غم و الم سے کہیں چھت نہ گر پڑے
ڈرتا ہوں یہ بدن کی عمارت نہ گر پڑے

ہمیں نصیب کرے گھر کہ راہ میں رکھے
وہ جس مقام پہ رکھے، نگاہ میں رکھے

ہر رنگِ خوب و زشت ہے میری نگاہ میں
انسان کی سرشت ہے میری نگاہ میں

''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' میں تاریخی قطعات بھی شامل ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس فن کے حوالے سے اس وقت بہاولپور ڈویژن میں حفیظ شاہد کے علاوہ اور کوئی شاعر نظر نہیں آتا۔ اللہ اُن کا سایہ اردو شاعری پر تادیر قائم رکھے۔

کتاب: ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی... حفیظ شاہد

☆☆☆

اُردو غزل کا تابندہ شاعر... حفیظ شاہد

ایک معتبر اور پُر تاثیر آواز، غزل کی دنیا میں ایک تابندہ شاعر۔ پانچ شعری مجموعوں سے گلشنِ ادب کو سجانے والے حفیظ شاہد اس دور کے ایک کہنہ مشق اور اُستادالشعراء ہیں۔ ایک مدت سے بحرِ سخن میں غوطہ زن ہو کر زندگی کے حسین موتی چن رہے ہیں۔ نہ کبھی منجدھار کی پروا کی نہ ساحلِ مراد سے دُور ہونے کا شکوہ، بلکہ اس دور کے چند غزل گو شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔ حفیظ جالندھری اور احسان دانش کی محافل میں اپنے نغمات پیش کر کے دادِ سخن پانے والے زندہ آواز ہیں۔ ندرتِ خیال اور بلند تخلیل کی کلاسیکی روایت کا علمبردار۔ اُردو غزل کی روایت کے ساتھ ساتھ جدیدیت کا حُسن بھی آپ کے کلام کا حصہ ہے۔ ہماری تہذیب و روایت کو زندہ کرنے میں ان کی غزلیات ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔ ایسا رچاؤ، چاشنی اور تغزل کی کشش موجود ہے کہ ہم اپنے حقیقی ماحول اور صداقت سے لبریز تصورات میں کھو جاتے ہیں۔ صرف کربِ ذات تک محدود نہیں بلکہ تضاداتِ زمانہ اور حقائق روزگار سے بھی غزل کا خمیر اُٹھاتے ہیں۔ نقوشِ پارینہ کی بازآفرینی ان کی غزل کا درخشاں پہلو ہے۔ کہیں کہیں فکر کے ایسے غنچے چٹکتے ہیں کہ ان

کی خوشبو معطر کرتی چلی جاتی ہے۔ الفاظ و تراکیب کا انتخاب، مصرعوں کی بُنت اور اشعار میں شعری تلازمات کا استعمال حفیظ شاہد کے کلام کے محاسن ہیں۔ ان کے ہاں تشبیہات و استعارات کا نادر انتخاب، متوازن اور مناسب اُسلوب اس سلیقے سے ملتا ہے کہ غزل کی کائنات پُرکشش اور دیدہ زیب بن جاتی ہے۔ حسنِ بیان میں انفرادیت ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ایک ایسا آہنگ ان کے ردیف و قافیہ میں جھنکار پیدا کرتا ہے کہ ہر شعر ترنم سے لبریز دکھائی دیتا ہے۔ غزل کی دنیا میں یہ ایک منفرد آواز ہے جو اہلِ ذوق اور سخنورانِ غزل سے داد حاصل کر رہی ہے۔

(از: کاروانِ خیال، انتخابِ کلام۔ مرتب: گوہر ملیسانی

اشاعت: ادارہ عکسِ صادق، صادق آباد، ۲۰۰۱ء۔ ص: ۳۰)

☆☆☆

درویش شاعر... حفیظ شاہدؔ

پروفیسر سہیل اختر لکھتے ہیں:

بہت سے جدید شعراء نرم و ملائم الفاظ کی بجائے جدّت کے نام پر جا و بے جا کھردرے الفاظ استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا اظہار و بیان میں جہاں دل کا تقاضا ہوتا ہے وہاں وہ دماغ رکھ دیتے ہیں۔ لیکن ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' کے شاعر، بقول کالرج "The best words in best order is the true definition of poetry." لفظوں کے بہت بڑے پارکھ ہیں اور ان کے استعمال کا خوبصورت قرینہ اور سلیقہ ان کے اظہار کا جزوِ لاینفک بن گیا ہے۔

حفیظ شاہدؔ کے کلام کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے کوئی گلیم بردوش درویش علی الصباح کسی اونچے ٹیلے پر بیٹھا نسیم و صبا کے دوش پر لہراتی ہوئی اپنی آواز کی لہروں سے ہماری سماعت کو حال کے کربناک مسائل اور آئندہ کی راست خوئی اور راست روی سے آگاہ کرتے ہوئے ہمیں یوں زندگی کرنے کا ہنر سکھا رہا ہو کہ ہم اس کے دلنشیں لہجے سے اپنے جسم و جاں میں ایک توانائی سی محسوس کرتے ہوئے اُس کی طرف سپاس گزار نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں۔ اور حفیظ شاہدؔ کا یہی طلسماتی ہنر ان کے تازہ شعری مجموعے ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' کی ملک گیر وسعتوں میں پھیلی ہوئی پذیرائی کا ضامن ہے۔

(از کتاب: ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' از حفیظ شاہدؔ)

☆☆☆

حفیظ شاہدؔ... مختصر مختصر

حفیظ شاہدؔ، طالب انصاری بدایونی سے ابتدائی کلام کی اصلاح لی۔ ایف۔ اے کیا اور حبیب بینک میں ملازم ہو گئے۔ دفتر سے فارغ ہو کر آپ ماہنامہ ''محفل'' لاہور کے دفتر میں چلے جاتے۔ طفیل ہوشیار پوری، یزدانی جالندھری، شرقی بن شائق اور وہاں آنے والے دیگر شعرا سے ملاقاتیں رہتیں۔ مصرعہ ہائے طرح دیے جاتے، ادبی اور تنقیدی گفتگو ہوتی۔ اس ماحول میں رہ کر حفیظ شاہدؔ کو مشقِ سخن کے وہ مواقع ہاتھ آئے جو عموماً ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتے۔ اپنے لاہور قیام کے دوران آپ نے دو پنجابی فلموں ''بلبل پنجرے دی'' اور ''چھڈ بُرے دی یاری'' کے لیے گیت لکھے۔ یہ گیت نور جہاں، رجب علی اور مالا کی آوازوں میں ریکارڈ ہوئے۔ غالباً ۱۹۷۶ء میں آپ تحصیل خانپور کٹورہ (ضلع رحیم یار خان) ہجرت کر آئے۔ آپ کی آمد سے خانپور کٹورہ کو نیا ادبی تشخص ملا۔ آپ پر خلوص، سادہ مزاج اور محبت کرنے والے آدمی تھے۔ اہلِ خانہ سے حسنِ سلوک کرتے۔ مہمانوں کی خاطر داری کرتے۔ دوستوں سے پیار کرتے۔ اپنے مخاطب کی بات توجہ سے سنتے۔ غیر ضروری، بے بنیاد، اور ناشائستہ گفتگو سے پرہیز کرتے۔ امن پسندی اور انسان دوستی آپ کے شعائر تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

انساں کا احترام تھا اتنا ہمیں عزیز
ہم اپنے دشمنوں سے بھی نفرت نہ کر سکے

جس آدمی کی حفیظ شاہدؔ سے ملاقات ہوئی اور ان سے کوئی تعلق رہا، وہ ان کے حسنِ اخلاق کا گرویدہ رہا۔ حفیظ شاہدؔ کے چھ شعری مجموعے شائع ہوئے۔ وہ بنیادی طور پہ غزل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے نظمیں بھی لکھیں مگر ان کو کتابوں میں شائع کرانا مناسب نہیں سمجھا۔ البتہ ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' میں غزلوں کے علاوہ قطعاتِ تاریخ بھی شامل ہیں۔ یہ تمام کتابیں خانپور قیام کے دوران شائع ہوئیں۔

ان کی کتابوں پر اُردو کے معروف ترین نقادوں اور اہلِ فن کے طویل دیباچے، فلیپ، اور مختصر آرا شامل ہیں۔ جن سے حفیظ شاہدؔ کا شعری مرتبہ جاننے، جانچنے، اور ان کے کلام کی خصوصیات کو ملاحظہ کرنے میں مدد لی جاسکتی ہے۔ ان رائے دہندگان میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، عارف عبدالمتین، رئیس امروہوی، ڈاکٹر جمیل جالبی، شفیق الرحمن، مظہر امام، محسن نقوی، حفیظ الرحمن احسن، ڈاکٹر وحید قریشی، یزدانی جالندھری، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، شبنم رومانی، پروفیسر سہیل اختر، ڈاکٹر شفیق احمد، اظہر جاوید، گوہر ملسیانی اور ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے نام شامل ہیں۔ حفیظ شاہدؔ کو ان کے کلام کے معیار اور مقدار کا لحاظ کرتے ہوئے خانپور کٹورہ میں اُردو غزل کی روایت کا سب سے بڑا شاعر کہا جاسکتا ہے۔ بائیس نومبر ۲۰۱۳ء کی رات ان کا انتقال ہو گیا۔ انہیں مدرسہ ''مخزن العلوم'' خانپور سے ملحقہ قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ (یاور عظیم)

☆☆☆

محمد یوسف وحید (مدیر) — پیش حرف

حفیظ شاہد کا غیر مطبوعہ کلام

سرِ بازار بیچا ہے قلم کو
سخن سازوں، قلم کاروں نے اکثر
(حفیظ شاہد)

حفیظ شاہد کا ادبی اثاثہ ۱۹۸۳ء تا ۲۰۱۰ء کے دوران چھ شعری مجموعے اور کلیات ''ختمِ سفر سے پہلے'' سنگِ میل پبلی کیشنز اور الحمد پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ غزلیں، نظمیں، قطعات معروف ادبی جرائد ''شمع، محفل، قندیل، بیسویں صدی، اقدام، لیل و نہار، جدید ادب'' ہفت روزہ ''زندگی'' اور سہ ماہی ''بچے من کے سچے'' میں شائع ہو چکی ہیں۔ حفیظ شاہد نے غزل کے ساتھ ساتھ اخبارات میں قطعات اور قطعہ تاریخ بھی لکھے۔

اُردو غزل کے منفرد شاعر حفیظ شاہد خان پور سے شائع ہونے والا بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول مجلّہ ''بچے من کے سچے'' کے ۲۰۰۷ء تا ۲۰۱۴ء (۷ سال) بطور چیف ایڈیٹر اپنی ذمہ داریاں بطریقِ احسن سرانجام دیتے رہے۔ علمی، ادبی اور ثقافتی تنظیم ''الوحید ادبی اکیڈمی'' خان پور کو بھی حفیظ شاہد کی سرپرستی حاصل رہی۔ اسی پلیٹ فارم سے ہی مجلّہ ''بچے من کے سچے'' نے سال ۲۰۱۷ء میں حفیظ شاہد کے فن و شخصیت کے حوالے سے خصوصی گوشہ شائع کیا۔ جس میں مقامی اُدبا و شعراء کی تحریریں شائع کی گئیں۔

حفیظ شاہد نہایت اعلیٰ اخلاق اور صفات کے حامل خوب سیرت انسان تھے۔ ہر ملنے والے سے محبت و خلوص سے پیش آتے۔ وہ دوستوں کے درمیان احترام و اکرام کا خوب انتظام کرتے۔ میرے ذاتی مشاہدے میں ہے کہ مجلّہ ''بچے من کے سچے'' کے حوالے سے بالخصوص اور مختلف تقریبات و دیگر مواقعوں پر بالعموم کبھی بھی اُن میں تکبر اور بڑاپن نہیں دیکھا۔ حفیظ شاہد کو ہمیشہ مہربان اور شفیق دوست ہی پایا۔

☆☆☆

حفیظ شاہد (مرحوم) کا کلیات ''ختمِ سفر سے پہلے'' ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد بھی ان کی غزل گوئی کا سلسلہ جاری رہا۔ اپنے ادبی سفر کے دوران انہوں نے گاہے بگاہے نعتیں بھی کہی تھیں۔ اُن نعتوں کی تعداد ۲۰۱۰ء میں چالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ اسی طرح حفیظ شاہد کا پنجابی کلام تھا جس میں پنجابی غزلیں اور گیت شامل تھے۔ ان پنجابی فن پاروں کی تعداد بھی چالیس کے قریب پہنچتی تھی۔ حفیظ شاہد ایک کہنہ مشق اور زود گو شاعر تھے۔ اُن کی چھ سو سے زائد غزلوں پہ مشتمل کلیات ''ختمِ سفر سے پہلے'' کے نام سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنی طویل ادبی مسافت سے تھکے نہیں تھے۔ اُنھوں نے کلیات کی اشاعت کے بعد مختلف ملاقاتوں اور مواقع پہ اس بات کا

ارادہ اور خواہش ظاہر کی کہ وہ اُردو غزلوں، اُردو نعتوں اور پنجابی کلام کی تین علاحدہ کتابیں چھپوانے چاہتے ہیں۔

اس دوران ایک ناخوش گوار واقعہ ہوا۔ حفیظ شاہد کی ایک بیاض جس میں بیس بائیس تازہ غزلیں لکھی تھیں، غالباً گھر میں چھوٹے بچوں کے ہاتھ لگ گئی اور پھر نہ مل سکی۔ اس بات کا حفیظ شاہد کو بطور ایک تخلیق کار قلق ہوا۔ لہٰذا اُنھوں نے جب کچھ توقف کے بعد دوبارہ غزل کے سلسلے کو بحال کیا تو تازہ غزلیات اپنی بیاض پہ نوٹ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مقامی کمپوزر سے بھی ٹائپ کروالیتے تا کہ بیاض کی گمشدگی کی صورت میں غزلوں کا ایک اضافی نسخہ کمپوزر کے پاس محفوظ رہ سکے۔ اس طرح انہوں نے کچھ عرصے میں چالیس کے قریب غزلیں دوبارہ کہہ لیں۔

حفیظ شاہد کی رحلت ہی اُن کے اہلِ خانہ، تلامذہ، متعلقین اور پرستاروں کے لیے ایک عظیم سانحے سے کم نہ تھی اس پہ تقدیر کا ستم یہ ہوا کہ فوتیدگی والے گھر میں اعزا و اقربا کی آمد اور تعزیت کرنے والوں کی بھیڑ میں اُن کی نعتیہ بیاض اور پنجابی کلام پہ مشتمل بیاض کہیں گم ہو گئی۔ جب اہلِ خانہ اور محبین کے آنسوؤں کا تار ٹوٹا اور وقت نے زخمِ رحلت پہ پھاہے رکھے تو یہ خیال ہوا کہ اُن کا غیر مطبوعہ کلام حفیظ شاہد کی خواہش کے مطابق **"حاصلِ غزل"** کے عنوان سے شائع کروایا جائے۔ اس کے لیے سب سے پہلے حفیظ شاہد کے بیٹے سلمان حفیظ سے رابطہ کیا گیا۔ انہوں نے اپنے والدِ مرحوم کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس بات پہ بھرپور تعاون کی حامی بھری۔ خوش قسمتی سے حفیظ شاہد مرحوم کی اُردو غزلیات محفوظ تھیں لیکن اُن کی نعتیہ اور پنجابی کلام کی بیاضیں تلاشِ بسیار کے باوجود نہ مل سکیں۔ ہم نے اَز خود اُن کی بیٹھک کی شیلفوں کو کئی بار کھنگالا مگر وہ بیاضیں ہمارے ہاتھ نہ لگ سکیں۔ اتنا ضرور ہوا کہ ایک پرانی ڈائری مل گئی جس میں پنجابی کا کچھ کلام پہلے کا لکھا ہوا تھا۔ ہم نے اُس کو بھی غنیمت جانا اور اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ حفیظ شاہد مرحوم کی خواہش اور اُن کے پرستاروں کی شدتِ انتظار کو دیکھتے ہوئے ہم ان کا دست یاب غیر مطبوعہ کلام بعنوان **"حاصلِ غزل"** شائع کر رہے ہیں۔ اس غیر مطبوعہ کلام کی عددی ترتیب یوں ہے۔

☆ اُردو غزلیں: ۳۴ (چونتیس) ☆ اُردو گیت: ۰۲ (دو) ☆ پنجابی غزلیں: ۱۳ (تیرہ)
☆ ملی نغمے: ۰۲ (دو) ☆ پنجابی گیت: ۰۸ (آٹھ)

حفیظ شاہد بڑی چابک دستی سے اپنا فنی سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ اسی دوران اُن کی طبیعت کافی خراب ہو گئی۔ علاج کے سلسلے میں شیخ زید ہسپتال رحیم یار خان میں داخل رہے مگر طبیعت سنبھل نہ سکی اور ۲۲ نومبر ۲۰۱۴ء بروز ہفتہ کو جہانِ فانی سے رُخصت ہو گئے۔ نامور شاعر تنویر پھول نے قطعہ تاریخ وفات لکھا۔

دنیا سے چل بسے ہیں ختمِ سفر کے خالق
اے پھول! وہ تھے گویا علم و ادب کا قلزم
اصلاح کر رہے تھے وہ جادۂ سخن کی
شاعر حفیظ شاہد، صلحِ ادب کہو تم

(تاریخ عیسوی تاجدار ملکِ ادب حفیظ شاہد)

پھول! رخصت اِک سخن ور ہو گیا
سامنے جس کے سدا تھی فن کی رہ

اس کا یہ سرمایۂ فکرِ سخن
"مایۂ ختم" سفر تاریخِ کہہ
(ختم سفر، زاویہ طوبیٰ)

☆☆☆

علمی و ادبی تنظیم "الوحید ادبی اکیڈمی" سے حفیظ شاہد کی دلی وابستگی اور "بچے من کے سچے" کے بطور چیف ایڈیٹر اور ایک محترم ادیب دوست ہونے کے ناطے حفیظ شاہد کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے ہماری بھرپور خواہش رہی کہ ہم جلد از جلد حفیظ شاہد مرحوم کے غیر مطبوعہ کلام کو کتابی صورت میں شائع کریں۔ اس خواہش کے تکمیل کے لیے ہم نے مقامی احباب کو حفیظ شاہد... فن و شخصیت کے عنوان سے مضامین لکھنے کے لیے رابطہ کیا۔ اسی دوران جن احباب کو ہم نے حفیظ شاہد کے لیے مضامین لکھنے کی دعوت دی تھی۔ ان میں سے چند افراد نے مقامی کمپوزر سے غیر مطبوعہ کلام کو حاصل کر کے اُسے شائع کرنے کا اعلان کر دیا۔ ہم نے مخلص احباب سے مشاورت کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ جن لوگوں نے حفیظ شاہد کا کلام شائع کرنے کا اعلان کیا ہے، ان کے ساتھ ہر ممکن تعاون کی پیش کش کی جائے اور پھر ان کی طرف سے جواب کا انتظار کیا جائے۔ اسی دوران ہم نے اپنی طرف سے بھرپور تعاون اور مشاورت فراہم کرنے کی کوشش کی۔ واضح رہے کہ ۲۰۱۴ء سے ۲۰۱۷ء (۳ سال) تک حفیظ شاہد کا غیر مطبوعہ کلام مختلف مواقعوں پر ہماری طرف سے یاد دہانی کروانے کے باوجود بھی حیلوں، بہانوں، چال بازیوں اور خود پرستی کی وجہ سے منظرِ عام پر نہ آ سکا۔

۲۰۱۷ء میں ہم نے "بچے من کے سچے" میں حفیظ شاہد کے حوالے سے خصوصی گوشہ شائع کرنے کا ارادہ کیا تو ایک مرتبہ پھر مقامی اور غیر مقامی اُدباء و شعرا کو حفیظ شاہد کے حوالے سے تحریریں اور کلام کے لیے دعوت دی گئی۔ حفیظ شاہد کے غیر مطبوعہ کلام کے حوالے سے ایک مرتبہ پھر کلام مہیا کرنے کی استدعا کی گئی مگر کوئی مثبت جواب نہ ملنے کے باوجود ہم نے الحمدللہ شمارہ اپریل تا جون ۲۰۱۷ء میں دستیاب جملہ وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے پُرخلوص جذبے اور نیک نیتی کو شاملِ حال رکھتے ہوئے "بچے من کے سچے" میں خصوصی گوشہ شائع کیا۔ جسے ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔

۲۰۱۷ء سے ۲۰۲۱ء جو کہ (۴) سال کا عرصہ بنتا ہے۔ نہایت افسوس اور بدقسمتی سے چند لوگوں کی مستقل کاہلی، سستی، بدنیتی اور سازشوں کی وجہ سے حفیظ شاہد کا غیر مطبوعہ کلام تاحال کتابی صورت میں شائع نہیں ہو سکا۔ ایسے لوگوں کا عموماً مزاج یہ ہے کہ اوّل خود کام نہیں کرتا اور اگر کوئی دوسرا کر رہا ہو یا ارادہ رکھتا ہو تو اس کے کام میں حصہ بقدر جثہ بطور ثواب اپنا حق اور فرض سمجھتے ہیں۔ ادبی دنیا میں ایسے بے ثبات اور بے حس و نامراد لوگ بستے ہیں جو کسی کے سامنے اپنے مؤقف کے حق میں ایک دلیل بھی نہیں رکھتے مگر پیٹھ پیچھے اپنی بڑائی اور دوسروں کی برائیاں بیان کرتے نہیں تھکتے۔ بہرحال ان جز وقتی رکاوٹوں اور مشکلات سے نبرد آزما ہونا قدرت اور وقت نے ہمیں سکھا دیا ہے۔

ان شاء اللہ ہم اسی جذبے اور ولولے کے ساتھ خوب سے خوب تر کی تلاش کا سفر جاری و ساری رکھیں گے۔

ان شاء اللہ ہم اسی جذبے اور ولولے کے ساتھ خوب سے خوب تر کی تلاش کا سفر جاری وساری رکھیں گے۔
مخلص احباب کی دُعاؤں اور پُرخلوص محبتوں کے طفیل ڈویژن بہاول پور میں ادبِ اطفال کا نمائندہ "بچے من کے سچے" اور اُردو، پنجابی اور سرائیکی زبان میں نثری اور شعری تخلیقات کا کتابی سلسلہ "شعوروادراک" اپنا علمی، ادبی، فکری اور سماجی شعور کا سفر جاری رکھیں گے۔

"شعوروادراک" کے تازہ خاص شمارہ "حفیظ شاہد نمبر" آپ کے ہاتھوں میں ہے۔آپ کو یہ کاوش، تحریروں کا اُسلوب اور حصہ شاعری کا انتخاب کیسا لگا؟

ہمیں آپ کی قیمتی آراء وتجاویز کا انتظار رہے گا۔ "شعوروادراک" میں آپ کسی خاص ادبی شخصیت کے حوالے سے خصوصی گوشہ یا خاص نمبر شائع کرانا چاہتے ہیں تو اس سلسلے میں "شعوروادراک" کا پلیٹ فارم حاضر ہے۔
آیئے، علم وادب کے میدان میں اپنے خطے کے اُدباء وشعراء کو خراجِ تحسین پیش کریں۔

"حفیظ شاہد نمبر" میں محترم حفیظ شاہد کا غیر مطبوعہ کلام جو کلیات "ختمِ سفر سے پہلے" کے بعد سے لے کر ۲۰۱۴ء تک کا ہے۔جس میں اُردو نعتیں، غزلیں اور پنجابی کلام شامل ہیں۔یہ کلام حفیظ شاہد کے بیٹے سلمان شاہد اور محترم ادیب دوست اظہر عروج اور یاور عظیم کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔

"الوحید ادبی اکیڈمی" اور "شعوروادراک" اس عظیم علمی وادبی اثاثے کی فراہمی پر اپنے مخلص احباب کا بے حد ممنون ومشکور ہے۔ہم اس ادبی اثاثے کو پُرخلوص جذبات اور احساسات کے ساتھ فخریہ طور پر "شعوروادراک" کے ذریعے قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔

حفیظ شاہد مرحوم کا کچھ مزید کلام بھی پرانی ڈائری کی صورت میں ہمیں شمارے کی تیاری کے آخری مراحل میں حفیظ شاہد کے چھوٹے بیٹے سلمان شاہد اور حفیظ شاہد کے داماد اختر رسول چودھری صاحب سے دستیاب ہوا ہے۔اس عظیم علمی وادبی اثاثے کی فراہمی پر ہم تمام احباب کے ممنون ومشکور ہیں۔
ان شاء اللہ بہت جلد اس کلام کو علیحدہ کتابی صورت میں ترتیب دیا جائے گا۔

☆☆☆

مرتب: محمد یوسف وحید　　　　　　اُردو غزلیات

حاصلِ غزل

حفیظ شاہد مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام

۲۰۱۰ء تا ۲۰۱۳ء

غزل

اس طرف اندھیرا ہے، اُس طرف اُجالا ہے
یہ مرا حوالہ ہے ، وہ ترا حوالہ ہے
منتظر کبھی کا میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوں
اور یہ نہیں معلوم کون آنے والا ہے
اس زمین پر کتنے قتل روز ہوتے ہیں
جانے کیوں خموش اب تک آسمان والا ہے
غور سے ذرا دیکھو ہر کتاب چہرے کی
اک نیا صحیفہ ہے ، اک نیا حوالہ ہے
اُس کو غیر ہم سمجھیں ، یا اُسے کہیں اپنا
اُس کی بے نیازی نے مخمصے میں ڈالا ہے
خود سے لاتعلق ہوں ، آپ اپنا دشمن ہوں
کسی عجیب سانچے میں اُس نے مجھ کو ڈھالا ہے
کیا ڈرے گا دل شاہد وقت کے مصائب سے
گردشوں کا خوگر ہے، سختیوں کا پالا ہے

غزل

نہ ہو دل کو اگر آزار کوئی
نہیں ہے زندگی دُشوار کوئی
کچھ ایسے ہیں نوادر اس جہاں کے
مجھے لگتا ہے یہ بازار کوئی
لڑائی پھر بھی ہے جاری ہماری
نہیں ہے باعثِ بیکار کوئی
ہمیں تو اس ستم پرور جہاں میں
نظر آتا نہیں غم خوار کوئی
نہیں اب ہم کسی سے رُکنے والے
نہ روکے راستہ بے کار کوئی
ابھی گرنے کو ہے دیوار شاہد
سنبھل جائے پسِ دیوار کوئی

☆

غزل

اگر فیضِ ہوا باقی رہے گا
نمو کا سلسلہ باقی رہے گا
میں چاہے چاند کو مسکن بنا لوں
زمیں سے رابطہ باقی رہے گا
اپیلیں کیا کریں اب اُس کے آگے
اُسی کا فیصلہ باقی رہے گا
نظر آتے رہو گاہے بہ گاہے
تعلق کچھ ذرا باقی رہے گا
ہمارے دل کے گلشن میں ہمیشہ
یہ موسم خر کا باقی رہے گا
شکستِ فاش دے کر دیکھ لو تم
ہمارا حوصلہ باقی رہے گا
سُنائیں رات بھر تجھ کو تو پھر بھی
ہمارا ماجرا باقی رہے گا
مجھے تو ایک دن مِٹنا ہے شاہدؔ
مگر میرا کہا، باقی رہے گا

غزل

نہ روک تُو کسی نا مہربان کا رستہ
دِکھا نہ دے تجھے اگلے جہان کا رستہ
چمک رہے ہیں ستارے، دمک رہا ہے قمر
سجا ہُوا ہے بہت آسمان کا رستہ
دُعا جو مانگی تھی میں نے قبول کیا ہوتی
عبُور کر نہ سکی آسمان کا رستہ
نہ پُوچھ مجھ سے یہاں کس طرح میں پہنچا ہوں
بہت خراب ہے تیرے مکان کا رستہ
جہاں جہاں سے گزرنا ہے زندگی میں مجھے
وہیں وہیں ہے مرے امتحان کا رستہ
خدا کرے کہ ترے آستان تک پہنچوں
بھٹک نہ جاؤں ترے آستان کا رستہ
نہ راہ رو ہیں شناسا، نہ رہبروں کو پتا
تلاش کون کرے کارواں کا رستہ
مرے نصیب میں شاہدؔ تھی دشت پیمائی
مِلا نہ مجھ کو کسی گلستان کا رستہ

غزل

کیا تجھے بھی ہے یہ لکھا معلوم؟
تُو مرا بخت، میں ترا مقسوم

کون یہ فیصلہ سُنائے گا؟
کون ظالم ہے، کون ہے مظلوم؟

اک ہمی ہیں عتاب کے قابل
تم بھی معصوم، لوگ بھی معصوم

تم ادھوری سی بات کرتے ہو
کون سمجھے گا بات کا مفہوم؟

مجھ کو اکثر خیال آتا ہے
کیا اجل بھی ہے قابلِ معدوم؟

جی رہا تھا ترے سہارے پر
کتنا ناداں تھا یہ دلِ مرحوم

مجھ کو ہونا تھا در بدر شاہدؔ
تھا مرے بخت میں یہی مرقوم

☆

غزل

بات جو کہنی ہو ، کہنی چاہیے
ان کہی دل میں نہ رہنی چاہیے

فصلِ دل کی آبیاری کے لیے
آبِ جُو آنکھوں کی بہنی چاہیے

دردِ محرومی بڑا اک روگ ہے
بے ثمر کوئی نہ ٹہنی چاہیے

ہارنے کے بعد بھی انسان کو
جیتنے کی آس رہنی چاہیے

حوصلہ مندی اسی کا نام ہے
ہر مصیبت ہنس کے سہنی چاہیے

☆

غزل

چل نہ پائے جنوں کی راہوں میں
مُعتکف ہیں جو خانقاہوں میں

ہم بھی ٹھہرے ہیں قابلِ تعزیر
ہم بھی شامل تھے بے گناہوں میں

ہم مسلسل سفر میں رہتے ہیں
وقت کی سنگلاخ راہوں میں

ہم ہیں دستار کے بغیر اچھے
وقتِ حاضر کے کج کُلاہوں میں

محوِ آرام ہیں اندھیرے بھی
اُن گھروں کی پناہ گاہوں میں

سو رہے ہیں چمن چمن غُنچے
موسموں کی گداز باہوں میں

جو ہیں بے زاویہ ابھی شاہدؔ
مَیں کھٹکتا ہوں اُن نگاہوں میں

☆

غزل

مستقل کسی رُت کا سلسلہ نہیں چلتا
موسمی تغیر کا کچھ پتا نہیں چلتا

تم مری صداقت کو کس طرح خریدو گے
اِس دُکان پر سکّہ جھوٹ کا نہیں چلتا

جو بھی دل میں رکھتا ہو پیار آدمیت سے
وہ کبھی عداوت کا راستہ نہیں چلتا

صبر جس کا مسلک ہو، عقل جس کی رہبر ہو
زندگی کے رستے میں وہ بُرا نہیں چلتا

ایک ہی سفر اپنا ، ایک ہی ڈگر اپنی
بے جہت یہاں کوئی قافلہ نہیں چلتا

ایک دن خلش دل کی دُور ہو ہی جاتی ہے
دائمی کدُورت کا سلسلہ نہیں چلتا

موج موج پر شاہدؔ وہ نگاہ رکھتا ہے
بے خبر تلاطم سے ، ناخدا نہیں چلتا

☆

غزل

اے اجل انتظار کس کا ہے؟
اب یہ جسمِ نزار کس کا ہے؟

تجھ سے بڑھ کر خبر کسے ہو گی؟
یہ ترا جاں نثار کس کا ہے؟

دیکھنا یہ دیار کس کا تھا
سوچنا! وہ دیار کس کا ہے؟

ہوکے بے اختیار سوچتا ہوں
جان پر اختیار کس کا ہے؟

لمحہ لمحہ بتا رہا ہے مجھے
وقت کا خار زار کس کا ہے؟

میرے بارے میں کون پوچھے گا
یہ غریب الدّیار کس کا ہے؟

کاش وہ پوچھ لے کبھی شاہدؔ
تیرے سر پر اُدھار کس کا ہے؟

☆

غزل

سُنا ہے دورِ ستم گر بدلنے والا ہے
ستم کشوں کا مقدر بدلنے والا ہے

یہ خاک بھی نظر آتی ہے بدلی بدلی سی
وہ آسمان بھی تیور بدلنے والا ہے

کشاں کشاں چلا آتا ہے اک نیا موسم
لباسِ سرو صنوبر، بدلنے والا ہے

مہ و نجوم کی کیفیتیں بتاتی ہیں
سحر قریب ہے، منظر بدلنے والا ہے

جسے میں اپنا سمجھ کر قریب لایا تھا
مرے قریب سے وہ گھر بدلنے والا ہے

تمام رند ہیں بے کل، اداس ہے ساقی
رواجِ بادہ و ساغر، بدلنے والا ہے

کہا ہے ایک نجومی نے برملا شاہدؔ
ترے نصیب کا چکر بدلنے والا ہے

☆

غزل

کچھ چھپانا ہے، کچھ بتانا ہے
شعر کہنا تو اک بہانہ ہے

یوں تصاویر ہیں تصور میں
جیسے یہ بھی نگار خانہ ہے

ساری دُنیا کا درد رکھتا ہوں
ساری دُنیا مرا گھرانہ ہے

وہ زمانہ تھا بادشاہوں کا
یہ زمانہ، مرا زمانہ ہے

اپنی تقدیر سے میں کیا پوچھوں
کب ہنسانا ہے، کب رُلانا ہے

اپنے انجام تک نہیں پہنچا
نامکمل مرا فسانہ ہے

ساتھ سُورج کے کیا چلوں؟ اس نے
شام ہوتے ہی ڈوب جانا ہے

ختم ہوتا نظر نہیں آتا
قتل کا سلسلہ پُرانا ہے

میں ہوں ایسا شجر، جسے شاہد
آندھیوں سے خراج پانا ہے

☆

غزل

بڑھ گئی ہے تیری مدہوشی بہت
لے نہ ڈوبے تجھ کو مے نوشی بہت

پیشِ خیمہ ہے کسی طوفان کا
شہر پہ طاری ہے خاموشی بہت

عُمر بھر تھی راہ کا سنگِ گراں
یہ ہماری خود فراموشی بہت

وقت کی آواز سُنتے ہی نہیں
ہم کو لے بیٹھی گراں گوشی بہت

میرے مسکن کے در و دیوار سے
تیرگی ہے محوِ سرگوشی بہت

ہوگئی مشہور شاہدؔ ان دنوں
شہر بھر میں میری رُوپوشی بہت

☆

غزل

ملے ہیں مجھ سے آ کر عید کتنے
مرے احباب ہیں بے دید کتنے

بنایا جس نے ہے وہ جانتا ہے
پسِ خورشید ہیں، خورشید کتنے

خبر ہے کچھ مرے رہبر کہ تجھ سے
ہوئے ہیں لوگ ناامید کتنے؟

ہمیں پڑھ کر یہ اندازہ لگا لو
کہ ہم ہیں قابلِ تقلید کتنے؟

نہ سوچو کوئی کچی بات کہہ کر
کریں گے بات کی تائید کتنے؟

خدا بس ایک ہے، سب مانتے ہیں
مگر ہیں قائلِ توحید کتنے؟

نہ جانے میرے فرمودے پہ شاہدؔ
چلیں گے خنجرِ تنقید کتنے؟

☆

غزل

کوئی خوف و خطر نہیں رکھتے
لوگ جو مال و زر نہیں رکھتے

جان جن کو عزیز ہوتی ہے
وہ ہتھیلی پہ سر نہیں رکھتے

موجِ طوفاں سے کھیلنے والے
ساحلوں پر نظر نہیں رکھتے

وہ پرندے جو اُڑ نہیں سکتے
خواہشِ بال و پر نہیں رکھتے

اس چمن کے ہیں باغباں ایسے
فکرِ حفظِ شجر نہیں رکھتے

خوب ہیں اپنے قافلہ سالار
راستوں کی خبر نہیں رکھتے

جن کو پاسِ ہُنر نہیں شاہدؔ
وہ شعورِ ہُنر نہیں رکھتے

☆

غزل

اپنی محبتوں کی یہی رُوئداد ہے
میں ہوں تری مُراد، تُو میری مراد ہے

رکھا ہے اور کیا مرے دشتِ حیات میں؟
ہر اک قدم سراب ہے، طُوفان یاد ہے

اُس کا خیال اور ہے، میرا گمان اور
یہ اختلاف آج بھی وجہِ فساد ہے

انکار تو نہیں ہے مجھے اختلاف سے
پیشِ نگاہ اُس کے مگر انتقاد ہے

دیتی نہیں ہے زیب کنارہ کشی مجھے
ہر چند اُس کے قول و عمل میں تضاد ہے

مجھ کو جھکا سکے گا کہاں جو زِندگی؟
لاریب! مجھ کو خود پہ بڑا اعتماد ہے

بخشے گا وہ ضرور مری لغزشیں تمام
شاہدؔ! مرا یقین، مرا اعتقاد ہے

☆

غزل

مشکل ہے جن کو کرب و اذیت کا سامنا
کیسے کریں گے دشتِ مصیبت کا سامنا

پھر کیوں نہ لڑکھڑاؤں سرِ راہ آرزو
مجھ کو ہے ایک اندھی مسافت کا سامنا

کب تک چھُپو گے جھوٹ کی چادر میں دوستو؟
اک روز تو کرو گے حقیقت کا سامنا

یہ دن بھی دیکھنے تھے ہمیں اپنے دیس میں
اشراف کر رہے ہیں فضیحت کا سامنا

بے اختیاریاں ہیں کچھ ایسی کہ اب مجھے
اپنی ہی ذات سے ہے بغاوت کا سامنا

شاہدؔ مجھے کسی بھی قیامت کا ڈر نہیں
ہر روز کر رہا ہوں قیامت کا سامنا

☆

غزل

مُلتوی ہر فیصلہ ہوتا رہا
قتل یوں انصاف کا ہوتا رہا

وہ مرے فکرِ سُخن کی جان تھا
شعر جو بے ساختہ ہوتا رہا

اُس کے بارے میں زبانیں بند تھیں
اور ہم پر تبصرہ ہوتا رہا

چلنے والے بے دھڑک چلتے رہے
بند ہم پر راستہ ہوتا رہا

ہم مناظر میں کچھ ایسے گُم ہوئے
دُور ہم سے قافلہ ہوتا رہا

روز ہم لڑتے رہے حالات سے
روز تازہ معرکہ ہوتا رہا

ہم نہ شاہدؔ کچھ تدارک کر سکے
حادثے پر حادثہ ہوتا رہا

☆

غزل

سُناتا رہا وہ مسلسل کہانی
مگر ہو نہ پائی مکمل کہانی

وہی ہیں کہانی کے کردار سارے
مگر لگ رہی ہے مبدّل کہانی

بدلتے ہوئے وقت کی، اس جہاں میں
بدلتی رہے گی ہر اک پل کہانی

کبھی تو جُھلستی ہوئی کھیتیوں کا
سُنائیں گے ساون کے بادل کہانی

مری زندگی لگ رہی ہے فسانہ
حقیقت میں ہے یہ مدلّل کہانی

ابھی زیرِ تنقید کیا اس کو لائیں
کہانی ہے یہ، نامکمل کہانی

نئے آنے والے پرندوں کو شاہدؔ
سُناتے رہیں گے یہ جنگل کہانی

☆

غزل

ہم ہیں مدت سے ہم قدم اُس کے
غم ہمارے ہیں، سارے غم اُس کے

ایک مدت سے آشنائی ہے!
پھر بھی واقف نہیں ہیں ہم اُس کے

کیوں وہ پُوجا کرے صنم کوئی؟
خود پجاری ہیں یہ صنم اُس کے

ہم نے سیکھا ہے زندگی کا چلن
ساتھ چل کر قدم قدم اُس کے

بھول جاتے ہیں ہر ستم اُس کا
یاد رکھتے ہیں سب کرم اُس کے

خوش نصیبی کی بات ہے شاہدؔ
وہ ہمارا ہے اور ہم اُس کے

غزل

در کو دیکھیں تو در نہیں لگتا
گھر ہمارا تو گھر نہیں لگتا

ہم کلامی، نہ ربطِ باہم ہے
تو مرا ہم سفر نہیں لگتا

ہر جگہ ہے مرے نگر جیسی
یہ پرایا نگر نہیں لگتا

لوگ بدلے ہوئے ہیں کچھ ایسے
معتبر، معتبر نہیں لگتا

چلتے چلتے میں آ گیا ہوں کہاں
یہ مرا مستقر نہیں لگتا

جس قدر خود کو وہ سمجھتا ہے
اُس قدر باخبر نہیں لگتا

سوچتے ہیں کہیں چلے جائیں
دل ہمارا ادھر نہیں لگتا

شاخ کس کام کی ہے وہ شاہدؔ؟
جس پہ کوئی ثمر نہیں لگتا

☆

غزل

اپنا ضمیر تم نے یہ کیسا بنا لیا؟
زندہ بنا لیا، کبھی مردہ بنا لیا

جیسا مرے خیال نے چاہا بنا لیا
دریا کو موج، موج کو دریا بنا لیا

ہو کر ہر ایک شخص کے دُکھ درد میں شریک
ہم نے ہر ایک شخص کو اپنا بنا لیا

ہم تھے وہ غم گسار کہ اس کی حیات کے
ہر غم کو اپنی ذات کا حصّہ بنا لیا

ہم کو سخن وری سے ہوا کچھ نہ فائدہ
اوروں نے کام کاج سے پیسا بنا لیا

حیرت ہے لوگ ہم کو سمجھنے لگے بُرا
جب ہم نے اپنے آپ کو اچھا بنا لیا

شاہدؔ، خدا نے ہم کو بنایا تھا آفتاب
خود ہم نے اپنے آپ کو ذرّہ بنا لیا

☆

غزل

ہم دُعا کیا کریں، وقت مِلتا نہیں
اے خدا کیا کریں، وقت مِلتا نہیں

اپنے روٹھے ہوئے دوستوں سے کبھی
رابطہ کیا کریں، وقت مِلتا نہیں

منصفی کے لیے، تیری سرکار میں
التجا کیا کریں، وقت مِلتا نہیں

اتنے مصروف ہیں، اک نئے کام کی
ابتدا کیا کریں، وقت مِلتا نہیں

دُشمنوں سے پُرانی عداوت پہ ہم
تصفیہ کیا کریں وقت مِلتا نہیں

بے گھروں کے لیے مُفلسوں کے لیے
رہنما کیا کریں وقت مِلتا نہیں

شاہدؔ غم زدہ ، گردشِ وقت کا
سامنا کیا کریں وقت ملتا نہیں

☆

غزل

نہ غیروں سے نہ باطل سے لڑائی
ہماری ہے مسائل سے لڑائی

تجھے بھی ایک دن کرنی پڑے گی
مرے مدِ مقابل سے لڑائی

رہے گا غیر جانبدار دریا
کہ موجوں کی ہے ساحل سے لڑائی

کبھی ہے جنگ غیروں سے ہماری
کبھی باغی قبائل سے لڑائی

یہ سب ہی جانتے ہیں شیطنت سے
بشر کی ہے اوائل سے لڑائی

کسی دن ہو بھی سکتی ہے یقیناً
کسی قاتل کی قاتل سے لڑائی

ہوئی کل رات اِک محفل میں شاہدؔ
دلائل کی دلائل سے لڑائی

☆

غزل

کیا دیا جائے ہمیں انعام زیرِ غور ہے
سُن رہے ہیں ہم، ہمارا نام زیرِ غور ہے

ریت کے ٹیلے اُڑا کر لے گیا طوفان باد
ساکنانِ دشت کا انجام زیرِ غور ہے

دیکھیے کیا رنگ لائے منصفوں کا فیصلہ؟
میرے بارے میں ترا الزام زیرِ غور ہے

موسمِ نا مہرباں کو اس زمیں پر بھیج کر
وقت نے بھیجا ہے جو پیغام زیرِ غور ہے؟

جو نگاہِ غیر میں بھی قابلِ تحسین ہو
کیا کریں دنیا میں ایسا کام زیرِ غور ہے؟

ایک دوراہے پہ آ کر رُک گیا ہے کارواں
کون سی ہے شاہراہِ عام ، زیرِ غور ہے؟

پوچھتے ہیں مجھ سے شاہدؔ میرے سارے ہمنشیں
ان دنوں کیوں تلخیِ ایام زیرِ غور ہے؟

☆

غزل

منافقت کے پرستار کب بدلتے ہیں؟
مزاج اپنا خطار کار کب بدلتے ہیں؟

گھمنڈ جن کو ہو اپنی زباں درازی پر
وہ اپنا لہجۂ گفتار کب بدلتے ہیں؟

تجھے ہے میری رفاقت پہ کس لیے تشکیک
زبان دے کے وفادار کب بدلتے ہیں؟

بدل گئے ہیں مرے اقربا، روش اپنی
یہ دیکھنا ہے مرے یار کب بدلتے ہیں؟

ہزار اُن کو قناعت کا درس دے کوئی
حریصِ درہم و دینار کب بدلتے ہیں؟

بدل رہا ہے یہ موسم، ہے انتظار ہمیں
لباس اپنا یہ اشجار کب بدلتے ہیں؟

ہزار اُن کو سجا لو برنگِ نو شاہدؔ
پُرانے شہر کے آثار کب بدلتے ہیں؟

☆

غزل

حالات و واقعات سے واقف نہیں ہیں ہم
تیرے مُعاملات سے واقف نہیں ہم

ہم مان تو گئے ہیں ترے کچھ مُطالبات
باقی مُطالبات سے واقف نہیں ہیں ہم

کر تو لیا ہے شہر سے ہجرت کا فیصلہ
ہجرت کی مشکلات سے واقف نہیں ہیں ہم

رکھتے ہیں بے رُخی کے بہت تلخ تجربات
لوگوں کے التفات سے واقف نہیں ہیں ہم

اُس کی ضروریات کا ہر وقت ہے خیال
اپنی ضروریات سے واقف نہیں ہیں ہم

خورشید و ماہتاب کے بارے میں کیا کہیں؟
اسرارِ کائنات سے واقف نہیں ہیں ہم

دن رات پڑھ رہے ہیں صحیفہ حیات کا
شاہدؔ، ابھی حیات سے واقف نہیں ہیں ہم

☆

غزل

سخن کے شہر میں توقیر دے دے
مرے الفاظ کو تاثیر دے دے

جواہر کا خزینہ کیا کروں گا؟
مجھے اک درد کی جاگیر دے دے

میں اب تیرا نیا انداز دیکھوں
مجھے اپنی نئی تصویر دے دے

بصارت میں اندھیرا آ گیا ہے
مری آنکھوں کو پھر تنویر دے دے

کروں تسخیر میں سیارگاں کو
مجھے اِک قوتِ تسخیر دے دے

مری آنکھیں جو ہر شب دیکھتی ہیں
مجھے اُس خواب کی تعبیر دے دے

وہ مالک ہے اگر چاہے تو شاہدؔ
سزائیں مجھ کو بے تقصیر دے دے

☆

غزل

جب خوشی بھی خوشی نہیں لگتی
زندگی، زندگی نہیں لگتی

روشنی جب نہ ہو بصارت میں
روشنی، روشنی نہیں لگتی

دل نہ جب تک لگے عبادت میں
بندگی، بندگی نہیں لگتی

جس میں شرم و حیا کا رنگ نہ ہو
سادگی، سادگی نہیں لگتی

جان جانے کا ڈر نہ ہو جس میں
دشمنی، دشمنی نہیں لگتی

رنگِ فکر و شعور سے عاری
شاعری، شاعری نہیں لگتی

خوں چکاں دل نہ ہو اگر شاہدؔ
بے کلی، بے کلی نہیں لگتی

☆

غزل

زندگی کو نہ طرب زار میں رہ کر دیکھو
غم کے طوفان کو منجدھار میں رہ کر دیکھو
جاگتی آنکھ میں نیندوں کی سلگتی خواہش
تم کسی دیدۂ بیدار میں رہ کر دیکھو
کون بکتا ہے یہاں، کون لگاتا ہے رقم؟
رنگ بازار کا، بازار میں رہ کر دیکھو
جبر کہتے ہیں کسے، کربِ سکونت کیا ہے
تم بھی اس شہرِ ستم گار میں رہ کر دیکھو
اپنی آرام گہِ شب کی شکستہ حالت
اپنے گھر کے در و دیوار میں رہ کر دیکھو
کاش کوئی تو فرشتوں سے یہ جا کر کہہ دے
تم بھی اس عرصۂ پیکار میں رہ کر دیکھو
یہ رقابت ہے تعلق کی نشانی شاؔہد
دو گھڑی محفلِ اغیار میں رہ کر دیکھو

☆

غزل

گھر ہی میں تُو نہ اپنے شبستاں کا رنگ دیکھ
باہر نکل کے موسمِ دوراں کا رنگ دیکھ
شاخوں پہ برگ و بار، نہ پھُولوں میں تازگی
بگڑا ہوا ہے تیرے گلستاں کا رنگ دیکھ
تیرے لیے ہے موسمِ دُنیا کا ہر مزہ
گرمی کا زور دیکھ، زمستاں کا رنگ دیکھ
تجھ کو دکھائی دیں گے مناظر جُدا جُدا
صحرا کا رنگ دیکھ، خیاباں کا رنگ دیکھ
تو ناخدا ہے، ساحلِ دریا پہ بیٹھ کر
لہروں کا جوش دیکھ، نہ طوفاں کا رنگ دیکھ
اے میرے گلستانِ محبت کے باغباں!
پھیکا پڑا ہے فصلِ بہاراں کا رنگ دیکھ
ہر اک شجر ہے اپنی جگہ پیکرِ جمال
جامن کا پیڑ دیکھ، مغیلاں کا رنگ دیکھ
یہ اختلافِ رنگ ہی دُنیا کا حسن ہے
شاؔہد بہ غور شہر و بیاباں کا رنگ دیکھ

☆

غزل

اگر ہم سے کبھی تم پُرسشِ حالات کر لیتے
یہاں ہم بھی سہولت سے بسر اوقات کر لیتے

ہماری ذات سے گر تم کو تھا نقصان کا خدشہ
تم اپنی ذات سے منہا ہماری ذات کر لیتے

تمہارا کیا بگڑ جاتا ہمیں ملنے ملانے سے
اگر موقع ہمیں دیتے ضروری بات کر لیتے

اگر یہ جان لیتے تم سے مِلنا رات کو ہو گا
تمہارے شہر کی گلیوں میں دن سے رات کر لیتے

نہ جانے پھر ہماری زندگی کا رنگ کیا ہوتا
اگر خود کو سپُردِ تلخیِ حالات کر لیتے

اُسے کب یاد کرنا ہے، اُسے کب بھول جانا ہے
منظم اس طرح جینے کے ہم اوقات کر لیتے

اگر شاہدؔ سفر میں اور اپنے ہم سفر ہوتے
کسی کی بات سُن لیتے، کسی سے بات کر لیتے

☆

غزل

ہم ہیں احساس کی دنیا کو سجانے والے
محفلِ فکر میں اک رنگ جمانے والے

اپنے سینے سے لگالیں گے وہ آئیں تو سہی
ہم تو ہیں رُوٹھے ہوئے یار منانے والے

جان دینے پہ کوئی شور مچاتے ہی نہیں
کتنے چُپ چاپ چلے جاتے ہیں جانیوالے

ہم نے ہنس ہنس کے اُٹھائے ہیں زمانے کے ستم
پھر بھی ناراض ہیں کیوں ہم سے زمانے والے

مُنقطع کرتے ہو کیوں ربط ہمارا گُل سے
ہم ہیں گلزار کو گلزار بنانے والے

دربدر خاک بسر، موج ہوا کی صورت
ہم نے دیکھے ہیں بہت مَوج اُڑانے والے

سنگ ریزوں پہ سفر کیسے کریں گے شاہدؔ
وہ تو لگتے ہی نہیں زخم اُٹھانے والے

☆

حفیظ شاہد کی آخری غزل

اے مری زندگی، خدا حافظ
پھر ملیں گے کبھی، خدا حافظ

اِک نیا گھر بسا رہا ہوں میں
اے مری بے گھری، خدا حافظ

پھر نہ تجھ کو گلے لگاؤں گا
اے غمِ عاشقی، خدا حافظ

جانے والے تجھے مبارک ہو
اک نئی زندگی، خدا حافظ

چُھپ گیا چاند، بُجھ گئے تارے
اے مری چاندنی، خدا حافظ

وقتِ رُخصت کسی کے ہونٹوں پر
بس دُعا تھی یہی، خدا حافظ

جس پہ تم ہوگئے خفا اتنا
بات کچھ بھی نہ تھی، خدا حافظ

آگئی تیرے سامنے شاہد
پھر سفر کی گھڑی، خدا حافظ

☆

اُردو گیت

چاہت کے پھول کھلائے رکھنا!
گوری ان گوری گوری بانہوں میں
کلیوں کے گجرے سجائے رکھنا
چاہت کے پُھول کِھلائے رکھنا

من میں بہاروں کی خوشبو بسا کے
نینوں میں ساجن کے سپنے سجا کے
ہاتھوں میں مہندی رچائے رکھنا
چاہت کے پُھول کِھلائے رکھنا

ساون کی رُت ہو ، کالی گھٹا ہو
امبیوں کے پیڑوں پہ جُھولا پڑا ہو
سکھیوں کو جُھولا جُھلائے رکھنا
چاہت کے پُھول کِھلائے رکھنا

چنچل ہوائیں ، زُلفیں اُڑائیں
لیتا ہے موسم تیری بَلائیں
جوبن کا جادُو جگائے رکھنا
چاہت کے پُھول کِھلائے رکھنا

اُردو گیت

دِل ترسے ہے ساون میں
رِکن مِن ، رِکن مِن بُوندیں ہیں

سُونے سُونے آنگن میں
دِل ترسے ہے ساون میں

حال سُناؤں کس کو مَیں
چال دِکھاؤں کس کو مَیں

گیت بھرے ہیں جھانجن میں
دل ترسے ہے ساون میں

ایسے میں کیوں دُور ہو تم
ملنے سے مجبور ہو تم

آگ لگی ہے جیون میں
دل ترسے ہے ساون میں

☆

ملّی نغمہ

اے صبحِ وطن ، اے شامِ وطن
پھیلی ہی رہے آنگن آنگن!
تاروں کی ضیاء ، سُورج کی کِرن
اے صبحِ وطن ، اے شامِ وطن

باغوں میں ترے کلیاں مہکیں!
خوشبُو سے ، تری گلیاں مہکیں!
شاداب رہے گلشن گلشن!
اے صبحِ وطن ، اے شامِ وطن

سب شہر ترے آباد رہیں
سب لوگ ترے دلشاد رہیں
سر سبز رہیں سب کوہ و دَمن
اے صبحِ وطن ، اے شامِ وطن

سب کچھ ہے مرا تیرے ہی لیے
یہ دل ، یہ وَفا تیرے ہی لیے
قُربان ترے یہ جان یہ تَن
اے صبحِ وطن ، اے شامِ وطن

☆

ملّی نغمہ

شگفتہ پھُول کی صُورت زمیں میرے وطن کی ہے
مثالِ کہکشاں روشن جبیں میرے وطن کی ہے
انھی کے دم سے یہ دھرتی حسیں میرے وطن کی ہے
شگفتہ پھُول کی صُورت زمیں میرے وطن کی ہے

یہاں کا ذرّہ چودھویں کا چاند لگتا ہے
چمکتا ہر ستارہ ان کے آگے ماند لگتا ہے
ہر اک وادی بہاروں کی امیں میرے وطن کی ہے
شگفتہ پھُول کی صُورت زمیں میرے وطن کی ہے

فضا میں اِس کی پاکیزہ، نظارے دلرُبا اِس کے
سُہانے اِس کے موسم ہیں، چمن راحت فزا اِس کے
یہ مٹی ہمسرِ خُلدِ بریں میرے وطن کی ہے
شگفتہ پھُول کی صُورت زمیں میرے وطن کی ہے

یہاں کے رہنے والے ہر کسی سے پیار کرتے ہیں
اُجالے بانٹتے ہیں، روشنی سے پیار کرتے ہیں
انھی کے دم سے یہ دھرتی حسیں میرے وطن کی ہے
شگفتہ پھُول کی صُورت زمیں میرے وطن کی ہے

☆

مرتب: محمد یوسف وحید — پنجابی غزلیات

حاصلِ غزل

حفیظ شاہد مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام

۱۹۸۳ء تا ۲۰۱۳ء

غزل

تیرے پیار تے دل قُربان کراں
ترے صدقے اِہ جند جان کراں

میں اپنے پیریں زُلفاں دی
زنجیر سجائی ہوئی اے

تُوں چانن میریاں سوچاں دا
تُوں مُورت میریاں خواباں دی

ہر آن تیرا ارمان کراں
ترے پیار تے دل قُربان کراں

تُوں جوبن مست مہاراں دا
تُوں خشبو سُرخ گلاباں دی

مرے عشق دے خالی دامن وچ
ترا پیار بڑا سرمایہ اے

کیہ رُوپ تے رنگ بیان کراں
ترے پیار تے دل قُربان کراں

تینوں ساری دُنیا توں سوہنا
مرے ربّ نے آپ بنایا اے

میں دل دے شیشے وچ تری
تصویر سجائی ہوئی اے

کیہ عرض میں تیری شان کراں
ترے پیار تے دل قربان کراں

غزل

دلاں دے روگ ڈاہڈے جاپدے نیں
بڑے اوکھے ایہہ رستے جاپدے نیں

کدی لگدے نیں مینوں غیراں وانگوں
کدی اوہ اپنے اپنے جاپدے نیں

چمن اندر نظر جے اوہ تھیں اوندے
اُسانوں گُل وی کنڈے جاپدے نیں

مرے شیشے نظر اوندے نیں پتھر
ترے پتھر وی شیشے جاپدے نیں

اوہ ہر ویلے نیں میرے کول رہندے
جو ویکھن نوں ڈُراڈے جاپدے نیں

کنارے تے نچھاور ہون چھلاں
بڑے گوڑھے ایہہ رشتے جاپدے نیں

ملے تعبیر کی شاہدؔ انہاں دی
اجے سُفنے اُدھورے جاپدے نیں

☆

غزل

رات ہنیرے کون آیا اے؟
دل دے ڈیرے کون آیا اے؟

اپنے سوہنے مکھڑے اُتے
وال وکھیرے کون آیا اے؟

اپنے پیار دا چانن لے کے
ویہڑے میرے کون آیا اے؟

ایس دُنیاں دی محفل اندر
دُوجے پھیرے کون آیا اے؟

ویکھو! اڈھی راتیں ساڈے
رین بسیرے کون آیا اے؟

سُورج وانگوں چانن ونڈدا
سانجھ سویرے کون آیا اے؟

شاہدؔ ڈُبدے سُورج کولوں
لھن سویرے کون آیا اے؟

☆

غزل

ساڈے دل تے تیر چلا کے
کیوں بیٹھے او نیویاں پا کے
اوہدیاں یاداں پلاں پاون
دل دے سُنجے وہڑے آ کے
دیکھ کے اوہدے مُکھ دی لالی
پھل رہ جاندے نیں کُملا کے
کدی تے ساڈا حال وی پُچھو
سانوں اپنے کول بُلا کے
پیار دے رستے کُردے کُردے
لَھ جاون گے تیرے چھاکے
آپے لوک سنبھل جاندے نیں
قدم قدم تے ٹھیڈے کھا کے
ٹُر گئیاں نیں سبز رُتاں وی
ساڈی جھولی کنڈے پا کے
اوہنے میری اک نہ منّی
رہ گیا میں سمجھا سمجھا کے
شاہد کدھر ٹُر چلیا ایں
ویلے دے ہتھ واگ پھڑا کے

غزل

جندڑی ٹھیڈے کھاندی رہ گئی
منزل کول بُلاندی رہ گئی
وگ دا رہیا چناں دا پانی
سوہنی غوطے کھاندی رہ گئی
سونا لے گئی نال جوانی!
والاں دے وچ چاندی رہ گئی
قسمت ، پلّے کَکھ نئیں چھڈیا
اوہدی آس دی جاندی رہ گئی
دیمک موت دی ہولے ہولے
جسم دا بوٹا کھاندی رہ گئی
روڑھ کے لے گیا ہڑ دا پانی
خلقت رَولا پاندی رہ گئی
روندے رہ گئے بُکھاں مارے
دُنیا جشن مناندی رہ گئی
یاد کسے دی دل دے ویہڑے
شاہد پیلاں پاندی رہ گئی

غزل

لوکی تیرا کی لیندے نیں
اوکھے سوکھے جی لیندے نیں

اپنا زخمی زخمی پنڈا
آپے لوکی سی لیندے نیں

زاہد ایتھے گھٹ نیں کردے
دا لگے تے پی لیندے نیں

ہوون عالی ظرف جہناں دے
دل دا غصہ پی لیندے نیں

خورے کیوں شاخاں تے کھڑدی
مالی، توڑ کلی لیندے نیں

ظالم لوک وفا دے بدلے
ہاسے رکھ رگڑدی لیندے نیں

شاہد، جہڑے پی نئیں سکدے
مے خانے وچ کی لیندے نیں

☆

غزل

زنجیراں نوں کھولن والے
کدھر نیں ہُن بولن والے

سو واری اَزما لے بلیا!
اسی نئیں اینویں ڈولن والے

ایتھے بُہتے یار مِلن گے
وچ تھلاں دے رولن والے

خورے ایتھوں کی لبھدے نیں
تھاں تھاں خاک پھرولن والے

ٹُر جاون گے خالی ہتھیں
ساڈی جُھگی پھولن والے

ایہہ ہنجوآں دے موتی تے نئیں
مٹی دے وچ رولن والے

پہلاں اپنے آپ نوں ویکھن
شاہد سانوں تولن والے

☆

غزل

دل دا راز نہ کھولاں گے
کلیاں بہہ کے رو، لاں گے

بگل مار کے یاداں دی
اپنا آپ لکو لاں گے

عشق دے سُچے سودے توں
سونے نال نہ تولاں گے

کد تک موتی ہنجوآں دے
مٹی دے وچ رولاں گے

اپنے دل دی ڈوری وچ
پیار دے پھُل پرولاں گے

کدی تے جیون پوتھی دا
اگلا ورقہ پھولوں گے

چڑھ جاواں گے سُولی تے
شاہدؔ چُوں نہ بولاں گے

☆

غزل

جو کُجھ بیتے جَردے رہنا
پیار دا پینڈا کردے رہنا

امیداں دے خاکے اندر
رنگ لہو دا بھردے رہنا

بندہ اپنے آپ دا وَیری
اپنے آپ توں ڈردے رہنا

ازلاں توں اِہ قسمت ساڈی
جیوندے رہنا، مردے رہنا

ڈُبدے ڈُبدے، غوطے کھاندے
جیون دریا تَردے رہنا

ایہو ساڈی چت اے بیبا
عشق دی بازی ہَردے رہنا

لِکھ لِکھ حرف وفا دے شاہدؔ
اوہدے ناویں کردے رہنا

☆

غزل

کد سوندے نیں ہجر دے مارے راتاں نُوں
ہاواں بھر دے رہن وچارے راتاں نوں

دل وچ دِسن گھور ہنیرے دُکھاں دے
پلکاں اُتّے چمکن تارے راتاں نُوں

خورے کیہڑا اکھیاں نوں دے جاندا اے
خواباں دے گجھ محل منارے راتاں نوں

کیہ کیہ ساتوں رنگ وکھاندے رہندے نیں
سوہنی دھرتی دے لشکارے راتاں نوں

خورے کیہدی خاطر لوکی شہراں دے
بہ رہندے نیں نہر کنارے راتاں نُوں

کر دیندے نیں دُور ہنیرے سوچاں دے
اوہدیاں یاداں دے اُجیارے راتاں نُوں

ساڈے ورگے بے عملاں نوں عرشاں توں
اوہدی رحمت واجاں مارے راتاں نُوں

ساڈے دل وچ پنچھی اوہدیاں یاداں دے
اُتر دے نیں کھنب کھلارے راتاں نُوں

دل دے چلہے اندر ٹھنڈے رہندے نیں
شاہد یاداں دے انگیارے راتاں نُوں

گیت

تیری کالی کالی آکھ
ساڈا چھیا نہیں لکھ

ہن سجناں دے کولوں
لکھ کج کے نہ رکھ

سانوں کلیاں نہ کنڈیاں اچ رول نی
دل کردا اے رہیے تیرے کول نی

نہیوں رہنا ہن دُکھ
تیری کالی اکھ

ساڈا چھڈیا نہیں لکھ
لکھ کج کے نہ رکھ

☆

غزل

جدوں چیتے آوے میتوں اوہدا رُوپ تے رنگ!
سپاں وانگوں اوہدیاں یاداں دل تے مارن ڈنگ

چانن میریاں اکھاں دا اے، خواباں دی تعبیر
سورج ورگا اوہدا مکھڑا، پھُلاں ورگا انگ

اسی آں دونویں پریم دے پنچھی اُڈ نئیں سکدے وکھ
اج اے تیری میری سنگت جیویں ڈور پتنگ

غم دیاں دُھپاں دے وچ جہدا جگ جگ دتا ساتھ
چار قدم ہُن ٹُر کے ویکھے اوہ وی ساڈے سنگ

نویں صدی نُوں کیہ دیون گے ساڈے ورگے لوک
نہ جیون دی جاچ اے سانوں نہ مرنے دا ڈھنگ

خورے کہنے جیون رستے دتے آن کھلار؟
قدم قدم تے غم دے کنڈے، قدم قدم تے سنگ

ایہہ دُنیا دی دولت تیرے کسے وی کم نئیں اونی
شاہد اوس سخی دے کولوں دل دی دولت منگ

☆☆☆

مرتب: محمد یوسف وحید

حفیظ شاہد مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام

فلمی گیت نگاری

ویکھ تیری سج دھج، اکھاں کہندیاں نیں اج
تینوں ویکھاں رج رج، تینوں ویکھاں رج رج

گت لمی تے نالے ڈِنگا چیرنی
میرے پیراں دی بنے نیں زنجیرنی
ہُن مکھڑا نہ کج، اکھا کہندیاں نہیں آج
تینوں ویکھاں رج رج، تینوں ویکھاں رج رج

چپ کر کے توں دل میرا کھوہ لیا
سچ آکھیا اے پُوٹھ نہیوں بولیا
چوری کر کے نہ بھج، اکھاں کہندیاں نیں اج
تینوں ویکھا رجک رج، تینوں ویکھا رج رج

دل لیا ای تے رکھیں ہن کول نی!
ویکھیں کنڈیاں چ دیویں نہ توں رول نی
رکھیں پیار دی توں لج، اکھاں کہندیاں نیں اج
تینوں ویکھاں رج رج، تینوں ویکھا رج رج

فلم ''بلبل پنجرے دی'' موسیقار: رحمان ورما
سنگر: مسعود رانا ریکارڈسٹ: حبیب احمد

☆☆☆

گیت

میں کلی بِکھر بِکھر ہَستاں
کی ہویا، کی مَیں دستاں

ماہی سینہ زوری کیتی
مرے دل دی چوری کیتی
اکھاں وچ پا کے اکھاں
کی ہویا، کی مَیں دستاں

گلیاں دا رنگ ہو یا گوڑا
چَھن چَھن، چَھن چَھن چھنکے چُوڑا
میں سَانبھ سانبھ کے رکھاں
کی ہویا، کی میں دستاں

پیار سَجن دا کَج لکاواں
راہ جاندی میں ٹھیڈے کھاواں
میں وانگ شو دائیاں نَستاں
کی ہویا، کی میں دستاں

فلم: ''بلبل پنجرے دی'' موسیقار: رحمان ورما آواز: مالا

☆☆☆

گیت

دولت منداں دی ایہہ دنیاں
کہنوں دل دا حال سناواں
روز نواں اک روپ وکھالے
نچ نچ پیریں پے گئے چھالے

اکھیاں دے وچ دولتاں پا کے
پل دو پل دا پیار جتا کے
چوٹھیاں عزتاں شاناں والے
ٹر جاندے نیں دل پرچا کے
ایس جگ دے دستور نرالے ...... نچ نچ پیریں پے گئے چھالے
دنیاں دے دکھ سہہ نہیں سکدی
ویر نوں ویر وی کہہ نہیں سکدی
میں کمزور تے دنیاں ڈاہڈی
عزت نال وی رہ نہیں سکدی
بجھ گئے دیوے آساں والے ...... نچ نچ پیریں پے گئے چھالے
چوٹھیاں کھیڈاں آپ کھڈوندے
پیراں دے وچ گھنگھرو پوندے
میرے جیہاں خور لے کنیاں
وچ ہزاریں آپ نچوندے
اچیاں اچیاں شملیاں والے ...... نچ نچ پیریں پے گئے چھالے

☆☆☆

موسیقار: رحمان ورما   سنگر: میڈم نور جہاں   ڈائریکٹر: صنوبر خان   ریکارڈسٹ: اے زید بیگ
گیت: حفیظ شاہد   ایورنیو سٹوڈیو لاہور   مورخہ: ۱۳ فروری ۱۹۷۱ء

گیت

تینوں ڈنگنا وی نئیں ، اساں چکّنا وی نئیں
لُٹ لے وے نظارے لُٹ لے وے
جدّوں مُکھڑے توں چُنّی میں سٹائی وے
دل والیاں وی ہوش بُھلائی وے
اولہا رکھنا وی نئیں ، تینوں ڈنگنا وی نئیں
لُٹ لے وے نظارے لُٹ لے وے

دل لُٹیا ای کر کے اشارہ وے
اج لگناں ایں سانوں بڑا پیارا وے
اساں تسنا وی نئیں ، تینوں ڈنگنا وی نئیں
لُٹ لے وے نظارے ، لُٹ لے وے

آپے بُجھ لے جو اکھاں تینوں کہندیاں
گلاں پیار دیاں گُجیاں نئیں رہندیاں
مُونہوں دسّنا وی نئیں ، تینوں ڈنگنا وی نئیں
لُٹ لے وے نظارے ، لُٹ لے وے

فلم: وِیکھیا پنجرے دی موسیقار: رحمان ورمؔا
آواز: نسیم بیگم، تصور خانم گیت: حفیظ شاہدؔ

☆☆☆

گیت

بے دردواں دی دنیاں دے وچ کون کرے غم خواری
اے دل میت ناں جان کسے نوں چھڈ بُرے دی یاری

اپنے ای پیاریاں دا پیار لُٹ لیندے نیں
کدی کدی یاراں نوں وی یار لُٹ لیندے نیں
ایتھے لوکی کسے دی خیر نہیوں منگ دے
اپنا بنا کر کے وَیری سپ وانگوں ڈنگ دے
خواباں تے خیالاں دی بہار لُٹ لیندے نیں
اپنے ای پیاریاں دا پیار لُٹ لیندے نیں

پیار نوں ایہہ دولتاں دی تکڑی چہ تول دے
ہیریاں تے موتیاں نوں مٹی وچ رول دے
دلاں دا ایہہ چین تے قرار لُٹ لیندے نیں
اپنے ای پیاریاں دا پیار لُٹ لیندے نیں

کوئی ایتھے کسے دیاں لکیاں نمیں جان دا
کسے نوں خیال نہیوں اگلے جہان دا
رکھو دیاں پھُلاں دا نکھار لُٹ لیندے نیں
اپنے ای پیاریاں دا پیار لُٹ لیندے نیں

فلم: چھڈ بُرے دی یاری   موسیقار: گلزار مشتاق   آواز: رجب علی
گیت: حفیظ شاہد   ریکارڈسٹ: حامد حسن میر   سینٹرل سٹوڈیوز لاہور

☆☆☆

گیت

لڑکی: تقدیر نکھٹ گئی اے
پینگ ہُلارے چڑھ کے
ھائے ادھ وچ ٹُٹ گئی اے

لڑکا: ہووے لکھ مجبوری نی
دل ناں توں چھڈ سوہنیے
دو دن دی اے دُوری نی

لڑکی: اسی ہوش گوا بیٹھے
تیرے نال دل لا کے
اسی راہواں وچ آ بیٹھے

لڑکا: تقدیر دا رونا ایں
رب دیاں رب جانے
ھورے کیہ ہونا ایں

لڑکی: ہُن موڑ مہاراں وے
تیرے بناں ھائے چن وے
کیویں عُمر گذاراں وے

لڑکا: اک روز میں آواں گا
سَوں تیرے ہنجوآں دی
تینوں سینے نال لاواں گا

فلم: چھڈ بُرے دی یاری موسیقار: گلزار مشتاق آواز: رجب علی، ساجدہ فیروز
گیت: حفیظ شاہد ریکارڈسٹ: حامد حسن میر

☆☆☆

گیت

سجناں دے نال ملاقات ہوئی اے
دیر نہیوں ہوئی کل رات ہوئی اے

میریاں اداواں اُتّے جاندا سی اوہ مُردا
کنا پتنگا لگ دا سی ماہی گلّاں کردا
اکھاں اکھاں وچ گل بات ہوئی اے
سجناں دے نال ملاقات ہوئی اے

ٹُٹ گیا میرا سارا مان تے غرور نی
رَج کے میں فیر اوہنوں ملّاں گی ضرور نی
جت گیا ماہی میری مات ہوئی اے
سجناں دے نال ملاقات ہوئی اے

ریس نہیوں کوئی میرے سوہنے دلدار دی
ایویں تے نہیں اوہدے اُتوں تن من وار دی
اِک مک دوواں دی ذات ہوئی اے
سجناں دے نال ملاقات ہوئی اے

فلم: پانی موسیقار: گلزار مشتاق آواز: ساجدہ فیروز

گیت

نیویاں پاکے ، چُپ چپیتے کولوں دی لنگھ جاندے او
اہ تے دسّو ، ساڈے کولوں کیوں ایناں شرماندے او

پیار کسے دے نال جے ہووے پیار تے پردا پا نا کی
اپنے دل دے جانی کولوں اپنا آپ لکانا کی
تُسی تے اینویں ساڈے کولوں اپنا آپ لکاندے او
نیویاں پاکے ، چُپ چپیتے کولوں دی لنگھ جاندے او

غیراں وانگوں چُپ چُپ رہناں پیار دا اِہ دستوہ نہیں!
سجناں نال دی گل نہیں کرنی ، اِہ سانوں منظور نہیں
نویں نویں اُلجھاویں دے وچ کیوں سانوں اُلجھاندے او
نیویاں پاکے ، چُپ چپیتے کولوں دی لنگھ جاندے او

مکھڑا چڑھدے سورج ورگا ، چال بڑی متوالی اے
اکھیاں شرم حیا دے ساغر ، گلہاں اُتے لالی اے
ساڈے دل دی چوری کر کے ہُن کیوں نین چُراندے او
نیویاں پا کے، چُپ چپیتے ،کولوں دی لنگھ جاندے او

ساڈے دل وچ پیار جگا کے ، پیار دی لج نبھانا جی!
غم دیاں اوکھیاں راہواں دے وچ کلیاں چھڈ نہ جانا جی
تُسی تے سانوں دیکھ کے اینویں متھے تیوری پاندے او
نیویاں پا کے، چُپ چپیتے ،کولوں دی لنگھ جاندے او

اپنے دل وچ میں تیری تصویر لکائی ہوئی اے
اپنیاں آساں امیداں دی بزم سجائی ہوئی اے

☆☆☆

انتخاب: سعدیہ وحید

حفیظ شاہد کے چھ شعری مجموعوں سے

منتخب اُردو غزلیات

غزل

کیا کتابِ منصفی میں ہے یہی مرقوم دیکھ
ایک ہی صف میں کھڑے ہیں ظالم و مظلوم دیکھ

لے گیا ہے کون اس گلزار کی رعنائیاں
کیوں ہیں یہ اشجار برگ و بار سے محروم دیکھ

وقت کے بھونچال نے اے قصرِ دولت کے مکیں
کیسی کیسی بستیوں کو کر دیا معدوم دیکھ

گر مری تقریر میں جدت نہیں تو کیا ہُوا
میرے لہجے پر نہ جا تُو معنی و مفہوم دیکھ

چھوڑ میرے زائچے کو اس کا میں قائل نہیں
میرے ہاتھوں کی لکیروں میں مرا مقسوم دیکھ

جو گھروندے ریگِ ساحل پر بنائے تھے کبھی
گر گئے ہیں منہدم کچھ لوگ نامعلوم دیکھ

اُس کا مِلنا ہے تری قسمت میں شاہد یا نہیں
اب کسی دن تُو بھی اپنا پرچۂ مقسوم دیکھ

(روشنی کا سفر)

☆

غزل

زندگی سے مطمئن تو کم ملیں گے شہر میں
لوگ اپنے آپ سے برہم ملیں گے شہر میں

ہر نئی منزل ملے گی دُھول میں لپٹی ہوئی
ہر نئے رستے میں پیچ و خم ملیں گے شہر میں

گاؤں سے آتے ہوئے اُس نے کہا تھا ایک دن
اب مقدر میں ہُوا تو ہم ملیں گے شہر میں

اِس قدر ہیں آپ ہم سے لاتعلق کس لئے
ہم سے مخلص آدمی تو کم ملیں گے شہر میں

تُم اجالوں کے تمنائی ہو اتنا سوچ لو
روشنی میں سائے بھی مدغم ملیں گے شہر میں

دیکھنا کچھ اور تازہ زخم لے کر آؤ گے
تُم سمجھتے ہو تمہیں مرہم ملیں گے شہر میں

شہر میں آنے سے پہلے یہ خبر شاہد نہ تھی
ہم کو اِتنے مختلف موسم ملیں گے شہر میں

(روشنی کا سفر)

☆

غزل

مُسکرا کر وہ گلے جب تیغِ قاتل سے مِلا
رہروِ راہِ محبت اپنی منزل سے مِلا

بعد مدت کے جو آیا لوٹ کر میں شہر میں
اپنے گھر کا راستہ بھی مجھ کو مشکل سے مِلا

ایک رنجِ کم نگاہی ، اِک شکستِ آرزو
اور کیا اِس کے علاوہ تیری محفل سے مِلا

لے گیا طوفان یوں اُن کو بہا کر اپنے ساتھ
ڈوبنے والوں کا ساماں بھی نہ ساحل سے مِلا

پھر سرِ شاخِ تمنا مُسکرائے ہیں گلاب
اک پیامِ زندگی پھر گلشنِ دل سے مِلا

جھوٹ سے نفرت ہے مجھ کو اور سچائی سے پیار
تُو مرے حرفِ صداقت کو نہ باطل سے مِلا

میں نے شاہدؔ اُس کو ڈھالا ہے غزل کے رُوپ میں
مجھ کو جو کچھ عصرِ حاضر کے مسائل سے مِلا

(چراغِ حرف)

☆

غزل

اِس قوم پر زوال کے آثار دیکھ کر
دل رو دیا نوشتۂ دیوار دیکھ کر

اپنی بھی یاد آ گئیں محرومیاں تمام
دورِ خزاں میں صُورتِ اشجار دیکھ کر

دُنیا کے غم قریب نہ آئے مرے کبھی
تیرے غموں سے برسرِ پیکار دیکھ کر

کتنی اُداس پھول پہ بیٹھی ہیں تتلیاں
دامِ خزاں میں گُل کو گرفتار دیکھ کر

خالی تھی میری جیب بھلا کیا خریدتا
بھر آئی آنکھ رونقِ بازار دیکھ کر

دشمن تو گھر میں آیا تھا شب خون مارنے
لیکن پلٹ گیا مجھے بیدار دیکھ کر

ویرانیوں میں حُسن ہے شاہدؔ کمال کا
صحرا بھی دیکھنا کبھی گلزار دیکھ کر

(چراغِ حرف)

☆

غزل

یہ میں نے کب کہا ہے اپنے قصرِ زر میں رہنے دو
مجھے شہرِ قناعت کے شکستہ گھر میں رہنے دو

شکستِ عارضی کے ذکر سے اب فائدہ کیا ہے
ذرا سا حوصلہ باقی مرے لشکر میں رہنے دو

ابھی کچھ دیر ہے یہ ہجر کا موسم گزرنے میں
ابھی ساون کا منظر اپنی چشمِ تر میں رہنے دو

ابھی بھٹکے ہوئے کچھ لوگ اپنے گھر نہیں پہنچے
دِیا جلتا ہُوا کوئی دیار و در میں رہنے دو

نہ مجھ سے یوں کرو ترکِ تعلق اجنبی بن کر
کوئی امّید جینے کی دلِ مضطر میں رہنے دو

ابھی پیکر تراشی کے ہُنر سے تُم نہیں واقف
ابھی سویا ہُوا تصویر کو پتھر میں رہنے دو

ابھی تو ہے بلندی اور کچھ پیشِ نظر شاہدؔ
ابھی کچھ طاقتِ پرواز بال و پر میں رہنے دو

(مہتابِ غزل)

☆

غزل

سوچتے رہتے ہیں اکثر کُنجِ تنہائی میں ہم
ہر کسی سے کٹ گئے تیری شناسائی میں ہم

ہم سے ہیں ناراض اب تک تیرے کوچے کے مکیں
تھے کبھی شامل تری ہنگامہ آرائی میں ہم

اب ہے اپنے گھر کا نقشہ بھی ہمیں بھُولا ہُوا
ایک مدت سے لگے ہیں دشت پیمائی میں ہم

کچھ نہیں رکھتے ہیں اپنے آپ کی پہچان بھی
ہیں ابھی تک مُبتلا اک فخرِ آبائی میں ہم

ہار پھولوں کے لئے بیٹھے ہیں اُس کی راہ میں
اور کر سکتے ہیں کیا اُس کی پذیرائی میں ہم

ڈُوب کر آنکھوں میں اُس کی دل کو اندازہ ہُوا
جیسے ڈوبے ہوں کسی دریا کی گہرائی میں ہم

جو بھی ہو گا پیار میں شاہدؔ وہ دیکھا جائے گا
مُبتلا کب تک رہیں گے فکرِ رسوائی میں ہم

(مہتابِ غزل)

☆

غزل

کٹھن حالات میں اپنے ارادوں کو جواں رکھنا
ہمیں آتا ہے دل میں شعلۂ غم کو نہاں رکھنا

اکیلے گھر میں کیسے وقت کاٹو گے تنِ تنہا
کوئی تصویر لٹکا کر سرِ دیوارِ جاں رکھنا

ہماری فکر تم چھوڑو، ہمیں یہ کام آتا ہے
اندھیروں میں بسر کرنا، نظر میں کہکشاں رکھنا

اجل اور زندگی کی دوستی اک حرفِ باطل ہے
بہت دشوار ہے پانی پہ بنیادِ مکاں رکھنا

چمن پر ایک دن فصلِ خزاں کا راج بھی ہوگا
عبث ہے دل میں ارمانِ بہارِ جاوداں رکھنا

نہ جانے اِس میں پوشیدہ ہیں اُس کی حکمتیں کیا کیا
ہمیشہ گردشوں میں یہ زمین و آسماں رکھنا

کہاں آسان ہے اہلِ سخن کی بھیڑ میں شاؔہد
جُدا اوروں سے اپنا طرزِ گفتار و بیاں رکھنا

(یہ دریا پار کرنا ہے)

☆

غزل

فکرِ سُود وزیاں میں رہتا ہوں
میں بھی اِس خاکداں میں رہتا ہوں

نیلگوں آسمان کے نیچے
خیمۂ جسم و جاں میں رہتا ہوں

میں ہوں آزاد کب زمانے سے
قیدِ وہم و گماں میں رہتا ہوں

میں محبت کی روشنی بن کر
وقت کی کہکشاں میں رہتا ہوں

جانے کیا بات ہے کہ میں تنہا
محفلِ دوستاں میں رہتا ہوں

فکرِ اِتلافِ زندگی کیسا
میں اجَل کی اماں میں رہتا ہوں

میں بگولوں کے درمیاں شاؔہد
دشتِ عصرِ رواں میں رہتا ہوں

(یہ دریا پار کرنا ہے)

☆

غزل

بارِ غم و الم سے کہیں چھت نہ گر پڑے
ڈرتا ہوں یہ بدن کی عمارت نہ گر پڑے

محفوظ ہی رہے یہ محبت کا آشیاں
اس پر کسی کی برقِ عداوت نہ گر پڑے

آیا ہُوا ہے ذہن میں سیلاب تُند و تیز
یادوں کی یہ قدیم عمارت نہ گر پڑے

تعمیر جو کیا تھا کبھی میرے واسطے
سر پر ترے وہ کاخِ ملامت نہ گر پڑے

ہر آن ہے یہ خوف کہ دل کی زمین پر
اُڑتا ہُوا یہ طائرِ حسرت نہ گر پڑے

اِس میں چُھپی ہوئی ہیں ہزاروں ہی صُورتیں
شیشے سے دیکھنا کوئی صُورت نہ گر پڑے

آتا ہے روز شہرِ تمنا میں زلزلہ
شاہدؔ کہیں یہ قصرِ محبت نہ گر پڑے

(فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی)

☆

غزل

دل دے کے اُسے دل کا پتا پُوچھ رہا ہوں
اُجڑی ہوئی محفل کا پتا پُوچھ رہا ہوں

پاگل مجھے پھر کیوں نہ کہیں اہلِ سفینہ
طوفان سے ساحل کا پتا پُوچھ رہا ہوں

شاید مجھ مِل جائے کوئی واقفِ منزل
ہر ایک سے منزل کا پتا پُوچھ رہا ہوں

وہ برسرِ پیکار ہے کب سے مرے اندر
میں اپنے مقابل کا پتا پُوچھ رہا ہوں

میں بھی ہوں عجب شخص کہ اب راہزنوں سے
اک رہبرِ کامل کا پتا پُوچھ رہا ہوں

کیوں مُہر بہ لب ہو مرے تاریخ نویسو!
گم گشتہ قبائل کا پتا پُوچھ رہا ہوں

خاموش ہیں سب لوگ مرے شہر کے شاہدؔ
مقتول سے قاتل کا پتا پُوچھ رہا ہوں

(فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی)

☆

غزل

محبت میں کبھی تم اسقدر بے باک بن جاؤ
مرا چہرہ، مری آنکھیں، مری پوشاک بن جاؤ

محبت برملا کہتی ہے طوفانوں سے تم کھیلو
زمانے کا تقاضا ہے خس و خاشاک بن جاؤ

نہ جانے کیوں ہمیں اہلِ وفا یہ درس دیتے ہیں
خرد سے ہو کے بیگانہ، گریباں چاک بن جاؤ

اگر تم چاہتے ہو سر اُٹھا کر دہر میں جینا
چبھن کانٹوں کی، گُل کا خندۂ بے باک بن جاؤ

یہی اِس دور میں اب کامیابی کی نشانی ہے
نکل کر میکدے سے ایک رندِ پاک بن جاؤ

گزرتے ہوں جہاں سے قافلے اہلِ محبت کے
جو ممکن ہو تو ایسے راستوں کی خاک بن جاؤ

زمانہ تم کو ورنہ پیچ کھائے گا کبھی شاہدؔ
ذرا ہشیار ہو جاؤ، ذرا چالاک بن جاؤ

(سورج بدل رہا ہے)

☆

غزل

مجھے پسپا کرے گا کیا ملالِ بیش و کم کوئی
نہیں مرقوم اس دل کے لغت میں لفظِ غم کوئی

نظر آتا نہیں بے عکس میں جب بھی اسے دیکھوں
مری آنکھوں کے شیشے میں ہے تصویرِ صنم کوئی

مری اوقات پر اِس سے بڑا احسان کیا ہوگا
کہ مجھ بے رنگ کو کر دے ترے رنگوں میں ضم کوئی

مجھے کرنیں جھلک اپنی دِکھا کر روک دیتی ہیں
میں جب مہتاب کی جانب اُٹھاتا ہوں قدم کوئی

کبھی اِن بستیوں میں خوبصورت لوگ بستے تھے
سُناتے ہیں کھنڈر اب داستانِ پُر الم کوئی

مجھے بخشا ہے اِتنا حوصلہ تیری محبت نے
مجھے مغلوب کر سکتا نہیں دُنیا کا غم کوئی

سرِ دشتِ تمنا اک یہی حسرت رہی شاہدؔ
مجھے بھی ڈھانپ لیتا سایۂ ابرِ کرم کوئی

(سورج بدل رہا ہے)

☆

غزل

سُورج سمجھ رہے تھے خود کو سحر سے پہلے
ہم بے ہُنر تھے کتنے، فیضِ ہنر سے پہلے

اب قصرِ مال و زَر سے رغبت نہیں ذرا بھی
کرتے تھے ہم محبت دیوار و دَر سے پہلے

اب سر جُھکا جُھکا کے مٹی کے چُھو رہی ہیں
شاخیں تھیں سر کشیدہ، بارِ ثمر سے پہلے

زندانِ شاعری مُں سب قید کر لیے ہیں
گزرے تھے جو مناظر اپنی نظر سے پہلے

تاریخ عیسوی کا بے ''عیب'' ہے یہ مصرع
ہے کلیاتِ عمدہ، ختمِ سفر سے پہلے

(ختمِ سفر سے پہلے)

☆

غزل

میں پڑھ رہا ہوں اپنے سفر کی کتاب میں
تحریر تھی جو تیری نظر کی کتاب میں

شب کے وَرق وَرق پہ اُجاگر ہوئے تمام
دیکھے تھے جتنے رنگ سحر کی کتاب میں

بکھری قدم قدم ہیں ہزاروں کہانیاں
کیا کیا پڑھوں مَیں راہگذر کی کتاب میں

شاید تری نگاہ سے گزرا نہیں ابھی
جو کچھ رقم ہے شام و سحر کی کتاب میں

گزری تھی جو خزاں میں شجر کے وجود پر
مرقوم ہے وہ برگ و ثمر کی کتاب میں

تو بھی تو غور کر کہ اُجالوں کی داستاں
لکھی ہے کس نے شمس و قمر کی کتاب میں

پہنے ہوئے ہیں حرف، لہو رنگ پیرہن
شاہد سراب دشتِ ہنر کی کتاب میں

(ختمِ سفر سے پہلے)

☆

حوالہ جات

کتابیات :

۱ آسی خانپوری مدیر: اَدوار، ادارہ مطبوعاتِ اَدوار خان پور، اشاعت: نا معلوم

۲ حفیظ شاہد، ''سفر روشنی کا'' ۔ خان پور: ادارہ مطبوعاتِ اَدوار، ۱۹۸۳ء

۳ حفیظ شاہد، ''سفر روشنی کا'' ۔ (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء

۴ حفیظ شاہد، ''چراغِ حرف'' ۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

۵ حفیظ شاہد، ''مہتابِ غزل'' ۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء

۶ حفیظ شاہد، ''یہ دریا پار کرنا ہے'' ۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء

۷ حفیظ شاہد، ''فاصلہ درمیاں وہی ہے ابھی'' ۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

۸ حفیظ شاہد، ''سورج بدل رہا ہے'' ۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

۹ حفیظ شاہد، ''ختم سفر سے پہلے (کلیات)'' لاہور: الحمد پبلی کیشنز، اگست ۲۰۱۰ء

۱۰ حیدر قریشی، مرتب: شفق رنگ، ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز خان پور، ۱۹۷۹ء

۱۱ حیدر قریشی، مدیر: ایک گوشہ حفیظ شاہد کیلئے (سات ادیب) مجلسِ مشاورت: فرحت نواز
مرتب: سعید شباب، جدید ادب پبلی کیشنز خان پور، اشاعت: ۱۹۸۶ء

۱۲ گوہر ملسیانی، کاروانِ خیال (انتخاب کلام)، ادارہ عکسِ صادق، صادق آباد، ۲۰۰۱ء

۱۳ ماجد قریشی، دبستانِ بہاول پور، ادارہ مطبوعاتِ مشرق، بہاول پور، ۱۹۳۶ء

۱۴ مجلّہ ''غواص'' ۔ شمارہ نمبر ا، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج گرلز خان پور۔ سال ۲۰۱۶ء

۱۵ محمد یوسف وحید، مدیر: سہ ماہی ''شعور و ادراک'' خان پور، شمارہ نمبر ا۔ جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء

۱۶ محمد یوسف وحید، مدیر: سہ ماہی ''بچے من کے سچے'' خان پور ''خان پور نمبر'' جنوری تا مارچ ۲۰۱۲ء

۱۷ محمد یوسف وحید، تحقیق و تدوین: گلدستہ ادب۔ الوحید ادبی اکیڈمی خان پور، ۲۰۱۵ء

۱۸ مجلّہ ''بانگِ سحر''، شمارہ خان پور کا ادبی نمبر، سال ۲۰۰۳۔۲۰۰۲ء، معاون مدیر: پروفیسر نذر خلیق
گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج بوائز خان پور

۱۹ مظہر عباس: مقالہ ایم فل اُردو ''حفیظ شاہد۔ فن و شخصیت'' اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور، ۲۰۰۵ء

ملاقات / گفت گو :

۱۔ سلمان شاہد، بیٹا: حفیظ شاہد، ملاقات و اجازت خصوصی گوشہ حفیظ شاہد، مورخہ ۱۸ اپریل ۲۰۲۱ء

۲۔ سلمان شاہد، بیٹا: حفیظ شاہد، ملاقات گوشہ حفیظ شاہد، مورخہ ۳۱ مئی ۲۰۲۱ء، ۱۴ ستمبر ۲۰۲۱ء

۳۔ یاور عظیم، شاگرد: حفیظ شاہد، ملاقات، مورخہ ۲۳ مئی، ۵ جون، ۱۱ جولائی، ۷ اگست اور ۵ ستمبر ۲۰۲۱ء

۴۔ اختر رسول چودھری، داماد: حفیظ شاہد، ٹیلی فونک رابطہ، تبادلہ معلومات و کلام ۲۷ ستمبر ۲۰۲۱ء

☆☆☆

"ہے کاوش تری صدآفریں"

تُو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہوا
اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اُٹھے

"شعور و ادراک" کا مذکورہ شمارہ پاک وطن کی تین اہم زبانوں کے سفر پر گامزن ہے۔ محترم محمد یوسف وحید نے ان تین زبانوں سے انصاف کرتے ہوئے ادبی نکتہ نظر سے رسالے کا معیار بھی قائم رکھا ہوا ہے۔ مذکورہ شمارے میں گوشہ خصوصی ادبی شخصیت کے جزو میں "قیس فریدی اور حیدر قریشی" کے بعد "سید محمد فاروق القادری" سے مفصل اور نہایت جامع انداز میں متعارف کروایا گیا۔ کسی ادبی شخصیت کی زندگی کے ہر پہلو پر نظر ڈالنے کے لیے بے شمار کتب کا مطالعہ لازم ہوتا ہے لیکن یہاں انداز بیاں کچھ اس لیے بھی متاثر کن ٹھہرتا ہے کہ ایک "شعور و ادراک" کا مطالعہ اس میں شامل شخصیت کے تمام تر ادبی حوالہ جات کی کامل ترجمانی کرتا ہے الفاظ کے خوب صورت پَناؤ کے ساتھ سید محمد فاروق القادری کی شخصیت کے لیے عمدہ خراجِ تحسین ہے الغرض اس گوشے کی زینت بننے والا ہر مضمون قارئین کے لیے سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔

عطیہ جدون (صدر شعبہ اردو، آرمی برن ہال کالج برائے طالبات ، ایبٹ آباد)

☆☆☆
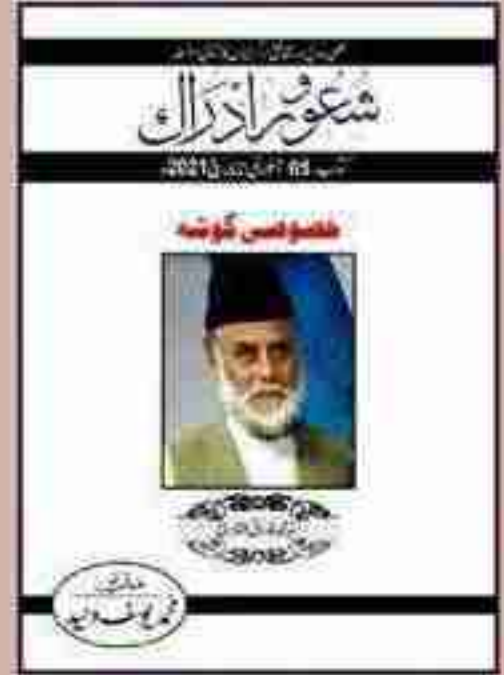
"شعور و ادراک"... روایتی رسائل سے بہت بہتر

یہ کتب و رسائل کی اہمیت کے زوال کا الم ناک دور ہے۔ آبادی کی فزونی کے ساتھ ساتھ اُردو کے لفظ و معنی سے شناسا لوگ کم ہوتے جا رہے ہیں۔ افراد کی تعداد بڑھ رہی ہے لیکن زبان و ادب کا ذوق ایک خطرناک تنگی راہ سے دوچار ہے۔ اس کے علاوہ مادیت کے حرص میں مبتلا لوگوں کا معیارِ نظر بھی ہر نئے دن پست تر نظر آتا ہے۔

کچھ وقت قبل خان پور کے محمد یوسف وحید نے کمال محبت سے از خود مجھ سے رابطہ کر کے بتایا کہ وہ اپنے ادبی جریدے "شعور و ادراک" کا تازہ شمارہ جنوری تا مارچ 2021ء مجھے ارسال کر رہے ہیں تو یقین کیجیے میں فون سننے کے بعد ایک بار بھی اس تجسس میں نہیں رہا کہ کوئی نیا رسالہ آنے والا ہے۔ لیکن ۔۔۔ رسالہ دیکھنے کے بعد میں اپنے تمام خیالات پر کچھ شرمندہ سا ہو گیا کہ یہ رسالہ ہرگز ہرگز موجودہ زمانے کے روایتی رسائل سے بہت بہتر تھا۔ کم و بیش 400 صفحات کی عمدہ ادبی تخلیقات کا مرقع۔ پرنٹنگ، کاغذ اور معیارِ انتخاب سب عمدہ ہیں۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی اور محمد یوسف وحید اور اُن کی ٹیم کے لیے دعا نکلی کہ اللہ اُن کے علم، محنت، اور مال میں برکت دے اور اس زبان و ادب کی خدمت کو ان کے لیے ثمر بار فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر عاصم ثقلین (اسسٹنٹ پروفیسر آف اردو، گورنمنٹ ایس ای کالج، بہاول پور)

Rs.500

فروغِ علم و اَدب کیلئے کوشاں

الوحید اَدبی اکیڈمی خان پور